ابرِ بہاراں

زبیدہ سلطانہ

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱0307-2128068
@Stranger ❣️❣️❣️❣️❣️❣️❣️

مقبول اکیڈمی شاہراہ قائدِ اعظم لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مقبول اکیڈمی

۱۰- دیال سنگھ مینشن شاہراہ قائدِ اعظم لاہور

پرنٹرز : ناصر پریس لاہور

فرزانہ نصیر کے نام ————

جس کے ساتھ ادب کی بہترین توقعات وابستہ ہیں۔

زبیدہ سلطانہ

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا

میرزا غالب

C

(۱)

"طیب!"

وفا نے کربناک آواز میں پکارا اور اس قدر درد انگیز سسکیاں لے لے کر روئی۔ کہ طیب کے خوبصورت چہرے کی ساری شگفتگی یکدم اڑ گئی اس کے رخساروں پر زردی کھنڈ گئی اور فراخ پیشانی پر تفکر اور پریشانی کے شکن سمٹ آئے۔ وفا کے آنسوؤں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ کسی تفصیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ تاہم اپنی قِسمت کا فیصلہ واشگاف لفظوں میں سننے کی خواہش نے اُسے استفسار پر اُکسایا۔

"کیا ہوا......؟ کچھ بتاؤ بھی تو سہی؟"

اُس نے اپنی کرُسی آگے کھساتے ہوئے وفا کی طرف جُھک کر پوچھا مگر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھُپائے بدستور روتی رہی۔ ان جانکاہ سسکیوں میں اُس کے دل کی شکست کی فریاد تھی۔ طیب نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر آہستہ سے ہٹایا۔

"وفا!"

اُس نے پکارا تو وفا نے پُرنم آنکھیں اُس کی طرف اُٹھائیں۔ کتنی حسرت، کس قدر

احساسِ ناکامی تھا اُن آنکھوں میں؟ طیب کا دل لرز کر رہ گیا۔

"وفا خدارا اس طرح نہ روؤ۔ میرا تو دل کٹ کر رہ گیا تمہارے رونے سے۔ میں تو سینکڑوں ارمان دل میں بسائے اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے کے واسطے آیا تھا مگر تمہیں روتے پایا تو سارے ارمان اُجڑ کر رہ گئے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ کیا ہوا ہوگا۔ زندگی کا کوئی معمولی حادثہ میری وفا کو آنسو بہانے پر مائل نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ میری ہمت ور اور حوصلہ مند وفا یہ اپنے طیب کی اُمیدوں کے جنازے پر آنسو بہا رہی ہے ـــ کیوں یہی نا؟"

وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا گیا۔ مگر وفا میں جیسے اُس سے نگاہ ملانے کی ہمت نہ تھی۔ اُس نے آگے جھک کر طیب کے پہلو میں منہ چھپا لیا اور پھر دلسوز سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

"لو چُپ ہو جاؤ وفا! رونے سے زندگی کے اہم مسئلے حل نہیں ہُوا کرتے۔ ہمیں سنجیدگی سے اپنے معاملات پر غور کر کے آئندہ کے لئے کچھ سوچنا چاہیئے ـــ آخر مجھے بتاؤ تو سہی خالہ جان نے کس بنا پر میری پیشکش کو ٹھکرا دیا؟ تاکہ میں اُن کی تسلی اور اپنے بچاؤ کی کچھ تدبیریں سوچ سکوں۔ اور ان کی خدمت میں ایک دفعہ اور اپیل کر سکوں؟"

وہ کہہ رہا تھا اور اس کے عنبریں بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کہ اُس نے طیب کے آخری لفظوں پر یکدم سر اُوپر اٹھایا اور اپنی سیاہ غزالیں آنکھیں اُس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہُوئے بولی۔

"اپیل ـــ؟ آہ طیب! طیب!"

کتنی یاس اور نومیدی تھی اُس کے لہجہ میں اور اُس نے جس مایوس کُن انداز سے نفی میں سر ہلا کر کہا وہ طیب کے لئے حوصلہ شکن تھا اُسے یُوں محسوس ہوا کہ وہ خنک گہرائیوں میں اُترا چلا جا رہا ہے۔ اس کی زندگی کا سفینہ جو ساحل سے ٹکرا کر طوفانِ حوادث کی بے رحم موجوں کی زد میں آن پھنسا تھا ابھی کل شام ہی کا واقعہ تھا۔

کہ اُن دونوں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ کی چار سالہ رفاقت کو دائمی رفاقت بنا لینے کا فیصلہ کیا۔ اور وفا کے ایما پر اس کی والدہ سے بالمشافہ ایسی گفتگو کی جرأت نہ پا کر اُس نے اپنا مدعا تحریری صورت میں پیش کیا تھا۔ اس میں اپنے تمام خاندانی کوائف اور جائیداد وغیرہ کی تفصیل لکھی تھی۔ بیگم درانی یعنی وفا کی امی کہیں باہر جا رہی تھیں جس وقت انہیں گھر کی خادمہ کے بدست طیّب کا رقعہ ملا انہوں نے چلتے چلتے چند ابتدائی سطور پر سرسری نگاہ ڈالی اور مسکرا کر خط کو پرس میں ڈالتے ہوئے پورچ کی طرف بڑھیں جہاں کار اُن کی منتظر تھی۔ راستہ میں وہ ایک لمحہ کے لئے ڈرائنگ روم کے دروازہ پر ٹھہر گئیں، اندر سے وفا اور طیب کے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے پردہ اُٹھا کر جھانکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ابھی ابھی تمہارا خط ملا ہے طیب! مگر میں باہر جا رہی ہوں واپس آکر دلجمعی سے پڑھوں گی اور کل ...... انشاءاللہ ...... ہوں" انہوں نے اپنے فقرے کے درمیان پُرمعنی انداز سے ہنستے ہوئے بات کو اگرچہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مگر ان کے انداز سے طیب اور وفا دونوں نے سمجھ لیا۔ کہ وہ خط کے نفسِ مضمون سے واقف ہیں اور وہ موضوع اُن کے لئے قابلِ پذیرائی بھی ہے۔ ماں کے آنے پر دونوں تعظیم کے واسطے کھڑے ہو گئے تھے اور اب شرم سے سرنگوں تھے۔

"جی بہت بہتر خالہ جان ______ میری زندگی کی کامگاری آپ کے فیصلہ پر منحصر ہے!" طیّب نے جیسے اپنی ساری جرأت کو فراہم کر کے کہہ دیا۔

"اللہ پاک بہتر کرے گا —؟"

انہوں نے ہنس کر کہا اور آگے بڑھ گئیں۔ اُن کا یہ طرزِ عمل کتنا اُمید افزا اور مسرت بخش تھا! اتنی ہی تسلی پا کر وہ دونوں فردوسِ تصور میں کھو گئے۔

انہیں اپنے گردو پیش بہاریں ہی بہاریں نظر آنے لگیں ——— ابدی اور ازلی بہاریں! جو خزاں کی دست برد سے مامون اور بالاتر معلوم ہوتی تھیں۔ محبت کرنے والے دل ایسے زود حس ہوتے ہیں۔ اُمید کی ایک ہی کرن ان کی زندگی کی صبح دلکشا بن جاتی ہے اور نا اُمیدی کی ذرا سی پرچھائیں دہشت خیز شبِ دیجور کا روپ دھار لیتی ہے طیّب اور وفا کے لئے یہ شام عجب کیف آگیں تھی پھر وہ مسرت بھری امیدوں کے ساتھ رخصت ہوا اور وفا ماں کا انتظار کرنے لگی۔ اور جب وہ واپس آئیں تو وفا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنے لگی۔ وہ گھر کے دوسرے کاموں میں ایسی محو ہوئیں کہ گویا طیّب کے خط کو بھول ہی گئیں۔ وفا کی طبیعت اُلجھنے لگی اسے اپنی ماں کی فراموشی پر غصہ آنے لگا اکلوتی بیٹی کی زندگی کے سب سے اہم مسئلہ کو انہوں نے گھر کی دوسری مصروفیتوں میں پسِ پشت ڈال رکھا تھا؛ وہ ساتھ والے کمرے میں پردہ کے پیچھے کھڑی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی یہ طیّب کا فون تھا اُسے جیسے صورتِ حال سے القاء ہوا۔ اور اس نے یاد دھانی کے لئے فون کیا۔

"اُہو! طیّب! تم نے خوب یاد دلایا۔ میں گھر آکر دوسرے کاموں میں ایسی اُلجھی کہ خیال ہی نہ رہا۔ بس اب بیٹھ کر تمہارا خط پڑھوں گی۔ بہر کیف یہ ایک رسمی اور برائے نام سی بات ہے تم تسلّی رکھو انشاء اللہ سب کچھ تمہاری منشاء کے مطابق ہو گا! ہوں؟ اچھا خدا حافظ؟"

کتنا تسلّی بخش جواب تھا اس کے بعد نا اُمیدی کا خیال ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لئے تو وہ ہزاروں اُمیدوں کے ساتھ آج اپنی وفا کے ہاں پہنچا تھا مگر توقع کے خلاف وہ اُسے روتی ہوئی ملی۔ اُس کی ماں نے صاف اور فیصلہ کُن انکار کر دیا تھا ——— ! اور اس انکار کی کوئی وجہ نہیں بتائی تھی بلکہ بتانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"میں دیکھنا چاہتی تھی۔ کہ تمہارے خط کی تفصیل پڑھ کر امی پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اور میں پردہ کے پیچھے موجود رہی۔ پڑھتے پڑھتے وہ یکدم تڑپ کر کرسی سے اٹھیں۔

"اُف ــــــ ! راؤ نیاز احمد کا بیٹا ؟"

وہ بے اختیار کہہ اُٹھیں۔ اور دیر تک کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلتی رہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ تمہارے والد کا نام اُن کے لئے اضطراب کا موجب بن گیا میں نہیں کہہ سکتی کیوں ؟ آخر انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلوا بھیجا اور کہا ــــــ دیکھو وفا ! مجھے یہ رشتہ منظور نہیں اگر طیب تمہیں اس خیال کے ماتحت ملتا ہے تو اُس سے ملنا ترک کر دو اور آئندہ کے لئے اس خام خیالی کو اپنے ذہن سے نکال دو ــــــ یہ تو قیامت تک ممکن نہیں۔ کہ اُس سے تمہاری شادی ہو سکے ــــــ !"

وفا نے آخر طیب کو واقعہ سُنا دیا یہ سُن کر اس کے چہرے پر کرب و اندوہ کے ساتھ تعجب و تفکر کے آثار بھی پیدا ہو گئے۔ اس کے باپ کا بے داغ اور معزز نام آج تک اس کے لئے باعثِ صد افتخار تھا مگر خبر نہیں کیوں، وہی نام آج اُس کی کامگاری کے راستہ میں دیوار بن گیا۔ اُس کی مسرتوں کے ماہِ کامل کا گہن ثابت ہوا۔ راؤ نیاز احمد کا اکلوتا اور ناز پرورده بیٹا، جو رنج وغم کے نام سے آشنا نہ تھا جس نے کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھا تھا جس کی کسی خواہش کو آج تک مسترد نہ کیا گیا تھا۔ آج اُس نے زندگی کا سب سے بڑا دُکھ پایا تھا سب سے بدترین ناکامی دیکھی تھی آج اُس کی عزیز ترین خواہش کو بیدردی سے رد کر دیا گیا تھا۔ وہ طیب جس نے آج تک نہیں جانا تھا۔ کہ محرومی کیا چیز ہے آج وہی طیب المناک محرومی کا شکار تھا۔

اس نے ہمت کر کے وفا کی ماں سے حرفِ آخر کے طور پر پھر التجا کی مگر وہ اپنے فیصلہ پر یوں اٹل تھیں۔ جیسے ان کے دل میں کبھی طیب کے لئے

کوئی نرم جذبہ اُبھرا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے خالص دُنیا دارانہ لہجے میں نہایت بے رُخی سے اس کی التجا کے جواب میں کہا۔

”میں کوئی وجہ بیان کرنے پر مجبور نہیں ہوں بھائی! میں اپنی بیٹی کی مختار ہوں اور مجھے یہ رشتہ منظور نہیں بس ۔۔۔۔۔۔!“

اور وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ طیب مایوسیوں کے گھٹا گھٹا ٹوپ اندھیروں میں راستہ گم کر بیٹھا۔ اُس کے ڈگمگاتے قدم بنگلہ کے صدر دروازہ کی طرف اُٹھنے لگے وہ اپنی وفا کو الوداع کہے بغیر واپس پلٹ آیا۔

۲

راؤ نیاز احمد کی بیوہ آسیہ بیگم چپ چاپ بیٹھی ہوئی یہ عجیب منظر دیکھ رہی تھی۔ اور اپنے ہی گھر میں جیسے بیگانہ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس کے شوہر کی چھوٹی بھاوج اندر باہر انتظام کرتی پھرتی اور مالکانہ سا رُعب داب اپنے سانولے گداز چہرے پر لئے ہوئے اس کے گھر میں یوں دخل انداز تھی جیسے وہی سب کچھ ہو۔ آج تک تو آسیہ بیگم سے اس کی کبھی نہ بنی تھی جب کبھی وہ اس کے ہاں آتی مہمانوں کی طرح تکلف سے الگ بیٹھی رہتی شادی کی تقریب ہو یا مرگ کا موقعہ، اس نے اپنی وہی روش بحال رکھی یہاں تک کہ ساس کے مرنے پر بھی غیروں کی طرح آئی بیٹھی اور چلی گئی، مگر یہ اس مرتبہ خبر نہیں کیسی کایا پلٹ گئی کہ وہ سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھی۔ گھر کی مالکہ ایک طرف بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اور حیران ہو رہی تھی۔ کہ ایک ناقابل تلافی نقصان پر ایک حسرت ناک موت پر درد مشترک کا احساس اُس عورت کو اس طرزِ عمل پر مائل نہیں کر رہا بلکہ کسی اور ہی خیال کے ماتحت وہ ایسا کر رہی ہے اور وہ خیال ہے مالکانہ برتری بڑے راؤ صاحب کے بعد راؤ نیاز احمد نے ہی باپ کی جگہ سنبھالی۔ اور

خوشدامن کے انتقال کے بعد گھر کی سرداری اور بڑائی آسیہ بیگم کو ملی۔ کنبے کے ہر شخص کو ان کی بزرگی کا احترام ملحوظ تھا۔ ہر فرد اپنے پیچیدہ معاملوں میں اُن سے مشورہ لیتا۔ رشتے ناطے ان کی صلاح سے طے پاتے۔ اور ان دونوں میاں بیوی کی رائے کا ہمیشہ احترام کیا جاتا۔ مگر یہ عظمت یکایک چھن گئی۔ چند ہی گھنٹوں میں حکومت تاراج ہو گئی۔ راؤ نیاز احمد اچھے بھلے باہر گئے لیکن چند گھنٹے کے بعد لوگ ان کی لاش لے آئے۔ ان کی کار کا ملٹری ٹرک سے تصادم ہو گیا اور وہ موقعہ ہی پر ختم ہو گئے۔

بیچاری آسیہ بیگم کے لئے یہ آفتِ ناگہاں کیا کم تھی کہ چشمِ زدن میں اس کی دُنیا اُجڑ گئی اس پر طرہ یہ کہ مخالفوں نے عملی طور پر اُسے جتانا شروع کر دیا کہ اب گھر میں اُس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ اور یہ احساس اس کے زخموں پر نمک کا کام دے رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی سب کچھ دیکھ اور سُن رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے لیکن دل خون خون ہو رہا تھا۔ اپنی تینوں کمسن بچیوں کو دیکھتی تو بے ساختہ ایک دلدوز سِسکی اُس کے لبوں پر آجاتی۔ اور یہ خیال کہ اب یہ بچیاں چچا کی دستِ نگر ہوں گی اس کے مجروح دل پر آرے چلا دیتا۔ اور وہ دل ہی دل میں خاندان کی اس رسمِ بد کی مذمت کرنے لگتی۔ جس کے ماتحت شوہر کے انتقال کے بعد اس کی اولاد کو محض اس وجہ سے باپ کی املاک سے محروم ہونا پڑے گا۔ کہ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں اور ان کے خاندان میں لڑکیاں باپ کی جائیداد ورثہ میں نہیں پا سکتیں۔ بھائی اور اس کے بعد بھتیجے اس کی جائیداد کے مالک ہوتے ہیں تو یہ وجہ تھی۔ کہ جب بھی آسیہ بیگم اپنی بچیوں میں سے کسی کی طرف نگاہ اٹھاتی تو اُسے بچی کے چہرے پر عجیب قسم کی محرومی برستی نظر آتی اور اس کیفیت سے اس کا دل تڑپ تڑپ اٹھتا۔

اس دن سوئم تھا۔ قل کا ختم پڑھا جا چکا تھا۔ صفِ ماتم پر لمبے لمبے دسترخوان

بچھائے جا رہے تھے۔ عزیز و اقارب جمع تھے اور مرنے والے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے اس ماتم کدہ میں بیٹھ کر الوانِ نعمت سے شوق فرما رہے تھے موسمی میوے چکھ رہے تھے۔ اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ اُن میں سے کسی ایک کو بھی اس وقت یہ تلخ حقیقت یاد نہ تھی۔ کہ خود اس پر بھی ایک نہ ایک دن یہ وقت آنے والا ہے۔

راؤ نیاز احمد کا چھوٹا بھائی اعجاز احمد نہایت اہتمام سے تعزیتی مہمانوں کی مدارات میں مصروف تھا۔ لذیذ اور خوشبودار پکوانوں کی مہک سے دیوان خانہ اور مجلسرائے معطر ہو رہی تھی۔ شاید زعفران اور کیوڑے کی باس نے دروازہ پر کھڑے ہوئے گداگروں کی بھوک کو بھی اُکسا دیا تھا۔ کہ وہ بیقرار ہو کر زیادہ شور مچانے لگے تھے...... ! راؤ نیاز احمد نے خفا ہو کر ملازم کو پکارا۔

"ارے او گلو! یہ کیا تماشہ ہے؟ بھیجتے کیوں نہیں ہو ان لوگوں کو یہ کیوں شور کر رہے ہیں؟" اس نے خفگی سے پوچھا۔

"حضور! سیروں چنے ان بدبختوں میں بانٹ دیئے۔ پھر بھی چلائے جا رہے ہیں۔" گلو نے جیسے عاجز آ کر شکایت کی۔

"جب چنے لے چکے تو اب کیا کہتے ہیں یہ کمینے حرام خور؟"

راؤ صاحب نتھنے پھلا کر چلائے۔ تو گلو دہل کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کہ ایسا نہ ہو آقا تاؤ میں آ کر اسی کے چپت جما دیں۔

"ان بدبخت بھک منگوں کا پیٹ کب بھرتا ہے چاہے کتنا ہی دے دو مانگتے ہی چلے جائیں گے!" مہمانوں میں سے ایک نے اپنی پلیٹ میں پلاؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"گلو! ارے سُنتے ہو؟ چودھری صاحب کے لئے گرم قورمہ منگواؤ۔ ان کے سامنے کوئی سالن ہی نہیں۔ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟"

راؤ اعجاز نے تحکم کے لہجہ میں کہا۔ وہ اس وقت مہمان نوازی کا پورا پورا

ثبوت دے رہے تھے۔

“اور ہاں ——— جاگو اور دیرے سے کہو ان بھیک منگوں کو باہر کر کے پھاٹک بند کرلیں ان حریص کتوں نے تو امن حرام کر دیا لے کر!” وہ حسب عادت نتھنے پھلا کر چیخے۔

“جی بہت اچھا ——— !” کہہ کر گو باہر چلا گیا۔ راؤ اعجاز ہر طرف پھر کر دستر خوان کا جائزہ لے رہا تھا جہاں جس چیز کی کمی نظر آتی دوڑتا ہوا خود جاتا اور اپنے ہاتھ سے پلاؤ کے قاب اور قورمہ کی کشتیاں اٹھا اٹھا کر لاتا۔ ادھر کھانے والوں کو خبر نہیں کتنی مدت کے بعد اچھا کھانا ملا تھا کہ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

“میٹھا اور منگوائیے راؤ صاحب!” پٹواری صاحب نے فرمائش کی۔

“ابھی لیجیے ——— !”

کہتا ہوا راؤ اعجاز دروازہ کی طرف یوں لپکا جیسے گورنر کی فرمائش پوری کرنے چلا ہو۔

“اچھا گرم ہو ——— ! میٹھا گرم گرم ہی لذیذ لگتا ہے!” نیچے سے نائب تحصیلدار صاحب نے آواز دی۔

“نہایت گرم ہوگا صاحب!”

راؤ اعجاز نے دہلیز سے پلٹ کر خوشامدانہ انداز سے سر خم کرتے ہوئے جواب دیا۔ کچھ بزرگ کھانے سے فارغ ہو کر دیوار کے قریب لگے ہوئے تکیوں کی طرف کھسک گئے اور خلال کرنے یا حقہ پینے کے دوران گفتگو کرنے لگے۔

“راؤ اعجاز نے خوب شاندار ختم دلوایا بھائی کا!” ایک سفید ریش بزرگ دانت کریدتے ہوئے بولے۔

“جی ہاں! واقعی بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا!” خانصاحب نے حقے کی نَے اپنی طرف پھراتے ہوئے کہا۔

"کیونکر نہ کرتے ـــــ؟ ساری جائیداد بھی تو یہی سنبھالیں گے!"

قریب ہی بیٹھے ہوئے زمیندار صغیر نے خانصاحب کے کان کے قریب منہ لے جا کر دبی آواز میں کہا۔ اور معنی خیز انداز سے سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

"اُنھو ہاں سچ! بیچارے راؤ نیاز احمد کا لڑکا بالا تو کوئی نہیں بس بچیاں ہی ہیں" نائب صاحب انتظار کرتے کرتے اُکتا کر بولے۔

"میں دیکھتا ہوں ـــــ!"

پٹواری صاحب نے مستعدی سے اُٹھتے ہوئے کہا اور راؤ اعجاز کی تلاش میں باہر کی طرف لپکے۔ ادھر غضب یہ ہوا۔ کہ میٹھا ختم ہو چکا تھا وہ لے کر آتا تو کیا آتا۔ گھبرا کر زنان خانہ کی طرف بھاگا اور اپنی بیوی صدیقہ کو دروازہ پر بلوا کر پوچھا۔

"کچھ حلوہ بچا رکھا ہو تو جلدی سے دے دو۔ باہر تو ختم ہو چکا ادھر نائب صاحب دسترخوان پر اب تک ڈٹے ہوئے گرم حلوہ مانگ رہے ہیں۔"

ان کی بدحواسی دیکھ کر صدیقہ بھی گھبرائی۔

"زنانہ میں تو میٹھا پہلے ہی بہت کم آیا۔ بیویاں مانگ مانگ کر چپ ہو رہیں۔ آخر اتنا کم کیوں پکوایا تم نے؟" وہ ہونٹ پر اُنگلی رکھے شوہر کا منہ تک رہی تھی۔

"جتنا خرچ اُس خسیس عورت نے دیا اُسی کے مطابق کرنا تھا نہ کہ میں اپنی جیب سے ڈال دیتا۔ اب اور پکوانا پڑے گا جاؤ اور رقم لاؤ اس کمینی سے۔ شوہر کے سوئم کا ختم تک کھُلے دل سے نہ ہو سکا مجھے تو دو کوڑی کا کر دیا اس نے ملنے والوں میں!"

اعجاز حسب عادت نتھنے پھیلائے بڑبڑا رہا تھا۔ اسے دروازہ پر کھڑا چھوڑ کر صدیقہ اپنے بھاری بھرکم جسم کے باوصف نہایت تیزی سے

اندر آئی اور ناک چڑھا کر آسیہ کی بڑی بیٹی عتیقہ کو پکارا۔

"بی بی جلدی سے جا کر ماں سے چابیاں لے آ اور مجھے بتا روپے کون سے بکس میں رکھے ہیں۔ باہر تو ہر چیز کم پڑ گئی، تیرے چچا بُری طرح گھبرا رہے ہیں جا جلدی کر!"

وہ گودام کے دروازہ پر کھڑی کہہ رہی تھی۔ عتیقہ تیرہ چودہ برس کی سمجھ دار لڑکی تھی یہ سُن کر کہ چیزیں کم ہو گئی ہیں وہ بھی پریشان سی ہو کر ماں کے پاس آئی۔

"امّی! چچی صدیقہ چابیاں مانگ رہی ہیں۔ کہتی ہیں اور پیسے چاہئیں باہر چیزیں کم ہو گئیں ہیں اور آئیں گی، چچا اعجاز دروازہ پر کھڑے ہیں۔"

"چیزیں ـــــ کم ہو گئی ہیں؟ چلو میں چلتی ہوں!"

بے چاری بیوہ پریشان ہو کر اُٹھی۔ بھری برادری میں ایسا واقعہ خود مرگ سے بھی بڑھ کر پریشان کُن تھا۔ اس کا دل دہل اُٹھا۔

"کیا ہوا دُلہن بھابی؟" وہ پریشان ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"ہوتا کیا خاک؟ وہ باہر بے حال ہو رہے ہیں مارے شرم اور خفت کے کسی کو مُنہ نہیں دکھا سکتے چیزیں کم ہو گئیں۔ پیسہ خرچ کرنے کا حوصلہ نہ تھا تو بیوی! اتنے لوگوں کو بلوانا کیا ضرور تھا ـــــ؟ عورتیں تو اندر گھُس کر بیٹھ رہتی ہیں ہر بات کا سامنا تو مردوں کو کرنا پڑتا ہے۔ اب پیسے بھی نکالو گی یا نہیں میٹھا اور بنے گا پھل آئے گا ـــــ ایسا ہی تھا تو انتظام کے لئے کسی معتبر آدمی کو لگا دیا ہوتا ـــــ"

آسیہ کے خود اُٹھ کر چلے آنے سے صدیقہ تو آگ بھبھوکا ہو گئی اُس نے تو صرف چابیاں مانگی تھیں۔

"کتنی رقم چاہئے؟ مجھ سے تو اعجاز بھیا نے جس قدر روپیہ مانگا میں نے دیا، اب مجھے کیا خبر کہ کتنی چیز اُٹھے گی۔ وہ خود ہی اپنے ہاتھوں منگوا رہے ہیں سب کچھ" آسیہ نے نحیف سی آواز میں کہا۔

"لو اور سنو تو کیا وہ کھا گئے ہیں تمہارا روپیہ؟" صدیقہ نے بگڑ کر آسیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ میں نے کب کہا؟ کیسی باتیں کرتی ہو تم ——؟ خیر کہاں ہے اعجاز میں خود بات کرتی ہوں۔" وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"کتنی رقم اور چاہیئے اعجاز؟ پہلے ہی وافر چیز منگوالی ہوتی تو اس وقت پریشانی نہ ہوتی" آسیہ نے رومال میں سے کچھ روپیہ کھولتے ہوئے کہا۔

"جتنا گڑ ڈالیے اتنا ہی میٹھا ہوتا ہے بھابی! ایسے موقعوں پر جہاں عزت کا معاملہ ہو ناپ تول کر خرچ نہیں کیا جاتا۔ تم نے دو ہزار روپلی مجھے تھمادی اور یہاں کھانے کو خلقِ خدا ہے کہ ٹوٹی پڑتی ہے۔" اعجاز نے تلخی سے کہا۔

"بھیا! اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تم نے اسی قدر مانگا میں نے دیدیا۔ تم پورا اندازہ لگا کر زیادہ اہتمام کر لیتے۔ مجھے تو ہوش نہیں۔ بھلا جس کے سر پر یوں اچانک پہاڑ ٹوٹ پڑے اُسے کب کسی بات کا ہوش رہتا ہے؟" وہ گلوگیر آواز سے کہتے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔ صدیقہ نے عجیب انداز سے پیشانی پر بل ڈال کر اُس کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے ——!"

اعجاز نے دھیمی لیکن متذبذب سی آواز میں کہا اور دونوں میاں بیوی نے معنی خیز نگاہ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آسیہ نے کچھ اور رقم اعجاز کے ہاتھ میں دی اور بوجھل قدموں کے ساتھ دروازہ سے ہٹ کر

پھر وہیں دالان میں آ بیٹھی جہاں مہمان بیبیاں بیٹھی ہوئی حسبِ دستور قسم قسم کی باتیں کر کے غریب بیوہ کے مجروح دل پر اور بھی نشتر زنی کر رہی تھیں۔ یہ اندازِ غمخواری بھی بجائے خود عیب تھا۔ کہ جس سے غم مٹنے کی بجائے اور اُبھرتا۔ اور سکون کی بجائے اضطراب بڑھتا۔ جلتی ہوئی خشک آنکھوں سے آنسو نہ بہہ سکے تو دل سے ایک ایسا دھواں دھار غبار اُٹھتا جو اُس کی تمام

ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ اُس کی ساری کائنات پر یوں چھا جاتا جیسے کوئی تیرہ و تار اور طویل رات..... بھیانک اور ابدی رات جس کی کبھی صبح نہ ہو گی۔

۳

گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔ بقولِ غالب ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی!

چنانچہ اُس دن ہنگامہ تھا اور گھر میں خوب رونق تھی! کیونکہ آج راؤ نیاز کی پہلی جمعرات تھی۔ بیچاری آسیہ بیگم کو سوئم کے ختم کی بدانتظامی یاد تھی اور پھر اعجاز اور اس کی بیوی نے بار بار جتایا تھا۔ کہ اُس دن معززین میں کس قدر خفت اٹھانا پڑی، چنانچہ دیور کے مطالبہ پر وہ چوں وچرا کئے بغیر خرچ کرتی رہی۔ اگرچہ خیر خواہوں نے اُسے سمجھایا بھی، لیکن موقعہ ہی ایسا تھا۔ کہ وہ اُن کی رائے پر عمل نہ کر سکی۔ اس پر بھی اُسے طعن و تشنیع سے چھٹکارا نہ مل سکا۔ وہ مہمان خواتین میں بیٹھی ہوئی شوہر کے متعلق کچھ گفتگو میں مصروف تھی۔ کہ صدیقہ بھناتی ہوئی آئی اور بلا تامل سرِ محفل چلا کر بولی۔

"اے بیوی! خود اُٹھ کر انتظام دیکھو ہم سے یہ ٹیڑھی کھیر نہ بنے گی۔ چیزیں پوری منگوا کر نہیں دیتی ہو۔ وہ پکانے والا بُروں کی جان کو رو رہا ہے مصالحہ پورا نہ ملا تو بریانی کے لئے وہ ذمہ نہیں لے گا۔"

اس کے یوں چنگھاڑنے پر آسیہ بیگم گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو دُولہن! خود اعجاز ہی سب کچھ اُن لوگوں سے پوچھ کر منگوا رہا ہے۔ میں کیا جانوں بہن! مجھے تو کسی بات کا ہوش نہیں۔ اور جو چاہئے لے لو اور منگواؤ۔" آسیہ بیگم نے مظلومیت کے انداز سے کہا۔

"واہ! ہوش ہی نہیں —— ! وہ دروازہ پر کب سے کھڑے بُلا رہے ہیں یہاں باتوں ہی سے فرصت نہیں!"

وہ معنی خیز انداز سے مہمان بیویوں کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ آسیہ بیگم خاموشی سے اُٹھ کر مردانہ مکان کے دروازہ کی طرف چلی گئی۔ صدیقہ اُسے تیز تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہوش ہی نہیں بیچاری کو! پیسے پیسے کو کلیجے سے لگائے بیٹھی ہے دم نکلتا ہے خرچ کرتے ہوئے! ہوش ہوتا تو خبر نہیں کیا کرتی۔ اللہ محفوظ رکھے! کوئی اور جیسی عورت ہوتی تو یوں ایکا ایکی سہاگ لُٹ جانے پر جان سے گزر جاتی۔ ایک یہ دیکھو کہ پیسے کو شوہر سے عزیز رکھے ہوئے ہے!" صدیقہ نے کٹیلی نگاہوں سے نفرت برساتے ہوئے کہا۔

"الٰہی توبہ ہے!" ایک بی بی کانوں کو چھو کر بولی۔

"استغفر اللہ! لاکھ لالچ کرے۔ یہیں چھوڑ جانا ہے سب کچھ!" دوسری نے نہایت عبرت ناک لہجہ میں کہا۔

"راج لٹ گیا۔ اس سے بڑی آفت ایک عورت کے لئے کیا ہوگی کہ زندگی کا ساتھی بچھڑ گیا۔ ایسے میں تو جہنم میں جھونک دے انسان ہر چیز کو روپے پیسے کی کیا وقعت ہے؟" ایک اور خاتون لمبی آہ کھینچتے ہوئے بولیں۔

"مگر بہن! طبیعتوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بعض عورتیں حوصلہ مند ہوتی ہیں!" دوسری کہنے لگی۔

"اولاد والی بیوہ کو حوصلہ کرنا ہی پڑتا ہے بہن! اب یہ تو خدا ہی جانتا ہے

کہ اس کے دل میں کیا کیا خیال گزرتے ہوں گے تین بچیاں ہیں۔ بیٹا کوئی ہے نہیں۔ اُمیدیں ختم ہوگئیں جائیداد دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ہر ضرورت کے لئے اب اوروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ جس نے خود حکومت کی ہو اس کے لئے دست نگری کی زندگی موت سے بدتر ہے۔"

ایک بی بی جو آسیہ بیگم کی خاص ملنے والیوں میں سے تھی نہایت ہی دردناک لہجہ میں کہنے لگی۔ اتنے ہی میں آسیہ بیگم دالان میں داخل ہوئیں اور صدیقہ ناک بھوں چڑھاتی دوسرے دروازہ سے باہر نکل گئی۔ وہ تو جیسے ان ماں بیٹیوں کو اس گھر میں کوئی غیر مستحق افراد خیال کرنے لگی تھی۔ اس کا بس چلتا تو انھیں نکال باہر کرتی۔ اور اس حویلی اور اس کے اثاث البیت تک سے انہیں بے دخل اور محروم قرار دے دیتی۔ مگر برادری اور معاشرہ کی چند پابندیوں سے مجبور تھی۔ اس کا شوہر خود اس سے بھی پیش پیش تھا اُس نے رسوم کی ادائیگی کے بہانے ہی سے اپنے ملنے جلنے والوں کو خوب پُرتکلف ضیافتیں دیں۔ چہلم تک بیچاری آسیہ بیگم کا سارا اندوختہ ختم ہو چکا تھا۔ ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی اُسے برادری کے لوگوں کی تحسین و آفرین حاصل نہ ہوئی تھی سب اس کی خساست کے شاکی تھے۔ اور اعجاز اور اس کی بیگم کی دریادلی اور فراخ حوصلگی کے گُن گائے جا رہے تھے۔ چہلم تک سارے قریبی عزیز مستقل مہمان رہے اور ان کی خاطر مدارات میں گھر کے مکینوں کا غم غلط ہوتا رہا۔ ان کی دیکھ بھال میں آسیہ بیگم بیچاری کو اپنے دکھ کا پوری طرح احساس کرنے کی فرصت بھی نہ مِل سکتی تھی۔

چہلم کی دھوم دھام اور اہتمام ایک مثالی تقریب تھی جس کے ذریعہ سے اعجاز نے اپنے حلقہ اثر و رسوخ میں دھاک بٹھا لی۔ لوگ اس کے حوصلہ، داد و دہش پر عش عش کر اُٹھے اس رسم کے بعد سب عزیز رسمی ہمدردی کے اظہار کے ساتھ رخصت ہوئے۔ صدیقہ کو بھی جس وقت قرآن

سے یہ تسلی ہو گئی کہ آسیہ بیگم کا سارا اندوختہ ختم ہو چکا ہے اور اب وہ قرض سے گزارا کر رہی ہے تو وہ نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے گھر چلی آئی۔

اَب حویلی میں آسیہ بیگم اور اس کی تینوں بچیوں عتیقہ، عائشہ اور عامرہ کے علاوہ اس کے شوہر مرحوم کی ایک رشتہ کی پھوپھی حنیفہ بھی تھی۔ جو راؤ نیاز احمد مرحوم کی رضاعی ماں بھی تھی اسی رشتہ کی رعایت سے وہ ہمیشہ انہیں کے ہاں مقیم رہی۔ اور اُسے یہ لوگ اس قدر عزیز تھے۔ کہ اگر اُس کی اپنی کوئی اولاد حیات ہوتی تو وہ اُسے اُس سے زیادہ عزیز نہ رکھتی۔ وہ ایک مخلص اور صاف باطن سیدھی سادھی عورت تھی۔ حساس اور خاموش طبع تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو دیکھتے اور سُنتے زیادہ ہیں مگر بولتے کم ہیں۔ اس دوران میں وہ بہت کچھ سنتی رہی تھی۔ بہت کچھ دیکھ چکی تھی اور خاموشی سے تمام حالات پر غور کرتی اور سوچتی بھی رہی تھی۔

چہلم سے اگلے دن گھر کی فضا اُداس، سوگوار۔ مگر پر سکون تھی۔ حسبِ دستور حالات اور معمولات اعتدال پر آ گئے تھے۔ اور پس ماندگان نے رفتہ رفتہ اپنے روزمرہ کے کام سنبھالنا شروع کر دیئے تھے۔ کہ رسم دُنیا یہی ہے۔ مرنے والے کے متعلقین گو اس کے بعد اپنے آپ کو زندہ درگور ہی کیوں نہ محسوس کریں لیکن اس کے باوصف بشریت کے تقاضے ان سے چھوٹ نہیں سکتے۔ انہیں چار و ناچار، زندگی سے متعلقہ سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بیچاری آسیہ بیگم بھی اپنے دلی غم و اندوہ کے باوجود زندگی کے تقاضوں سے نپٹنے اور مخالف عناصر سے نبرد آزما ہونے کے لئے اپنی ہمت کو فراہم کر رہی تھی۔

سردیوں کی آمد آمد تھی، موسم خاصہ خوشگوار ہو چلا تھا۔ دھوپ کی تمازت فرحت بخش محسوس ہونے لگی تھی۔ پھوپھی حنیفہ کے پیہم تقاضہ کے بعد اُس دن کئی روز کے بعد آسیہ بیگم نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور بال خشک

کرنے کے لئے دالان کے سامنے دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پھوپھی حنیفہ تیل اور کنگھی لئے اس کے قریب پلنگڑی پر آ بیٹھی اور اس کے بال سلجھانے لگی۔ ان بالوں میں اُسے ایک بھی سفید تار دکھائی نہ دیا تو اُس کے مخلص اور حساس دل سے ایک ہوک سی اُٹھی —— "آہ اس جوان سر پر ابھی تو بیوگی کی سیاہ چادر نہ پڑتی!" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

"ہوں؟ آپ نے مجھ سے کچھ کہا پھپھو؟" آسیہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں بنو! میں کہہ رہی تھی ذرا تیل لگا دوں تیرے سر میں۔"

آسیہ بیگم جیسے لاتعلق سی ہو کر چپ ہو رہی اور حنیفہ پھوپھی اُس کے پیچھے بیٹھ کر سر میں تیل ڈالنے لگی۔

"آسیہ! میری بچی! کچھ حوصلہ کرو۔ ہمت باندھو۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کا ساتھ ہے۔ مخالفوں کا سامنا ہے۔ مصلحت اور دُور اندیشی سے کام لوگی تو ان کا حق بچا سکوگی ورنہ دشمنوں کا بس چلے تو تن پر کپڑا تک نہ رہنے دیں گے۔"

وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ آسیہ کے سینے سے بے ساختہ سسکی سی اُبھری۔

"کیا کروں؟ پھپھو! کیا کر سکتی ہوں میں؟ جب خدا ہی نے ظالموں کے بس میں کر دیا تو میں کیا کروں؟" اس نے سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

"خیر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا —!"

حنیفہ پھوپھی نے جیسے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ آسیہ ابھی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی۔ کہ شمو میراثن داخل ہوئی۔ اس کا ان سارے ہی گھروں میں یکساں آنا جانا تھا۔ صحن میں قدم رکھتے ہی اُس نے دعاؤں کا طویل ورد شروع کیا۔

"بچیوں کو اللہ پاک صاحب نصیب اور نیک بخت کرے۔"
اس نے آخر کار اس سلسلۂ کلام کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"اور جیتا جاگتا عمر والا بیٹا دے میری آسیہ کو اس کی بچیاں بھائی کو کھلائیں!

انشاء اللہ! حنیفہ نے اپنی کمزور آواز میں زندگی اور مسرت کا جوش بھر کر بلند آواز سے کہا تو آسیہ یکدم جیسے دہل سی گئی۔ اس نے اپنے بال بڑھیا کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے یکدم پھر کر اس کی طرف خشونت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ایک بیوہ کے لئے ایسی دعا اچھی خاصی گالی کے برابر تھی۔ آسیہ کو حیرت ہوئی کہ حنیفہ پھپھو جیسی متین اور کم گو عورت کو اس وقت یہ کیا بیہودہ گوئی سوجھی!

"ہاں تو اس میں کیا حرج ہے بیٹی؟ چاند چڑھے تو ساری دنیا دیکھتی ہے۔ اور پھر چھپانا بھی کیوں۔ یہ بات تو ظاہر ہونی ہی چاہیئے۔

پھوپھی حنیفہ نے اس کی تند نگاہوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے شمو کو مخاطب کر لیا۔

"اچھا تو اللہ رکھے میری بانو امید سے ہیں؟ میرا تو دل باغ باغ ہو گیا یہ سن کر! الٰہی مرادوں کے دن دکھانا میری بانو کو! زندگی والا بیٹا دینا۔!"

وہ جھولی پھیلا کر دعائیں دینے لگی۔

"ہاں بھلا ان لوگوں سے کیا چھپانا یہ تو خیر خواہ اور دعا گو ہوتے ہیں۔!"
پھوپھی حنیفہ کہنے لگی۔

"ہم دن رات آپ کے جان و مال کو دعائیں دیتے ہیں۔ اللہ کرے میرے بڑے راؤ صاحب کی آل اولاد کڑوی بیل کی طرح بڑھے۔ میری بانو پوتوں کو گودیوں میں کھلائے۔ الٰہی آمین!"

میراثن نے ایک بار پھر جھولی پھیلا کر اور آنکھیں بند کر کے انتہائی عقیدت سے دعا کی۔ اور پھر پیڑھی کو قریب سرکاتے ہوئے رازدارانہ جیسے لہجہ میں بولی۔

"بڑی بیگم! میں تو کہتی ہوں۔ بانو کا خیال بھی ٹھیک ہے۔ بدخواہوں کے کانوں تک ابھی یہ خبر خیر ہی پہنچے تو اچھا ہے۔"

وہ اپنے چہرے پر اہمیت کا انداز پیدا کرتے ہوئے بولی۔ آسیہ بیگم خاموشی سے سر جھکائے کسی گہری سوچ میں کھو گئی۔

"کیوں؟ خدا نہ کرے بدخواہ یہاں کون بیٹھا ہے؟ سب اپنے عزیز ہی تو ہیں۔ کیا اعجاز خوش نہ ہو گا سن کر کہ بھائی کا نام دنیا میں رہنے کی اُمید ہوئی؟ یا نیاز کی بہنیں خوش نہ ہوں گی۔ بلکہ تم تو مبارکبادی لے کر جاؤ اور بدھائی لو جا کر سب سے — اور — یہ لو میری طرف سے منہ میٹھا کرنا۔ ریشمی جوڑا بنوا کر دوں گی ننھے کے عقیقہ پر، بس دعا کیا کرو اللہ مراد دے!"

پھوپھی حنیفہ نے کیسے میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور آسیہ کے ماتھے سے لگا کر میراثن کو دیا۔

"اے اللہ! وہ دن دکھائیو کہ میں اس گھر میں وارث کا سہرا گاؤں میرا تو ابھی سے دل تڑپنے لگا۔ جی چاہتا ہے سہرا گاؤں!" میراثن نے جوشِ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مچل کر کہا۔

"اے شمو! کیا پاگل ہوئی ہو؟ ہوش کی دوا کرو! سہرا گانے کا اچھا وقت سوجھا ہے بیچاری کو۔" آسیہ بیگم نے چڑ کر کہا۔

"خیر ابھی نہ سہی اللہ پاک اچھا وقت بھی لے آئے گا۔ اس وقت سارے چاؤ پورے کرنا۔ تجھے رپوؤں میں گاڑ نہ دیا تو کہنا۔"

پھوپھی حنیفہ آج تو اپنی عادت کے خلاف خوب چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی۔ اور اتنے ہی دروازہ پر ٹیکسی ٹھہرنے کی آواز آئی۔

"کوئی مہمان آیا ہے۔" شمو اُٹھتے ہوئے بولی۔

"چچا اعجاز آئے ہیں۔"

اُوپر کی بالکنی سے عتیقہ نے بتایا۔

"دیکھو شمو! ابھی اعجاز سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کہنا۔ پھپھو کی تو ایسی ہی باتیں ہیں!"

آسیہ کا غصہ ابھی تک فرو نہ ہوا تھا۔ اور اتنے ہی میں اعجاز داخل ہوا شمو سلام کر کے رخصت ہوئی۔ نیاز نے رسمی طور پر خیر و عافیت پوچھی اور عتیقہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اوپر بالکنی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تم اسکول نہیں گئیں عتیقہ؟"

"جی نہیں —"

عتیقہ صرف اتنا ہی کہہ کر چپ ہو رہی۔

"ہوں —"

وہ جیسے کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ اور چند لمحے کرسی پر خاموش بیٹھا رہا۔ گویا موضوعِ گفتگو کے لئے موزوں لفظ تلاش کر رہا ہو۔

"گھر میں سب خیریت ہے نا اعجاز؟ کچھ فکر مند نظر آرہے ہو؟"

بڑی بھاوج نے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھ کر پوچھا۔

"جی ہاں بھابی جان! سب ٹھیک ہے۔ اس نے آنکھیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"اعجاز بھی دیکھو آدھا نہیں رہا بھائی کے غم میں۔"

پھوپھی حنیفہ بولی۔ مگر اعجاز نے کچھ جواب نہ دیا۔ اتنے ہی میں آسیہ بیگم کی سب سے چھوٹی چار سالہ بچی عامرہ اپنی گڑیا کو کندھے سے لگائے باہر نکلی اور دبے دبے قدم اٹھاتی چچا کی کرسی کے قریب آکھڑی ہوئی۔ اعجاز نے اُس کی طرف اچٹتی ہوئی سی نگاہ ڈالی اور آہستہ سے اُس کے سرخ و سپید رخسار کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

"تو اسکول نہیں جاتی عمری؟ بس گڑیوں ہی سے کھیلتی رہتی ہے؟"

"ماں کی طبیعت ذرا سنبھل جائے تو انہیں باقاعدہ اسکول بھیجنا شروع کرے

گی ــــ" پھوپھی حنیفہ نے جواب دیا۔

"ہوں ــــ!"

اتنا کہہ کر وہ پھر کسی سوچ میں کھو گیا۔ آسیہ نے معنی خیز انداز سے حنیفہ پھپھو کی طرف دیکھا، اعجاز کے چہرہ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی اہم گفتگو کے لئے آیا ہے۔ آخر اُس نے بات شروع کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ ہی لئے۔

"ان بچیوں کو باقاعدہ اسکول بھیجنا شروع کیجئے بھابی۔ فی زمانہ تعلیم کے بغیر لڑکیوں کی شادی تک اچھے گھرانوں میں نہیں ہو سکتی۔"

"اے تو ہمیں ان کے رشتے ڈھونڈنے کیا کہیں باہر جانا ہے۔ بڑی دونوں تو تمہاری بہویں بنے گی اور چھوٹی اپنی پھوپھی کی!"

پھوپھی حنیفہ نے اتنا بڑا مرحلہ دو ہی لفظوں میں طے کر لیا۔

"پھپھو ــــ کی بھی عجب باتیں ہیں ــــ اب ــــ!"

آسیہ بیگم کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی اعجاز نے اس کے چہرے کی دردناک کیفیت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"وہ ــــ تو جیسا خدا کو منظور ہوگا ضرور ہوگا۔ لیکن لڑکیوں کی پڑھائی فی زمانہ زندگی کی ضروریات میں سے ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے عتیقہ اب ماشاء اللہ جوان ہے اور باقی دونوں چھوٹی ہیں اتنی دُور پیدل جانا بڑی کے لئے خلاف مصلحت ہے اور چھوٹیوں کے لئے مشکل۔ سواری کا انتظام کیا جائے تو اس کے لئے اب آپ کے حالات اجازت نہ دیں گے۔ تینوں کے لئے کم از کم ساٹھ روپیہ کرایہ پر کوئی تانگہ مقرر کیا جاسکتا ہے ــــ"

"تو کیا موٹر بالکل ہی بیکار ہو گئی ہے؟"

آسیہ بیگم نے دردناک جیسے لہجہ میں پوچھا۔ کیونکہ موٹر کے مرمت ہو کر آجانے کے انتظار ہی میں تو بچیاں اسکول سے ناغہ کر رہی تھیں۔

"لو موٹر ـــــــ ! موٹر کے تو ٹکڑے سمیٹ کر ورکشاپ میں پھنکوائے ہوئے ہیں اس کی مرمت ممکن نہیں۔ اور پھر موٹر ہوتی بھی تو آپ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ڈرائیور کو دیں گی!"

اعجاز کے چہرے پر عجیب قسم کی مسکراہٹ پیدا ہو گئی جیسے وہ اپنی بیوہ بھاوج کی حماقت پر ہنسنا چاہتا ہو! وہ آہستہ آہستہ اپنے حرف مدعا کی طرف آ رہا تھا اور آسیہ بیگم جیسے اس کے منہ سے کسی تلخ حقیقت کو سننے سے گریزاں تھی۔ اسی لئے اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور چُپ ہو رہی۔ وہ اپنے اس دیور اور بچیوں کے وارث اور سرپرست سے پوچھنا چاہتی تھی۔ کہ آخر ان لوگوں کے لئے وہ کیا فیصلہ کرنے والا ہے مگر وہ اپنے میں یہ حوصلہ پیدا نہ کر سکی۔ مگر اعجاز بھی اسی موضوع پر گفتگو کرنے آیا تھا وہ سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے بولا۔

"بھابی جان! انسان کو وقت اور حالات سے سمجھوتہ کرنا چاہیئے۔ جو وقت گزر گیا اُسے یاد نہ کیجئے۔ وقت کے موجودہ تقاضوں سے نپٹنے کے لئے اپنے وسائل کے اندر رہ کر گزارا کرنے کے لئے ایک باقاعدہ لائحہ عمل مرتب کیجئے۔ میں آج اسی غرض سے آیا ہوں۔ پھپھو بھی موجود ہیں۔ اپنے تمام اخراجات کا تخمینہ مجھے لگوائیے۔ میں سوچتا ہوں۔ کہ آپ اپنے اندرون شہر والے مکان میں اُٹھ جائیے اس کی بالائی منزل آپ کی رہائش کے لئے کافی ہو گی۔ نیچے کی دونوں منزلوں اور دکانوں کا کرایہ آپ کو کافی مدد دے گا۔ باقی کا میں انتظام کر دوں گا۔ وہاں سے بچیوں کا اسکول بھی قریب رہے گا۔ آمد و رفت کے کرایہ کا سوال نہ رہے گا۔ کیوں پھپھو کیا خیال ہے آپ کا؟"

مگر پھپھو کو شاید بات پسند نہ آئی۔ کہ انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔

"اور اس مکان کا کیا ہو گا؟" آسیہ بیگم نے یکدم جوش میں آ کر خفگی کے لہجہ میں پوچھا۔

"یہ —— تو آپ جانتی ہیں۔ کہ آبائی حویلی ہے کرایہ پر نہیں اُٹھائی جا سکتی۔ یہاں میں اُٹھ آؤں گا۔ اپنے والا بنگلہ کرایہ پر دے دُوں گا اُسی میں سے آپ کے خرچ کی رقم میں جو کمی رہ جائے گی پوری کر دیا کروں گا۔ میرے سر پر اپنی ذمہ داریاں کم نہ تھیں۔ تین لڑکے ہیں اُن کی تعلیم پر خود ہی سوچئے کتنا خرچ ہو گا تو کہیں جا کر وہ سوسائٹی میں کوئی مقام حاصل کر لیں گے —— پھر ان کی تعلیم و تربیت کے علاوہ شادی بیاہ کا خرچ اور اب تو آپ کی بچیوں کے فرائض بھی میرے ذمہ ہیں۔ لڑکیوں کو جوان ہوتے کتنے دن لگتے ہیں۔ اپنی عتیقہ تو اللہ کے فضل سے دو تین برس تک ہی شادی کے قابل ہو جائے گی —— میں تو ابھی سے فکر و تردد میں پڑ گیا ہوں صدیقہ ہے تو وہ بھی اسی فکر میں غلطاں رہتی ہے۔ زمینوں سے اتنی یافت نہیں ہوتی جتنی دھوم ہے۔ خرچ زیادہ ہیں آمدنی کم۔ آپ ابھی سے سوچ سمجھ کر، اعتدال سے چلیں گی تو کہیں یہ حساب کتاب پورا ہو گا۔ ورنہ یوں سمجھئے کہ میری پریشانیوں میں اضافہ ہو جائے گا۔"

اعجاز جب حرفِ مطلب زبان پر لایا اور بات کرنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا دونوں عورتیں خاموش اور سرنگوں سُن رہی تھیں۔ آسیہ بیگم کے دل کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس حویلی سے نکالے جانے کے خیال ہی سے اُس کا سوگوار دل تڑپ گیا تھا۔ وہ اسی چار دیواری میں ڈولی سے اُتری تھی یہیں اُس نے ساس سسر کی خدمت کر کے اُس کے ثمرہ میں گھر کی سرداری اور مختاری حاصل کی تھی یہیں اُس نے سہاگ کے دن گزارے تھے۔ یہیں اُس نے بچیوں کو جنم دیا تھا۔ جو اس کے محبت شعار شوہر کو لڑکوں سے بڑھ کر عزیز تھیں۔ اور اب وہ چاہتی تھی کہ انہیں دیواروں کے سایہ تلے وہ اپنی بیوگی کا سوگوار مگر پاکیزہ دورِ حیات گزار دے یہیں سے اپنے بچوں کو وداع کرے اور اسی چوکھٹ سے اس کی لاش نکلے، مگر اس کی یہ توقعات پوری

ہوتی نظر نہ آتی تھیں۔ یہاں سے اُسے بے دخل کرنے کے لئے یہ لوگ اس کے ایامِ عدت کے پورا ہونے کا بڑی مشکل سے انتظار کر رہے تھے اور وہ جانتی تھی کہ اس سلسلہ میں کچھ بھی کہنا سننا بیکار ہوگا۔

"تو میں اوپر کی منزل خالی کرنے کے لئے کرایہ داروں سے خود بات چیت کروں یا انہیں نوٹس دے دوں؟"

اعجاز نے آسیہ بیگم کو خاموش پاکر خود ہی پوچھا۔ اس کے گلے میں رقت سے پھندا سا پڑا تھا وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔ اُس نے ایک حسرت بھری، دردناک نگاہ سے پھوپھی حنیفہ کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے بے اختیار ٹپک پڑے۔ اس مکان کا جائز وارث اب اُسے بے دخل کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا تو وہ انکار کا ایک لفظ بھی کہنے کی مجاز نہ تھی۔ مگر دلِ فریاد پر مائل ضرور تھا جسے وہ خاموشی سے مسل دینا چاہتی تھی مگر ان آنسوؤں پر اُسے اختیار نہ رہا۔

"بھابی! اب آپ کو دل مضبوط کر کے مردانہ وار اپنے حالات سے نپٹنا چاہیئے۔ لیکن جذبات سے بھی حقائق کا مقابلہ ہوا ہے آج تک؟! ان سے نپٹنے کے لئے تو انسان سمجھ بوجھ سے کام لے تو بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ حالات بگڑتے ہی چلے جاتے ہیں۔"

اعجاز دھیمے لہجہ میں نصیحت کے انداز سے بولا۔ وہ اپنی بڑی بھاوج کی ہمیشہ عزت کرتا آیا تھا۔ کبھی اس کے روبرو زیادہ طویل گفتگو نہ کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ پاسِ ادب کو ملحوظ رکھے ہوئے تھا ورنہ اب اپنی موجودہ مالکانہ حیثیت نے اُسے جو جرأت اور جسارت بخش دی تھی اس کے بل پر وہ کسی اور کا سامنا ہوتا تو اس سے کہیں بڑھ کر بدلحاظ ہو جاتا۔ روپیہ پیسہ کے معاملہ میں وہ نہایت بے صبر واقع ہوا تھا اور اپنے مفاد کے پیشِ نظر لگی لپٹی رکھنے کا عادی نہ تھا۔

حنیفہ پھوپھی کے دل پر آسیہ بیگم کے آنسوؤں نے نشتر چلا دیا وہ جس بات کو اب تک ضبط کئے بیٹھی تھی وہ اُس کے سینہ میں جیسے اُبلنے لگی۔ اُسے اُٹھتے دیکھ کر آسیہ نے اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا۔

"تو تو پگلی ہے ـــــ بھلا اس میں شرم کس بات کی۔ پھر یہی تیرے بچوں کا اور تیرا وارث ہے، سرپرست ہے اس سے کیا پردہ؟ ذرا اس طرف آکر میری بات سنو اعجاز؟"

وہ کہتے کہتے برآمدے کی طرف چل دی۔ اعجاز نے چونک کر دونوں عورتوں کی طرف باری باری دیکھا اور تجسس کا انداز اپنے بشرے پر لئے ہوئے بوڑھی پھوپھی کے پیچھے پیچھے چلا اُس کی نگاہوں میں سے تجسس آمیز دہشت جھلک رہی تھی جیسے وہ آنے والے خدشہ کو کسی حد تک سمجھ چکا ہو۔

"بیٹا تیری بھاوج اُمید سے ہے ـــــ ایسے موقع پر اُسے کسی طرح کا مزید صدمہ پہنچانا دُرست نہیں۔ چند ے انتظار کر لو بھیا اللہ پاک سے کیا دُور ہے۔ کہ وُہ اہلِ خیر سے اسے بیٹا دے دیوے اور تیرے بھائی کی نسل باقی رہے۔ چند مہینے کی بات ہے دیکھو اللہ کے حکم سے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اتنا عرصہ اسے بدستور اپنے شوہر کی املاک پر قابض رہنے دو اس کے دل میں کسی طرح محرومی کا احساس پیدا نہ ہو۔ یاد تو کرو اس نے کیسے کیسے چاؤ کے ساتھ تمہاری شادی کی تمہارے بچوں کے شگون منائے تمہاری ہر خوشی میں دلی خلوص سے شریک ہوئی تمہیں بھی چاہیئے کہ صدیقہ کی باتوں پر کان نہ دھرا کرو اور خلوص والوں کے ساتھ خلوص ہی سے برتاؤ کرو۔"

اس خبر نے اعجاز کے خرمنِ قرار پر جیسے بجلی گرا دی وہ دونوں میاں بیوی دو تین مہینوں سے جو ہوائی قلعے تعمیر کر رہے تھے وہ ایک ہی

دھماکے میں بھک سے اُڑتے نظر آئے وہ دل ہی دل میں جیسے کٹ کر رہ گیا۔

"پھپھو! بس تمہاری ایک یہی بات اچھی نہیں کہ تم ایک دم سے بیچاری صدیقہ پر ہی پل پڑتی ہو حالانکہ وہ کبھی بھی کسی کا بُرا نہیں چاہتی۔ میں نے اس کے کہنے پر کس کے ساتھ بُرائی کی کہ تم یوں کہہ رہی ہو۔

اعجاز نے سارا اغبار پھوپھی حنیفہ ہی پر نکالنا چاہا۔ جو خبر اُس نے سنائی اُسے یکسر اَن سنا کر دیا۔

"چلو اچھا ہے اگر وہ کسی کا بُرا نہیں چاہتی تو اللہ پاک اُسے نیک نیتی کے لئے جزائے خیر دے۔ اُس کا سہاگ قائم رہے اُسے بچوں کی مرادیں دیکھنا نصیب ہوں۔ میں تو بیٹا تم لوگوں کی خیر خواہ اور دعا گو ہوں۔ مجھے کسی سے خدا نہ کرے بیر تو ہے نہیں:

پھوپھی حنیفہ پیار سے اُس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی مگر ان پُرخلوص باتوں سے اعجاز کی پیشانی پر کے شکن صاف نہ ہو سکے اور وہ ابرو سمیٹے کچھ سوچنے لگا۔

"بیوی کی وکالت میں تم نے اتنی بڑی خوشخبری کو اَن سُنا کر دیا —— میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں انتظار کر لینا چاہیئے۔ اور اتنا عرصہ اپنی بھاوج اور بھتیجیوں کے خرچ کا فکر رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ تم جانتے ہو آسیہ بیچاری کے پاس جتنا اندوختہ تھا وہ چالیسویں تک ختم ہو گیا اب قرض پر گھر کا گزارہ ہے۔"

بوڑھی عورت اس کے چہرے پر اپنی دھندلی نگاہیں جمائے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تم لوگوں نے اس بات کی پہلی ہی کیوں خبر نہ کی۔ تاکہ میں سرِ دست یہ ذکر نہ چھیڑتا" وہ کچھ بددلی سے کہنے لگا۔

"میں نے تو کئی دفعہ ارادہ کیا مگر آسیہ نے منع کر دیا اور پھر مجھے بھی تو یہی

کوئی آٹھ دس روز ہوئے کہ بتایا ہے اُس نے۔ وہ ہمیشہ یوں ہی کہا کرتی تھی مارے شرم کے کئی مہینے چھپائے رکھتی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے ——!"

اس نے مبہم جیسے انداز سے کہا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا باہر کے دروازہ کی طرف چلا۔

"اچھا بھابی میں چلتا ہوں — جو کچھ ضرورت ہو کہلوا دیجئے گا۔"

اس نے دروازے کے قریب پلٹ کر رسمی طور پر کہا اور باہر نکل گیا۔

"پھپھو! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا — خواہ مخواہ —"

آسیہ بیگم شکایت آمیز لہجہ میں کہہ رہی تھی کہ حنیفہ نے بات کاٹ کر کہا۔

"خدا اچھا ہی کرے گا بنو! میرا تو کلیجہ نکل گیا اس اعجاز کی باتیں سُن کر! آیا بیچارہ حویلی سے میرے بچوں کو بے دخل کرنے والا۔ میں تو قیامت تک ایسا نہ ہونے دوں گی۔"

"لیکن آپ نے جو یہ بات ——؟"

"تو کیا ہے ——؟ اس کے سوا چارہ جو نہیں تھا۔ مالک بننے والے تو مکان تک سے نکالنے کے لئے آ پہنچے ہیں۔ مگر میرے اللہ نے چاہا تو نیاز کی جائیداد کا وارث اُس کا بیٹا ہوگا۔ اور اس کی سرپرست کی حیثیت سے تم سیاہ و سفید کی مالک ہو گی۔ دشمن منہ دیکھتے نہ رہ جائیں تو سہی!"

بڑھیا بڑے جوش و خروش کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ آسیہ بیگم خاموشی سے سرنگوں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔

۴

یہ خبر سارے میں یوں تیزی سے پھیلی جیسے جنگل میں آگ! سنتے ہی برادری کی عورتیں مارے تجسس کے مبارکباد کے بہانے آسیہ بیگم کے ہاں دوڑی دوڑی آئیں اور خوشی کا اظہار کر کے واپس جاتیں۔ بعض چہ میگوئیاں کرنے کے لئے راؤ اعجاز احمد کی بیوی صدیقہ کے پاس پہنچیں اور اس سے طرح طرح کی باتیں سن کر پھر آسیہ کے ہاں آتیں اور لگائی بجھائی کر کے اس غریب کا دل جلاتیں۔ انہیں یہ اچھا خاصہ شغل مل گیا تھا۔ ایک دن آسیہ کے پاس تین چار مہمان عورتیں صحن میں بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔

"خدا سمجھے اس صدیقہ سے! اللہ ماری جلی بھنی بیٹھی ہے یہ خبر سن کر!" ایک بھاری بھرکم خاتون آسیہ کے سامنے پلنگ پر پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی اور ہاتھ بنا بنا کر باتیں کر رہی تھی۔

"جلنے والے جلتے ہی رہتے ہیں مگر خدا کی دین کے انداز نرالے ہیں وہ جس پر اپنا فضل کرنا چاہے کر ہی دیتا ہے۔ بدخواہوں کی نہیں سنتا" دوسری خاتون بڑی عقیدت مندانہ صورت بنا کر بولی۔

"ہاں بس یہی دیکھ لو۔ دشمنوں نے کچھ سوچ رکھا تھا خدا نے کچھ اور کر

دکھایا!" تیسری کہنے لگی۔

"یوں کہو ان معصوم بچیوں کے حال پر رحم آ گیا ذاتِ باری کو۔" دُوسری خاتون نے بدستور عقیدت بھرے لہجہ میں کہا۔

"وہ اللہ ماری صدیقہ کہنے لگی کوئی پیغام تو نہیں آ گیا۔ کہ اب کے ضرور لڑکا ہی ہو گا۔ اور بھی بہت کچھ بکتی رہی۔" آسیہ کے روبرو بیٹھی ہوئی اُسی بھاری بھرکم خاتون نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"بکنے دو! میرے اللہ کو منظور ہوا تو سارے منصوبے دھرے رہ جائیں گے۔ آسیہ کے بیٹا ہی ہو گا۔!" پھوپھی حنیفہ بولی۔

"انشاءاللہ!" سب بیبیاں یک زبان ہو کر بولیں۔

"کلموہی کہتی تھی ہوا بھی تو تین لڑکیوں کے اُوپر سے تیکھلا لونڈا منحوس ہوتا ہے، پیٹ میں پڑتے ہی باپ کو لیا پیدا ہو گا تو خبر نہیں کس کو کھائے گا!" تیسری خاتون کہنے لگی۔

"کھائے گا اپنے بُرا چاہنے والوں کو۔ اُس پر سے صدقہ اتریں گے وہ سارے کے سارے!" پھوپھی حنیفہ بولی۔

"ہائے پھوپھی! اعجاز کو بھی بیچ ہی میں کوسنے دے رہی ہو؟" پہلی خاتون ہنس کر کہنے لگی۔

"تو کیا اعجاز بھی بھائی کی اولاد کا بدخواہ ہے۔ وہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کے بڑے بھائی کی نسل چلے؟" دوسری خاتون پوچھنے لگی۔

"اور نہیں تو کیا؟"

پہلی نے حسبِ عادت ہاتھوں کی جنبش سے اپنے خیال کو پُر زور بنایا۔

"لعنت ہے بھئی!" دوسری خاتون نفرت سے بولی۔

"ایسے بھی بھائی ہوتے ہیں دُنیا میں! خدا بچائے!" تیسری کہنے لگی۔

"صدیقہ تو پھر بھی غیر ہے منحوس کہے یا جو بھی کہہ گزرے عجب نہیں۔" پہلی

خاتون کہنے لگی۔

"مگر کیوں منحوس کہے؟ مسلمان ہو کر ایسا لفظ کیوں منہ سے نکالے؟ ہمارے پیغمبر خیر البشر تھے رحمت اللعالمین تھے مگر ان کے والدان کی پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ بلکہ ایسا بچہ تو غیر معمولی شخصیت کا مالک ہوتا ہے جسے قدرت دنیاوی محافظ سے محروم کر دیتی ہے اُس کی خود حفاظت اور رہنمائی کرتی ہے۔ خالقِ حقیقی کو اِس سے کوئی بہت بڑا کام لینا منظور ہوتا ہے۔" تیسری خاتون نے کہا۔

"بیشک! بیشک؟"

سب خواتین نے عقیدت بھرے لہجہ میں تائید کی۔ آسیہ بیچاری سرنگوں اور خاموش بیٹھی تھی۔ البتہ کسی کسی وقت پھوپھی حنیفہ کی طرف عجب معنی خیز نگاہ سے دیکھتی تو وہ بھی اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دیتی۔

"ہاں سچ آسیہ! میں پوچھنے کو تھی کہ تمہارے چھوٹے بھائی کو بھی خبر ہوئی ہو گی بہنوئی کے حادثہ کی؟" اس کے قریب بیٹھی ہوئی خاتون نے پوچھا۔

"کِسے جمیل کو؟ جی ہاں پردیس میں بیچارے کو خبر پہنچی میں نے تو منع کر دیا تھا۔ کہ اُسے اطلاع نہ دی جائے لیکن کسی دوست نے لکھ دیا۔ اُسے عتیقہ کے ابو سے خاص اُنس تھا۔ اس قدر دردناک خط لکھتا ہے کہ دل کے زخم کُھل جاتے ہیں پڑھ کر!" آسیہ کہتے کہتے رو پڑی۔

"نہ رویا کرو آسیہ! اپنے دل کو پُر اُمید رکھا کرو اور کوئی کلمۂ خیر ہر وقت وردِ زبان رکھا کرو۔ تم پر اس وقت بڑا آزمائش کا دَور گزر رہا ہے۔ اللہ پاک تم پر اپنی رحمت و برکت نازل فرمائے اور تمہیں زندگی والا فرزند عطا کرے۔" ایک خاتون بولی۔

"آمین!"

کئی آوازیں یک زبان ہو گئیں۔ اتنے ہی میں چوکیدار نے ڈیوڑھی میں آواز

دی۔ گھر کی خادمہ رحیمن گئی تو سوٹ کیس اور ٹوکری اُٹھائے ہوئے واپس آئی۔

"راولپنڈی سے کوئی مہمان آئے ہیں بانو!" وہ سامان رکھتے ہوئے بولی۔

"کون آیا ہے پوچھ لیا ہوتا ـــــ اے بشیر بھائی آئے ہیں! بلا لو نا اندر، باہر کیوں ٹھہرا چھوڑا۔" آسیہ نے سوٹ کیس کے اُوپر سے نام پڑھتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے پوچھا ہے کوئی ہے تو نہیں۔ میں نے بتایا کہ چند پردہ والی بیبیاں بیٹھی ہیں تو وہ ڈیوڑھی میں ٹھہر گئے اور اطلاع کرنے کو کہا۔" رحیمن نے بتایا تو آسیہ کو بھی خیال آیا۔

"اُہو! ہاں سچ ـــــ پھپھو آپ سب کو دوسری طرف لے چلیں۔ بشیر بھیا آئے ہیں۔ رحیمن، دھوپ میں کرسیاں نکال دو۔" آسیہ نے کہا۔

"کرسیاں تو رکھی ہوئی ہیں بانو!"

رحیمن نے جواب دیا اور سب خواتین پردہ میں جانے کے لئے اٹھیں۔

"یہ کون سے بھائی ہیں آسیہ؟"

اُس کے قریب سے اٹھنے والی خاتون نے اپنا بوجھل وزن سنبھالتے اور جوتی پہنتے پہنتے پوچھ ہی لیا۔

"یہ میرے ماموں زاد بھی ہیں اور دودھ شریک بھائی بھی۔ میں چھوٹی تھی کہ امی بے حد بیمار ہوئیں اللہ جنت دے ممانی نے ان کے ساتھ مجھے اپنے دودھ پر ڈال لیا۔ سگے بھائیوں سے زیادہ چاہتے ہیں مجھے۔"

آسیہ کی آواز رقت سے رندھ گئی۔

"تو اب تین مہینے کے بعد آئے ہیں بہنوئی کے افسوس کے لئے؟"

ایک اور خاتون اعتراض کے لہجہ میں بولیں۔

"جاپان گئے ہوئے تھے کاروباری سلسلہ میں اَب آئے ہوں گے تو سُنا ہو گا۔ میں نے اطلاع نہیں کرائی تھی۔ کہ کیا پریشان کرنا بیچارے پردیسیوں کو۔ مگر شکایت کریں گے کہ کیوں نہ خبر کی۔" آسیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اے رحیمن! جا بلا لا وہ کیا کہیں گے کہ اتنی دیر ڈیوڑھی میں ٹھہرا چھوڑا؟"

پھوپھی حنیفہ نے کہا اور بیبیاں جلدی جلدی برآمدہ میں چلی گئیں۔ لیکن چق کی اوٹ میں کھڑی ہو گئیں۔ ایسے دردناک منظر عورتوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں! اور اتنے ہی میں ایک دراز قامت اور سرخی مائل گندمی رنگت کا صحت مند شخص رحیمن کے ساتھ صحن میں داخل ہوا۔ اس کی موٹی موٹی پرکشش آنکھیں جوشِ گریہ سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ اُس کے داخل ہوتے ہی گھر میں ایک دفعہ پھر کہرام مچ گیا۔ آسیہ چیخیں مارتی ہوئی اس کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی۔ بچیاں بھی آگئیں نوکر چاکر جمع ہو گئے۔ سب رو رہے تھے۔ پھوپھی حنیفہ نے آہستہ سے آسیہ کو الگ کر کے بٹھایا اور نو وارد بھائی نے اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"آسیہ بیچاری کو تو خیر ہوش کب ہو گا کہ یہ کسی کو لکھتی لکھاتی مگر مجھے آپ لوگوں سے بے حد شکوہ ہے کہ آپ نے مجھے اطلاع نہ کی کل شام میں گھر پہنچا تو اچانک سُن کر میں تو جیسے پتھر ہی ہو گیا یقین نہیں آ رہا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"نہیں! اسے اتنا ہوش تو ضرور تھا کہ خبر نہ کرو میرے بھائی پردیس میں پریشان ہوں گے! اس نے منع کر دیا بیٹا ورنہ میں اعجاز سے کہہ کر تمہیں ضرور اطلاع کراتی۔" پھوپھی حنیفہ کہہ رہی تھی۔

"آسیہ کے ساتھ کس قدر شکل ملتی ہے اس آدمی کی جیسے سگے

بھائی بہن ہوں!

وہی بھاری جسم والی خاتون اپنے قریب کھڑی ہوئی عورت سے سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔

"ہاں ماموں پھوپھی کی اولاد جو ہوئی۔ آسیہ کی صورت اپنی ماں سے ملتی ہو گی اور ماں اپنے بھائی کی ہمشکل ہو گی۔"

عورتیں وہیں چق کے پیچھے کھڑی حسب عادت غیر ضروری اور بے ربط باتیں کر رہی تھیں۔ بشیر نے اب بہن کو تسلی و تشفی دینی شروع کی راؤ نیاز احمد کے حادثہ کا حال سننے کے بعد چند المناک حادثات کی کیفیت بیان کی جو اس کے مشاہدہ میں آئے تھے۔ انسانی فطرت ہے کہ اُسے اس حقیقت کو معلوم کر کے تسکین ملتی ہے کہ وہ تنہا ہی مصائب کا شکار نہیں بلکہ اُس کے کئی ہم جنس اُس سے بھی زیادہ دکھی اور مصیبت زدہ ہیں۔ اور یہ موازنہ رفتہ رفتہ اس کے خونچکاں زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔

ایک مخلص ہمدرد کو قریب پاکر آسیہ بیگم کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے غم و الم کا بوجھ ایک حد تک کم ہو گیا ہے۔ گوناگوں اُلجھنوں کے سلجھ جانے کی اُمید نے اس کے بیقرار دل کو کچھ تو سکون بخشا مہمان عورتیں رخصت ہوئیں تو پھوپھی حنیفہ نے اندر کے کمرے میں کرسیاں رکھوائیں اور کھانے سے فارغ ہو کر تینوں دھوپ میں جا بیٹھے۔ علیقہ دونوں چھوٹی بہنوں کو اپنے کمرے میں پڑھا رہی تھی۔ رحیمن کھانا پکا کر دوپہر کو دو گھنٹے اپنے گھر کا کام کاج دیکھتی تھی۔ موقعہ پاکر حنیفہ پھوپھی نے بشیر کو آگاہ کر دیا تھا کہ آسیہ اُمید سے ہے اور یہ خبر ہمدرد بھائی کے لئے خاصی تسکین دہ ثابت ہوئی ورنہ اس سے پیشتر وہ آسیہ اور اس کی بچیوں کے مخدوش مستقبل کے پیش نظر بے حد فکر مند تھا لیکن اب تو وہ بھی اُمید افزا گفتگو سے بہن کے رنج و غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ آسیہ جواب تک پھوپھی حنیفہ

سے اس بات پر بگڑ رہی تھی کہ اُس نے یہ بات سارے میں کیوں مشہور کر دی کہ آسیہ دو جان سے ہے اب اس سلسلہ میں بشیر کی تائید شامل ہونے پر مطمئن ہو گئی۔ بشیر نے پھپھو حلیمہ کی مصلحت اندیشی اور دُور اندیشانہ پالیسی کی اس قدر تعریف کی کہ آسیہ اس سیدھی سادی کم گو عورت کی عقلمندی اور گھریلو سیاستدانی کی قائل ہو گئی۔ اب تو وہ اس کے اخلاص اور خیر خواہی کی وہ چند معترف تھی۔

بشیر کا آجانا گھر کے چھوٹے بڑوں سب کے لئے تسکین کا باعث تھا آسیہ کی بچیاں اس سے بے حد مانوس تھیں۔ عتیقہ اب بڑی ہو گئی تھی اور عمر کے اس دَور میں تھی جب نوخیز دوشیزاؤں کو ایک انجانا سا جذبہ ایک عجیب سا احساسِ خود آگہی؛ دُوسروں کی نگاہوں سے دُور دُور رہنے کی فہمائش کرتا ہے اور وہ حب سے چھُپی چھُپی پھرتی ہیں۔ مگر عائشہ اور عامرہ ہر وقت بشیر کے گرد منڈلاتی رہتیں۔ باپ کی محبت کو ترسی ہوئی معصوم، رُوحیں ایک مخلص بزرگ کی شفقت پا کر یوں محسوس کرتی تھیں جیسے انہیں کوئی کھوئی ہوئی انمول چیز واپس مِل گئی ہو۔ وہ بلا تکلف اس سے فرمائش کرتیں ماں بھی بھائی کے ڈر سے انہیں ڈانٹ نہ سکتی کیونکہ بشیر نے اس سے کہہ دیا تھا۔ اگر وہ بچیوں کو ڈانٹ کر اُن کے دل میں بیگانگی کا تکلف پیدا کرے گی تو وہ خفا ہو کر واپس چلا جائے گا۔

”کوئی تو ایسا ہونا چاہیئے جس سے بچیاں نہایت دوستانہ بے تکلفی کے ساتھ اپنی ہر ضرورت ہر تکلیف ظاہر کر سکیں۔ معصوم خواہشات کو مارنے اور گھٹے گھٹے رہنے سے بچے کے کئی ارفع جذبات ناپید ہو جاتے ہیں بہت سے اعلےٰ رجحانات مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ گھٹیا اور سفلہ جذبات و خواہشات اُبھر آتے ہیں۔“

بشیر نے کچھ ایسے موثر پیرانہ سے بہن کو نفسیات کا یہ نازک نکتہ سمجھایا۔

کہ اب وہ ماموں اور بھانجیوں کے معاملہ میں دخل نہ دیتی بلکہ اُن کی باہمی گفتگو کو غور سے سُنتی اور دلچسپی لیا کرتی۔ ایک شام وہ بازار سے کچھ سامان خرید کر لایا تو اس میں بیشتر چیزیں عائشہ اور عامرہ کی فرمائش کی تھیں۔ عتیقہ تو فرمائش کرنا، درکنار ماموں کے سامنے ہی بہت کم آتی تھی وہ خود ہی اس کے لئے اپنی پسند کی کچھ چیزیں لے آئے تھے۔ ایک نہایت خوبصورت اُونی شال تھی۔ سویٹر کے لئے اُون۔ ایک قیمتی پین اور ایسی ہی کئی اور چیزیں۔

”میں جاپان سے تم سب بہنوں کے لئے بہت سے تحفے لایا تھا مگر مجھے سامان کھولنے کا ہوش ہی نہ رہا اور چلا آیا اب آؤں گا تو سب چیزیں لاؤں گا۔“ وہ عتیقہ سے کہہ رہا تھا۔

”آپ نے اتنی تکلیف کی ماموں جان!“ عتیقہ نے شکریہ ادا کرتے کے بعد ان تحائف کو دیکھتے ہوئے شرما کر کہا۔

”بچے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ بڑوں سے چیز لینا اُن کا حق ہوتا ہے تم نے یہ دقیانوسی باتیں کہاں سے سیکھیں؟“ بشیر نے اُس کے سر کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”ماموں؟“ عائشہ نے اپنی چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے پکارا۔

”جی بیٹے!“

بشیر نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ناک چڑھائے خفا سی نظر آئی۔

”یہاں تو آؤ! کیا بات ہے؟“ ماموں نے پوچھا۔

”آپ پھر میرا باوا لے کر نہیں آئے — !“

وہ بسور کر کہنے لگی۔ عتیقہ نے تادیبی نگاہوں سے اُسے گھورنے کی کوشش کی مگر وہ اُس سے نگاہ ہی نہیں ملا رہی تھی!

„ناشکری کہیں کی! بیسیوں چیزیں جھولی میں بھرے کھڑی ہے ابھی باوے بد بخت کی کمی رہ گئی!” ماں نے کہا۔

„نہیں بھئی ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چاہیئے ہم کل بھی اپنی بیٹی کی خاص فرمائش پوری نہ کر سکے —— مگر سنو تو سہی نا اِدھر آؤ ہمارے پاس!

وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولے مگر عائشہ اپنی جگہ پر ساکت تھی۔ عتیقہ نے اُس کا بازو گھسیٹ کر ماموں کے ہاتھ میں تھما دیا اور منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔ عامرہ سب سے بے نیاز اپنی ٹافیاں کھانے میں مصروف تھی۔

„وہ ہوا یوں۔ کہ ہم نے ایک کارخانہ میں تمہارا باوا بنوانے کے واسطے آرڈر دیا ہے۔ ابھی وہ بنا نہیں تھا —— سارا تو بن گیا مگر سر نہ بنا تھا ابھی! کہو تو ہم ابھی جا کر وہ بے سر کا باوا لئے آتے ہیں؟ کیوں کیا خیال ہے؟” وہ نہایت سنجیدہ صورت بنائے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

„اوں —— وہ کیسا ہوگا مُوا بے سرا باوا —— ہم نہیں لیتے!”

وہ بسور کر کہنے لگی سب نے ہنسنا شروع کیا تو وہ رونے کے قریب ہو گئی۔

„تو پورا بن جانے دو۔ بس کل بن جائے گا!” بشیر نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

„اگر کل بھی نہ بنا تو ——؟” اُس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

„یہ ہم ذمہ دار بیٹھے ہیں! بنے گا اور ضرور بنے گا کل۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے چوبیس گھنٹوں میں ایک کارخانہ صرف ایک باوے کا سر تک نہ بنا سکے؟” بشیر نے اُسے گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

„ماموں جان! وہ کون ہوتا ہے کارخانہ؟” عامرہ نے پوچھا۔

„تمہاری ٹافیاں ختم ہو چکیں کہ تمہیں بھی ہوش آیا؟” عتیقہ نے پوچھا۔

„باوا بنانے والا آدمی اور کون ہوتا ہے کارخانہ!“

عائشہ نے تیوری چڑھا کر چھوٹی بہن کی طرف یوں دیکھا جیسے اُس کی کم علمی پر خفا ہو۔ مگر اس کی بات پر جب سب نے قہقہہ لگا کر ہنسنا شروع کیا تو وہ کھسیانی ہو گئی اور کسمسا کر بشیر کی گود سے اُترنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر ماموں نے اُسے بازوؤں میں دبوچ کر قابو کر لیا۔

„ہیں ہیں! یہ ہم سے کیوں خفا ہو گئیں۔ دیکھو بھئی! قسم لے لو جو ہم ہنسے ہوں ——! ہاں تو ہم تمہیں بتانے ہی والے تھے کہ کارخانہ کسے کہتے ہیں جب یہ سب لوگ خواہ مخواہ ہنس دیئے!“

اُنہوں نے بچّی کے رخسار کو سہلاتے ہوئے کہا۔ اور وہ ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

„دیکھو نا کارخانہ ایک بہت بڑا مکان ہوتا ہے جہاں بہت سے آدمی مِل کر کام کرتے ہیں۔ اور بہت سی چیزیں بناتے ہیں۔ یہ تمہارے کپڑے کسی کارخانہ میں بنائے گئے ہوں گے۔ تمہاری یہ جوتیاں کسی کارخانہ میں بنی ہوں گی۔ آیا سمجھ میں؟“

ان کے پوچھنے پر عائشہ نے سر ہلایا۔

„تو بہت سے آدمی میرے باوے کا سر بنا رہے ہیں؛ بھلا کتنا بڑا ہوگا باوا؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

„بہت بڑا —— تم سے تو اٹھایا۔ بھی نہ جا سکے گا۔“ ماموں نے جواب دیا۔

„ماموں جتنا باوا ہوگا! آپا جی!“ عامرہ یکدم تالیاں بجاتے ہوئے کہہ اُٹھی تو سب ہنسنے لگے۔

„اُوں —— ایسا باوا ہمیں نہیں چاہیئے جو ہم سے اٹھ بھی نہ سکے!“ عائشہ پھر رونے لگی۔

"اچھا تو کتنا چاہیئے؟ منا سا؟" بشیر نے پوچھا۔

"ہوں ——" عائشہ نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"بہت اچھا بھئی منا سا بابا آئے گا ہماری بٹیا رانی کا بس اب خوش ہو جاؤ۔ اور اپنی چیزیں سنبھالو جا کر۔" وہ اسے گود سے اُتارتے ہوئے بولے۔

چنانچہ بشیر کے آجانے سے اس طرح اس سوگوار گھر کے غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے ماحول میں جیسے زندگی سی آگئی۔ گھر کے لوگوں کے چہرے ایک دفعہ پھر پُر ملال کیفیت سے پاک اور بکھرے نکھرے نظر آنے لگے۔ وہ اپنے ناقابلِ تلافی نقصان کو جیسے بھُول سے گئے تھے۔ آسیہ تک کے ہونٹوں پر کسی کسی وقت مسکراہٹ دکھائی دینے لگی تھی۔ نیک خُو اور خوش خلق آدمی کی صحبت بھی ایک نعمت ہے۔

(۵)

"تمہاری موٹر تو اچھی بھلی قابلِ مرمّت ہے۔ میں ورکشاپ جا کر اُسے دیکھ آیا ہوں۔ بچیاں ناحق آمد و رفت میں تکلیف اُٹھاتی ہیں۔ اتنے دنوں خیال ہی نہیں آیا ورنہ جب سے آیا ہوں ساتھ ہی یہ کام بھی نپٹ جاتا۔"

بشیر اپنی سیاہ شیروانی کے بٹن کھول کر قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ آسیہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی کچھ بُن رہی تھی یہ سُن سُن کر اُس نے بُنائی سے ہاتھ روک لیا اور حیران سی ہو کر بشیر کے منہ کو تکنے لگی۔

"اچھا ۔۔۔؟" اُس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں تو ۔۔۔ میں اُس کی مرمّت کے لئے ضروری سامان خرید کر دے آیا ہوں اور جلد از جلد مرمّت کر دینے کی تاکید کی ہے۔ منیجر کہہ رہا تھا کہ راؤ صاحب نے تو اسے بیچ دینے کو کہہ رکھا تھا میں نے تمہاری طرف سے مرمّت کا آرڈر لکھوا کر سابقہ آرڈر کینسل کروا دیا ہے۔" بشیر نے مزید بیان کیا۔

"لو دیکھ لیا اس اعجاز کا تماشہ؟ کہہ رہا تھا موٹر کا کچھ بھی باقی نہیں بچا۔"

پھوپھی حنیفہ نے اپنی دھندلی نگاہوں میں ملامت اور تنفر پیدا کرتے ہوئے کہا، آسیہ صرف مسکرا کر چپ ہو رہی۔

"آے رحیمن کیا آج کھانا نہیں دو گی۔ دو بجنے کو آ گئے۔ میاں کو بھوک لگی ہو گی" پھوپھی حنیفہ نے باورچی خانہ کی طرف رُخ پھیر کر آواز دی۔

"کھانا تو تیار رکھا ہے بیگم! نکالیے آ کر" رحیمن نے آواز دی۔

"ابھی تو کچھ خاص بھوک نہیں ہے پھپھو! لڑکیوں کو مدرسہ سے آ لینے دیجئے اکٹھے ہی کھائیں گے۔ بچوں کے بغیر رونق نہیں ہوتی دسترخوان پر۔"

بشیر نے کچھ کہتے کہتے رک کر پہلے پھوپھی حنیفہ سے کہا اور پھر آسیہ کو مخاطب کر کے بولا۔

"دوسرا کام بھی ہو گیا۔ ریونیو آفیسر کے ہاں سے تحصیلدار کو حکمِ امتناعی جاری کروا دیا ہے کہ اس خاص وجہ کی بنا پر سرِدست کسی قسم کا انتقال حقوق یا داخل خارج وغیرہ عمل میں نہ لایا جائے۔ مناسب یہ ہے کہ میری بجائے ناصر بھٹی ہی تمہارا مختار عام ہو۔ وہ کل صبح آئے گا اور مختار نامہ کے کاغذ پر دستخط وغیرہ کروا لے گا۔ اس صورت میں مخالفین کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے گی۔ وکیل اور قانونی مشیر ہی سارے ضروری معاملات کی پیروی کرے گا کل بنک اور مکانات کے کاغذات بھی اس کے سپرد کر دینا۔ ان یتیم بچوں کے حقوق کے تحفظ میں تمہیں مردانہ وار ہر قدم اٹھانا چاہیئے۔ بذاتِ خود ہر کام کو دیکھنا چاہیئے۔ ان حالات میں کسی پر بھی اعتماد کرنا مناسب نہیں۔"

وہ بہن کو لیس و پیش سمجھا رہا تھا۔ آسیہ بیچاری خانہ دار خاتون تھی بیرونی کاموں اور جائیداد کے سلسلہ سے اُسے کچھ بھی واقفیت نہ تھی وہ ایسے انتظام کرتی تو کیونکر؟ اس کا دل یکدم گھبرا سا اُٹھا اور شوہر کی عدم موجودگی کے احساس

نے اس کے دل کو بُری طرح تڑپا دیا اور وہ رونے لگی۔ بشیر اُس کے جذبات سے بخوبی واقف تھا۔ مگر ایک ہمدرد بھائی کی حیثیت سے وہ اس میں خود اعتمادی اور کارکردگی کا حوصلہ پیدا کرنا چاہتا تھا جس کی ایک صاحبِ اولاد بیوہ کو اشد ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ایسی نسوانی پردہ نشینی اور حجاب کا قائل نہ تھا۔ جو کسی عورت کو بے دست و پا کر کے دُوسروں کے رحم و کرم کے حوالے کر دے اور اس کے بچوں کے مفاد میں سدِ راہ بن جائے۔

"اللہ میاں تمہاری ہزاری عمر کرے بھیّا! تم تو اس بیکس کے حق میں رحمت کا فرشتہ بن کر آ گئے۔ نہیں تو خود غرض لوگ اسے ہر چیز سے محروم کر دیتے۔ ایک یہ موٹر ہی کا معاملہ دیکھ لو کہہ دیا۔ کہ اس کے تو ٹکڑے سمیٹ کر پھنکوا دئے گئے! اللہ اللہ! کیسی بے جگری سے جھُوٹ بول سکتے ہیں یہ لوگ! ختم درود کے بہانے ہی چالیس دن کے اندر اندر اسے کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا۔ جس قدر نقد پیسہ تھا صاف نکلوا لیا۔ خود ہاتھ رنگے دوستوں یاروں کو ضیافتیں دیں۔ محتاجوں اور مستحقوں کو دروازے سے مار بھگایا جاتا اور نام کو خدا واسطے فاتحہ درود دلوایا جاتا"

پھپھو حقیقت کہنے پر آئے تو لگی لپٹی رکھنے کی عادی نہ تھی۔ خاموش طبع شخص جہاں بردبار اور حلیم الطبع ہوتا ہے وہاں یہ اس کا خاص وصف ہے کہ جب بولنے لگے تو اظہارِ خیال میں بخل یا لحاظ نہیں کرتا۔

"اللہ پاک کو بہتری منظور ہو تو خود ہی وسائل پیدا کر دیتا ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری کاوشیں کیا ہیں۔ جو لوگ اللہ تبارک تعالےٰ کی ہستی پر صدقِ دل سے ایمان نہیں رکھتے وہی اس کے لگے بندھے احکام سے منہ موڑ سکتے ہیں ورنہ اُس پر ایمان رکھنے والے تو خوب جانتے ہیں کہ یتیموں کا حق کسی کو ہضم نہیں ہوتا۔ جلدی یا بدیر کسی نہ کسی طریقے اُسے اُگلنا ہی پڑتا ہے۔ تھوڑے سے دنیاوی فائدہ کے لئے یہ لوگ خبر نہیں کیسے عذابِ الٰہی کو للکارنے کی

جرأت کرتے ہیں!" بشیر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بس یہی کہ انہیں اس عذاب و ثواب پر دل سے ایمان و یقین نہیں ورنہ دِل سے یقین رکھیں تو کبھی اُس سے روگردانی کی جرأت نہ کر سکیں۔" آسیہ نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ ایمان پختہ نہیں ہوتا ایسے لوگوں کا۔" بشیر نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"دنیا کے کتّے پیسے ہی کو خدا جانتے ہیں۔ انہیں کیا خبر خدا کیا ہے اور ایمان کیا چیز!"

پھوپھی حلیقہ بولی۔ اتنے ہی میں ڈیوڑھی میں کچھ شور ہوا اور آسیہ کی تینوں بچیاں صحن میں داخل ہوئیں۔ سب کو سلام علیکم کہہ کر علیقہ تو آگے بڑھ گئی مگر دونوں چھوٹی لڑکیاں دوڑ کر پہلے امّی سے اور پھر ماموں سے لپٹ گئیں۔

"ہمارا باوا بن کر آگیا ماموں جان!"

عائشہ نے بشیر کے گلے میں باہیں ڈال کر جھولتے اور باوے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل آگیا —— یہ رہا باوا!"

بشیر نے قریب کی تپائی پر سے ایک بہت بڑا سارا پیکیٹ اُٹھا کر عائشہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے جلدی سے بستہ کندھے پر سے اُتار کر ماں کے سامنے پھینک دیا اور ماموں کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ کر پیکٹ کو کھولنا شروع کیا وفورِ شوق سے اُس کے ننھے ننھے ہاتھ بہک رہے تھے اور بند کی گرہ کھل نہیں رہی تھی۔

"لاؤ میں کھول دوں گرہ!"

بشیر نے کہا اور گرہ کھولنے میں عائشہ کی مدد کی اب اُس نے کاغذ

کھولا۔ اندر سے ویسا ہی لپٹا ہوا ایک اور پیکٹ نکلا۔ اُسے کھولا تو پھر پیکٹ نکل آیا۔ بشیر دلچسپی سے اُس کی بے صبری کا جائزہ لے کر مسکرا رہا تھا۔

"ہائے اللہ!"

چوتھی مرتبہ کاغذ کی تہ کھولنے پر وہ بے صبر ہو کر بولی۔ اس کے گرد کاغذوں کا ڈھیر لگ گیا مگر باوا کچھ اتنے پردوں میں چھپا تھا کہ نکلنے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔

"آپا جی! اس میں کچھ بھی نہیں ہوگا!"

عامرہ حسبِ عادت تالیاں بجا کر اُچھلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ عائشہ نے بسورتے ہوئے شکایت بھری نظروں سے ماموں کی طرف دیکھا اور آخری تہ کھول کر ایک ننھی سی ڈبیہ نکالی اور اُسے کھولا تو اندر دو انچ کا باوا تھا۔ سب نے دیکھ کر ہنسنا شروع کیا مگر عائشہ نے اپنے ہونٹوں پر پیدا ہوتے والی کھسیانی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے باوا کاغذوں کے انبار میں پھینک دیا اور رونے لگی۔

"ارے! ارے! یہ کیا خود ہی تو کہا تھا بے حد ننھا سا باوا ہو اور اب خود ہی خفا ہو رہی ہے ——!" وہ اُسے زبردستی پکڑ کر گود میں لیتے ہوئے بولا۔

"میں نے یہ کب کہا تھا کہ اتنا ذرا سا باوا ہو!" عائشہ آنکھوں کو ملتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اصل میں یہ اس باوے کا سیمپل ہے جو کارخانہ میں بن رہا ہے —— "سیمپل" جانتی ہو نا؟ یعنی نمونہ! بالکل ایسا ہی مگر بہت بڑا ہوگا وہ باوا!"

عائشہ بہل گئی اور نمونہ کے باوے کو مٹھی میں دبائے اصلی باوے کے متعلق ماموں سے سوالات کرنے لگی۔ وہ بغیر کسی قسم کی اکتاہٹ یا بیزاری

ظاہر کیئے بڑی دلچسپی سے اُس کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ اتنے ہی میں رحیمن نے کھانا تیار ہونے کا اعلان کیا۔ اور سب لوگ اُٹھ دسترخوان پر آئے۔ کھانے کے دوران بشیر زیادہ تر بچیوں ہی سے باتیں کرتا رہا۔ ان کی پڑھائی کے متعلق پوچھتا رہا وہ بچوں کے روبرو گھر کے سنجیدہ معاملات کا ذکر کبھی نہیں لاتا تھا۔ آسیہ کو بھی ایسا ہی کرنے کی تاکید کر چھوڑی تھی۔

"ان معصوم فرشتوں کی بے فکر زندگی کے اس تھوڑے سے دور کو تفکرات کی پرچھائیوں سے تاریک اور اداس بنا دینا بہت بڑا ظلم ہے۔ یہ بے فکری درحقیقت ان نونہالوں کی بالیدگی کے لیئے ایک قوت بخش غذا ہے۔ جو انہیں آیندہ زندگی میں پیش آنے والے طوفانِ حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔ جو بچے بچپن میں غمزدہ اور فکرمند بنا دیئے جاتے ہیں وہ سنجیدہ زندگی کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں رہتے۔ وہ زود رنج اور جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ان کی قوتِ فیصلہ کمزور ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کسی معاملہ پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے والا ذہن کھو بیٹھتے ہیں اور صبر و تحمل کے ساتھ حالات سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے۔"

ش ـ ح

بشیر اپنی بہن کو عموماً اس قسم کے چھوٹے لیکچر دیتا رہتا اور اُسے اپنی بچیوں میں انتہائی دلچسپی لینے اور انہیں مثالی مشرقی خواتین بنانے کی فہمائش کرتا رہتا۔ اگر آسیہ کبھی اپنے حالات کے پیشِ نظر متفکر ہوتی اور بچیوں کو ڈانٹ کر اپنے قریب سے ہٹاتی تو بشیر اس بات سے بے حد خفا ہوتا۔

"اپنی طبیعت میں ایسی آدم بیزاری پیدا نہ کرو آسیہ! جو کچھ کھو چکا اُس کی فکر میں اپنے آپ کو اس سے تو محروم نہ کر لو جو کچھ قدرت نے تمہیں دے رکھا ہے؛ ان بچیوں کے ساتھ ان کی معصوم دلچسپیوں میں شریک ہو لیا کرو بہن اگر یہ گڑیوں کے کھیل تک میں تمہیں شریک کرنا چاہیں تو عذر نہ کیا کرو۔ آخر یہ ان کا قصور تو نہیں کہ قضا و قدر نے ان سے باپ چھین لیا کہ

یہ بیچاری اُب ماں کی اپنے لئے دلچسپی اور توجہ سے بھی محروم ہو جائیں ۔"

بشیر کی ایسی باتوں کے نتیجہ پر آسیہ نے اب گھر میں اور بچیوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ مایوسیوں کا وہ گراں بار وزن جس کے نیچے وہ دب کر رہ گئی تھی ایک حد تک کم ہو گیا تھا۔ اور اُس نے بھائی کے ایماء سے جائداد کے کاغذات کی بذاتِ خود دیکھ بھال شروع کر دی تھی۔ بلکہ وہ چند مرتبہ اُسے اراضی دکھانے کے واسطے گاؤں لے گیا تھا اُس نے چند موزوں قطعے نئے باغات لگوانے کے لئے منتخب کئے تاکہ آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ اور عملی طور پر تعمیری تجویزوں میں حصّہ لینے لگی تھی۔

جب بشیر واپس جانے کے لئے تیار ہوا تو گھر کے سب فرد ہی اُداس تھے رحیمن تک باورچی خانہ سے نکل کر آ گئی اور چپ سی کھڑی تھی۔

"میں اگلے مہینے پھر آؤں گا پھپھو! بھلا اس رحیمن بوا کے ہاتھ کے پکے ہوئے کوفتے اور ساگ گوشت مجھے کب آرام سے راولپنڈی بیٹھنے دیں گے ــــ!" وہ ہنس کر کہہ رہا تھا۔

A-42006

"تو نہ جائیے نا ــــ!" رحیمن بولی۔

DELHI PUBLIC LIBRARY
Withdrawn from..........
Department..........
List No..........Item No
Sig..........Checked

"ہوں ــــ؟ نہ جاؤں! سارا کاروبار چھوڑ چھاڑ یہاں بیٹھا تمہارے کھانے کھایا کروں ــ؟"

اُس نے دس روپے کا نوٹ رحیمن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا جسے اُس نے تھوڑے سے لیس و پیش کے بعد لے لیا۔

"سچ تو کہتی ہے رحیمن بوا ــــ نہ جائیے ماموں!" عائشہ نے اس کے بازو کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔

"ارے تجھے تو بس اپنا باوا چاہیئے تھا سو مِل گیا۔ اب ماموں کو رکھ کر کیا کرے گی؟ جتنے دن باوا نہ آیا روز لڑا کرتی تھی۔ باوا آگیا تو لڑائی تک ختم! خبر ہی نہیں ماموں کہاں ہے کہاں نہیں بس باوے ہی کو لباس

दिल्ली पब्लिक लाइब्रेरी (उ)

بدلوانے جا رہی ہیں — نا بھئی! ہم تو چلے! اب اس مردار باوے ہی کو ماموں بنا لو!" بشیر نے بناوٹ سے روٹھتے ہوئے کہا۔

"اوں — ہم نہیں جانے دیں گے۔"

عائشہ نے مضبوطی سے دونوں بازو اس کی کمر کے گرد ڈال دیئے۔ تو وہ اس کے سنہری سر پر ہاتھ پھیر کر ہنسنے لگا۔ عامرہ قریب کھڑی چپکے چپکے رو رہی تھی۔

"بچیاں ضد کرتی ہیں تو رہ جاؤ بھیا! ادھر دیکھو عامرہ کی طرف!" آسیہ نے بچی کو بھائی کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! ہماری منّی بٹیا رو رہی ہے — بھئی وعدہ ہوا ہم دس دِن تک پھر آ جائیں گے ذرا وہاں بھی کام کاج دیکھ آئیں اور پھر تمہارے بہت سے کھلونے وہاں پڑے ہیں وہ بھی لیتے آئیں گے۔ ہوں؟"

وہ عامرہ کو پچکارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ غرض بڑی مشکلوں سے عائشہ اور عامرہ کو بہلا بہلا کر اُن سے روانگی کی اجازت مِل سکی۔ وہ بھی دس روز کے بعد پھر آنے کے وعدہ پر۔ "میں اکثر آتا رہوں گا آسیہ! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جو کوئی فوری کام درپیش ہو مجھے فوراً اطلاع کر دینا میں اطلاع ملتے ہی پہنچوں گا۔ مجھے ہر وقت اپنے قریب سمجھو۔ وہاں ہوتے ہوئے بھی میں تمہاری طرف سے غافل تو نہیں رہوں گا۔ میں نے بھٹی کو تاکید کر دی ہے کہ مجھے ضروری کوائف سے آگاہ کرتا رہے۔"

وہ آسیہ کو تسلی دینے کے بعد رخصت ہوا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گھر سونا سا ہو کر رہ گیا۔ ساری رونق بشیر کے ساتھ ہی چلی گئی۔ گھر والے پژمردہ سے ہو کر بیدلی سے چُپ چاپ اپنے اپنے کام میں لگ گئے — عامرہ اور عائشہ اپنے اپنے باوے کو گود میں لئے ماں کے پاس آ بیٹھیں اور انہیں کپڑے بدلوانے لگیں۔

"امی! سردی زیادہ ہو گئی ہے میرے باوے کا سویٹر بُن دیجئے نا!" عائشہ نے حسبِ عادت ٹھنک کر کہا۔

"اور امیؔ! میرے باوے کو بھی ٹھنڈ لگتی ہے اس کا بھی سویٹر بنا دیجئے!" عامرہ نے اپنے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

"ہاں امیؔ اب تمہارے مُنّے بھیا کے سویٹر بنیں گی یا ان اللہ مارے باووں کے لئے؟" پھوپھی حنیفہ بولی۔

"مُنّے بھیا کے ۔۔۔؟ کہاں ہے منّا بھیا؟" عائشہ نے اپنے باوے کو یکدم پرے سرکاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں دادی جان! کہاں ہے منّا بھیا؟"

عامرہ تو مارے اشتیاق کے چارپائی پر سے کود کر دادی کی گردن سے جا لٹکی!

"ارے آئے گا خیر سے ۔۔۔! تم میری گردن تو چھوڑ دو بھائی!" وہ ہنس کر اُسے پرے ہٹاتے ہوئے کہنے لگی۔

"کہاں سے آئے گا" عامرہ پوچھنے لگی۔

"کارخانہ سے لائیں گے ماموں! جیسے یہ باوے لائے تھے! ہے نا دادی جان!" عائشہ پوچھنے لگی۔

"ہاں تمہیں جب خود ہی معلوم ہے تو مجھ سے کیا پوچھتی ہو بڑی بی؟" حنیفہ نے پھر ہنستے ہوئے کہا۔

"ہوں ۔۔۔ بن رہا ہو گا کارخانہ میں ۔۔۔! آؤ عامرہ باجی کو بتائیں چل کر!"

عائشہ بڑی بہن کو بتانے اوپر دوڑی۔ اور اس کے پیچھے پیچھے عامرہ۔

"آپ بھی بچیوں کے سامنے کیسی بات کہہ دیتی ہیں پھپھو!"

آسیہ بیچاری شرمائی جا رہی تھی ۔۔۔!

"تو پھر کیا ہے ۔ ! دیکھتی نہیں ہو بھائی کا ذکر سُن کر کتنی خوش ہوئی ہیں کہ باوے تک چھوڑ کر بھاگی ہیں !"

پھوپھی حنیفہ کہہ رہی تھی کہ اپنے کمرے کی بالکنی میں عتیقہ آن کھڑی ہوئی۔

"دادی جان ! یہ عائشہ اور عامرہ کیا کہہ رہی ہیں ؟"

وہ کھڑی ہنس رہی تھی۔ بھولا بھالا معصوم چہرہ وفورِ مسرت و اشتیاق سے گلنار ہو رہا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ان کے کھلانے کو باوے آئے ہیں تیرے کھلانے کے لئے اللہ رکھے جیتا جاگتا بھیا آئے گا ! دیکھنا تو سہی دشمن کیسی منہ کی کھائیں گے ۔ بس دعا کیا کرو۔ اللہ تمہاری امّی کو زندگی دے۔ ماموں کو زندہ رکھے !"

وہ ہاتھ اُٹھا کر دُعا کر رہی تھی۔ عتیقہ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی مگر خاموش ہو رہی۔

(٦)

صدیقہ کی حالت تو ایسی تھی جیسے کسی نے اُسے جائز حق سے محروم کر دیا ہو، راؤ نیاز احمد کی جائیداد ہاتھ آتے آتے رہ جانے کے احتمال نے اُسے اس حد تک چڑچڑی اور بد مزاج بنا دیا تھا۔ کہ اپنے بچوں تک کو کاٹنے دوڑتی انہیں کوسنے دیتی اور بدنصیب کہتی۔ کہ آئی لچھمی اُن کے دروازہ سے پلٹ گئی۔ شوہر سے لڑتی کہ وہ بھاوج سے اب تک دبتا ہے۔ ایک ایک پل کی خبر آنے جانے والی عورتوں کے ذریعے اسے ملتی رہتی۔ اور ہر روز کوئی نہ کوئی نیا موضوع میاں بیوی کے درمیان فساد کھڑا کرنے کو پیدا ہو جاتا۔

جب سے موٹر ورکشاپ میں پڑی تھی راؤ نیاز احمد کا ڈرائیو، جو حادثہ کے روز کسی ذاتی کام سے غیر حاضر تھا اسی لئے راؤ صاحب کار خود لے نکلے تھے ـــــ چھوٹے راؤ صاحب کے ہاں چلا آیا تھا۔ مگر جب سے آیا تھا تنخواہ نہیں پائی تھی۔ آخر کب تک بغیر تنخواہ گزر بسر کر سکتا۔ تنگ آکر اُس نے اُن کی ملازمت ترک کر دی اور کار مرمت ہو جانے کی خبر سن کر اپنے سابقہ مالکوں کے ہاں چلا آیا۔ جس وقت صدیقہ کو یہ خبر ملی تو وہ مارے

غصے کے پاگل ہو گئی۔ نور محمد ڈرائیور کے اس طرح غیر حاضر ہونے پر جو گھر میں پوچھ گچھ ہوئی تو کریمو چوکیدار نے بتایا کہ وہ تو بڑے راؤ کے ہاں واپس چلا گیا ہے

"ارے وہ بڑے راؤ کے ہاں اب کیا گھاس کھودا کرے گا؟" صدیقہ نے بگڑ کر پوچھا۔

"جی نہیں حضور! موٹر ہی چلائے گا! میں نے صبح ہی دیکھا بچوں کو اسکول پہنچانے جا رہا تھا!" کریمو نے باہر کی ڈیوڑھی کے دروازہ کی اوٹ میں کھڑے ہوئے جواب دیا۔

"موٹر میں لے جا رہا تھا اُن کی چھوکریوں کو؟" صدیقہ نے ناک چڑھا کر عجب کرودھ سے پوچھا۔

"جی حضور" مؤدب ملازم نے جواب دیا مگر دروازے کا پٹ بیچ میں نہ ہوتا تو صدیقہ دیکھ سکتی تھی کہ کریموں نے زبان نکال کر بھویں چڑھا کر مالک کے یوں تلملانے کا کیسے لطف لیا ـــــ!

"کیسی موٹر تھی؟ نئی خریدی ہے یا کہیں سے پرانا چھکڑا لیا ہے۔ وہی مثل ہوئی کہ رسی جل گئی پر بل نہ گئے! وضع نبھا رہی ہیں بیچاری!" صدیقہ کہتی چلی گئی۔

"وہی راؤ صاحب والی موٹر مرمت ہو کر بالکل نئی نظر آتی ہے رنگ ونگ بھی خوب نئے سرے سے کرا لیا ہے!" کریموں نے جواب دیا۔

"ہیں! کیا بکتے ہو؟ راؤ والی موٹر کیسے ہو سکتی ہے؟" وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔

"جی صاحب! کیا میں پہچانتا نہیں ہوں بڑے راؤ کی موٹر کو؟ اور پھر نورا بھی تو کل شام کہہ رہا تھا کہ موٹر وہ خود ہی ورکشاپ سے لے کر بڑی حویلی جائے گا۔ تاکہ بانو سے معافی بھی آسانی سے مل جائے اور پرانی نوکری پر بھی

بحال ہو جائے۔" کریموں نے ایک اور لقمہ دیا۔

"تو اس جگہ نمک حرام نورے کو کیا تکلیف تھی کہ پھر وہیں ناک رگڑنے گیا۔ اور یہ موٹر کا عجیب قصہ ہے۔ تم نے مجھے رات ہی کیوں نہ خبر کی۔ کہ میں پوچھتی تو سہی وہ تو کہتے تھے۔ کہ گاڑی کو بیچ دینے کے لئے کہہ رکھا ہے۔"

صدیقہ نے خفگی سے کہا۔ مگر کریموں چپ ہو رہا۔ اور وہ بڑبڑاتی ہوئی اور چلی آئی راؤ اعجاز دوپہر کو گھر آیا تو اس کے استقبال کے لئے ایک خاصہ طوفان موجود تھا۔ بیوی نے اندر قدم رکھتے ہی چیخم دھاڑ شروع کر دی۔

"مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ کہ یوں دم دلاسے دے کر تم آخر کو میرے سر میں خاک ہی ڈالو گے ہر بات میں اُسی ڈائن کا پلہ بھاری ہے۔ وہ نخصمی اور نپوتی ابھی تک مجھ پر حاوی ہے اور جو چاہتی ہے کرتی ہے!" اُس نے روتے ہوئے کہا۔

"ارے بات کیا ہوئی کچھ پتہ بھی چلے؟"

شوہر نے نہایت بردباری سے مسکرا کر پوچھا۔ بیچارہ راؤ اعجاز نہایت ہی سعادت مند قسم کا شوہر تھا۔

"تم تو کہتے تھے کہ کار بیچ دینے کو کہہ رکھا ہے؟ مگر وہ مُرمّت ہو کر مالکوں کے گھر پہنچ گئی! وہ نمک حرام نورا بھی اس گھر پر تھوک کر پھر وہیں معافی مانگنے چلا گیا، میں کہتی ہوں وہ عورت گھر بیٹھے بیٹھے تمہیں ہر بات میں مات دے رہی ہے! اچھے مرد ہو اور خاک تمہارا اثر رسوخ ہے کہ چپ بیٹھے ہر تھپڑ سہہ رہے ہو اور چوں تک نہیں کر سکتے۔ کہاں گئے وہ تمہارے پٹواری اور تحصیلدار جو تمہیں طفل تسلّیاں دیتے رہے کہ کھڑے کھڑے ساری جائیداد تمہارے نام منتقل کرا دیں گے؟" وہ چیختی چلی جا رہی تھی۔

"وہ بیچارے تو سب کچھ کرتے ہیں مگر مال افسر کی عدالت سے جو حکم امتناعی جاری ہو گیا۔ کہ فی الحال کوئی کارروائی نہ کی جائے تو بتاؤ وہ کیا کرتے ؟"

راؤ اعجاز نے دھیمے لہجہ میں جواب دیا۔

"یہ سارے ہتھکنڈے اُس کا کچھ لگتا وہ ہوا بشیر بتاتا ہے اُسے اور نہ وہ گھر میں بیٹھنے والی عورت یہ سب کیسے کر سکتی ہے ـــ ؟ اور تم بھاوج سے خبر نہیں کیوں اس قدر دبتے ہو، کونسے اوگن چھپا رکھے ہیں تمہارے اُس نے ! کہ یوں ہر قدم پر وہ تمہیں مات دے رہی اور تم چپ ہو !" وہ ہاتھ نچا کر شوہر سے کہہ رہی تھی اور وہ ہنس دیا۔

"حد کرتی ہو ! بھلا میرے کونسے اوگن چھپا رکھے ہیں اُس نے ؟ ایک قانونی نکتہ پر پابند ہو کر رہ گیا ہوں۔ چند مہینے صبر کرو سب ٹھیک ہو جائے گا" وہ بیوی کو تسلی دے رہا تھا۔

"کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا ! اُسے تو جیسے اللہ میاں کے ہاں سے پیغام پہنچ گیا ہے کہ ضرور اس بار لڑکا ہی جنے گی۔ اس قدر تسلی اور اطمینان کے ساتھ سارے کاروبار سنبھال لئے ہیں اُس نے کہ شوہر کے مرنے کا غم بھی بھول گئی ہے" صدیقہ نے جواب دیا۔

"خیر اب قدرت کے کام میں تو نہ اُسے دخل ہے نہ ہمیں۔ دیکھتے ہیں پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے" اعجاز نے جواب میں کہا۔

"مگر کار کے متعلق تم نے جواب ہی نہ دیا میں پوچھ رہی تھی۔ کہ تمہاری اجازت کے بغیر وہ مرمت ہو کر کیسے وہاں پہنچ گئی۔ سپرد تم کر کے آئے تھے۔ بیچنے کے لئے تم نے کہا تھا۔ ورکشاپ والوں نے گاڑی مرمت کر کے اُن لوگوں کے حوالے کی تو تمہاری مرضی ہی سے کی ہو گی ؟" وہ خفگی سے نتھنے پھیلائے شوہر کی طرف دیکھ کر بولی۔

"بخدا مجھے خبر ہی نہیں میں تو اب تمہارے منہ سے یہ سب کچھ سُن رہا ہوں۔ ابھی جاکر تحقیقات کرتا ہوں۔ کہ یہ کیونکر ہوا اور ورکشاپ کے مینجر نے مجھے اطلاع کیوں نہ کی؟"

اعجاز نے گویا گلو خلاصی کے لئے بات بنائی۔ مگر صدیقہ بھی تو ننھی سی بچی نہ تھی جو بہلاوے میں آجاتی چمک کر اُس کے اور بھی سر ہو گئی۔

"تم تو مجھے یوں بناتے ہو جیسے میں پاگل ہوں۔ یا ناسمجھ بچی ہوں کہ تمہاری چالبازیوں کو سمجھ نہ سکوں۔ اتنا ہی بھاوج کا پاس ہے تو صاف کہہ دو کہ تم اُس سے خود ہی کچھ بھی لینا نہیں چاہتے۔"

"اب میں یہ بھی تو نہیں کر سکتا کہ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر سڑک پر کھڑا کر دوں۔ میری تسلّی کے لئے قانون کی یہ پابندی فی الحال کافی ہے کہ اگر میں بھی کوئی چیز اپنے قبضہ میں نہیں لے سکتا۔ تو وہ بھی کوئی چیز بیچ کر روپیہ میں منتقل نہیں کرا سکتیں۔ تم ناحق گھبراتی ہو۔ صبر تو کرو۔ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔" وہ بیوی کو تلقین کے لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

"تمہاری ایسی ہی دھیمی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ بھائی نے باپ کے مرنے پر اچھی زمین اچھے اچھے مکان اپنے حصہ میں لے لئے کاٹ چھانٹ کر تمہارے سر منڈھی۔ تم چپکے ہو رہے اور مجھے بھی جھانسہ دیئے رکھا۔ کہ جو کچھ اُن کا ہے وہ بھی اپنا ہی ہے۔ اب موقعہ ملا تو وہ بھی تم نے یوں کھو دیا۔" وہ متواتر شکایت کئے جا رہی تھی۔

"انشاء اللہ سب بہتر ہو جائے گا۔ فکر نہ کرو۔ میں ذرا اُس مینجر کے پاس جاتا ہوں کہ گاڑی کے متعلق اُس نے میری ہدایت پر عمل کیوں نہ کیا؟"

خبر نہیں سچ مچ یا محض بیوی سے جان چھڑانے کے لئے راؤ اعجاز اُٹھ کر باہر چل دیا۔ صدیقہ دیر تک بیٹھی ہوئی یونہی کھولتی رہی۔ اتنے ہی میں کوئی ملنے والی آگئی۔ تو اسے دل کا غبار نکالنے کا اچھا موقع مل گیا۔ ملنے جلنے والی اکثر

عورتوں کو بھی یہ عمدہ شغل اور وقت گزاری کا دلچسپ مشغلہ ہاتھ آیا تھا۔ کہ گھر کے کام سے نپٹتے ہی کبھی راؤ اعجاز کے ہاں آ پہنچتیں تو کبھی آسیہ کے پاس جا بیٹھتیں۔ آسیہ کی عادت زیادہ باتیں بنانے کی نہیں تھی۔ غیبت اور بدگوئی سے اُسے طبعاً نفرت بھی تھی اور یہ بھی خوب معلوم تھا کہ یہ عورتیں لگائی بجھائی کر کے باہمی نفرت اور نفاق کی خلیج کو وسعت دینے کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتیں۔ اس کی دونوں بڑی بچیوں کی نسبت دادی نے صدیقہ کے دونوں لڑکوں سے ٹھہرا دی تھی۔ اور اس کا شوہر اپنی ماں کے فیصلہ پر قائم تھا۔ بزرگوں کے باندھے ہوئے رشتے اس گھرانے میں ہمیشہ فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ آسیہ اسی خیال سے صدیقہ کے ساتھ نباہ رکھنا چاہتی تھی۔ کہ وہ اس کی بچیوں کی ہونے والی خوشدامن تھی لیکن صدیقہ کو اس امر کا ہرگز پاس نہ تھا وہ حریص اور لالچی عورت تھی۔ اُسے مال و دولت اور جائیداد سے بڑھ کر دنیا کی کوئی کشش اپنی طرف کھینچ نہیں سکتی تھی۔ اُسے تو شوہر تک سے محض اس لئے دلچسپی تھی کہ وہ اس کی دولت میں اضافہ کرنے ہاں البتہ اولاد پر وہ ہزار جان سے فدا تھی اور مامتا کے اندھے جوش میں یہی چاہتی تھی دُنیا بھر کی دولت سمیٹ کر اپنی اولاد کی اعلے تعمیر اور روشن مستقبل پر صرف کر ڈالے چاہے وہ دولت جائز ہو یا ناجائز وہ ان لوگوں میں سے تھی جن کا مسلک ہوتا ہے کہ اپنے مفاد کے لئے سب کچھ جائز ہے!

„آؤ حمیدہ آپا! بہت دنوں بعد ادھر کا رُخ کیا؟“

صدیقہ نے مہمان خاتون کا خیر مقدم کیا۔ مگر آواز اور نگاہوں سے طنز ٹپک رہا تھا۔

„بس گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بچوں کو اسکول بھیج کر تمہارے بھائی کا ناشتہ تیار کرنے اور انہیں دفتر بھیجتے میں نو بج جاتے ہیں پھر گھر سمیٹتے

سمیٹتے بارہ ہی کا عمل ہو جاتا ہے یوں لگتا ہے کہ گھر کی کوئی شے ٹھکانے پر نہیں سب کچھ اوندھا کر کے سدھارتے ہیں یہ نیک بخت بچے۔ پھر کھانے کا وقت ہو جاتا ہے جب تک سر پر سوار نہ رہو یہ مامائیں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتیں بس یونہی دن نکل جاتا ہے۔

حمیدہ آپا نے برقعہ اُتارتے اُتارتے ایک ہی سانس میں سارا ٹائم ٹیبل بیان کر دیا۔ اُن کے طرزِ گفتگو اور لہجہ کے تسلسل اور روانی سے ظاہر تھا۔ کہ خاصی باتونی ہیں۔!

"سُنتی ہوں کہ بڑی حویلی کا تو روز کا پھیرا رہتا ہے؟" صدیقہ نے ہنس کر مگر نگاہوں میں طنز بھر کر کہا۔

"لو خاک! میں ایک بار ہی تو گئی ہوں جب سے آسیہ بھابی کے امّید سے ہونے کی افواہ سُنی۔" وہ کہنے لگی۔

"افواہ؟" صدیقہ نے یکدم بھویں سکیڑ کر پوچھا۔

"ہاں بھئی! افواہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ جب تک کسی خبر کی تصدیق نہ ہو۔" حمیدہ ہنس کر کہنے لگی۔

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ مگر یہ افواہ بھی سُنی! کہ وہاں تو لڑکا پیدا ہونے کا یقینی طور پر گویا پیغام آچکا ہے؟" صدیقہ طنز بھری آواز میں کہنے لگی۔

"نہیں یہ میں نے نہیں سُنا۔ تم سے کس نے کہا۔؟" حمیدہ کہنے لگی۔

"مہترانی اور میراثن شبو وغیرہ تو خیر کہا ہی کرتی تھیں مگر افضل کی لڑکیاں کل اسکول سے آئیں تو کہہ رہی تھیں۔ کہ عائشہ عامرہ کے ہاں بھیّا آنے والا ہے! افضل کو جانتی ہو نا میرا خالہ زاد ہے؟

صدیقہ بظاہر ہنس ہنس کر بتا رہی تھی مگر یہ لفظ ہی اس کا دل جلا دینے کو کافی تھے۔

"ہاں گھر میں ذکر سُن کر بچیوں نے کہہ دیا ہوگا۔ ایک طرح اُن کے لئے

تو خدا نے نا اُمیدی میں اُمید کا سہارا پیدا کر دیا" حمیدہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر کس قدر حماقت ہے بچیوں کے سامنے ایسا ذکر کرنا! اور دیکھ لینا جو کبھی لڑکا ہوا اس دفعہ بھی خدا نے چاہا تو لڑکی ہی ہو گی۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گی وہ بدنیت عورت!" صدیقہ نے انتہائی بغض کے لہجہ میں کہا۔

"ہاں۔ جیسی نیت ویسی مراد!" تو مشہور مقولہ ہے"

حمیدہ نے کہا۔ اور اس کے بعد صدیقہ نے بہت کچھ زہر اگلا۔ جلی کٹی باتیں کرتی رہی۔ ڈرائیور کے چلے جانے کا قصہ سنایا اور اسی ضمن میں بشیر کے متعلق بہت کچھ نامناسب خیالات کا اظہار کیا۔

"ہائے توبہ کرو صدیقہ بھابی! وہ تو آسیہ بھابی کا دودھ شریک بھائی ہے۔ خود نیاز بھائی اُس کی بے حد عزت کرتے اور اُسے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے تھے" حمیدہ نے اس کے خیال کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"واہ! دیکھے ہوتے ہیں ایسے بھائی! تم دیکھ آئی ہو گی آسیہ بھابی کو بشیر کی ماں کا دُودھ پیتے!"

صدیقہ عجب انداز سے ہاتھ نچا کر بولی۔ تو حمیدہ ہنس پڑی۔

"اللہ بہتر جانتا ہے بھئی ہمیں کیا خبر!"

وہ ہنس کر بولی۔ اور اسی طرح دیر تک بیٹھی ہوئی دونوں عورتیں باتیں کرتی رہیں۔ اتنے ہی میں شبو میراثن آ پہنچی۔ وہ صدیقہ کی معلومات کا خاص ذریعہ تھی۔ اسی لیئے صدیقہ انتہائی بددماغ اور مغرور ہونے کے باوجود ان دنوں اس پر خاص طور پر مہربان تھی۔

"آؤ شبو! وہ پیڑھی لے آؤ بیٹھنے کے لیئے"

مالکہ نے نہایت مشفقانہ لہجہ میں آؤ بھگت کی تو میراثن نے ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔

"کہاں سے پھرتی پھراتی آ رہی ہو۔ کبھی نظر ہی نہیں آتی ہو؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"بس یہیں آپ کے قدموں میں جہاں بھی ہوتی ہوں آپ صاحبوں کی جان و مال کے لئے دعا گو رہتی ہوں۔ اپنا تو اور ٹھکانہ ہی کہاں ہے آپ کے درِ دولت کے سوا۔" میراثن نے چرب زبانی سے کہا۔

"دیکھا کتنی چالاک ہے یہ اللہ ماری میراثن، کبھی آ کر نہیں جھانکتی اور درِ دولت پر ٹھکانہ بتا رہی ہے!" حمیدہ نے ہنس کر کہا۔

"میری بانو کی گالیاں نہیں یہ گھی کی نالیاں ہیں! میرے سر آنکھوں پر! جگ جگ جیئیں میرے شہزادے! اللہ سہروں کا دن کرے!" شبو بلائیں لیتے ہوئے بولی۔

"میں بتاؤں؟ یہ آجکل بڑی حویلی کے چکر میں ہے۔ شرط رہی کہ اس وقت بھی وہیں سے آئی ہے!"

صدیقہ کہنے لگی تو شبو ہنس پڑی۔

"صدیقہ گئی اس روشن ضمیری کے! سچ سچ بانو آپ نے ٹھیک کہا وہیں سے آئی ہوں میں!"

شبو نے بناوٹی حیرت اپنے چہرے پر پیدا کرتے ہوئے کہا۔ جیسے صدیقہ کی غیب دانی کی قائل ہو گئی ہو۔!

"اچھا! خیریت سے ہے نا آسیہ بھابی؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"اللہ کا فضل ہے!" شبو نے کچھ عجب انداز سے جواب دیا۔

"اور کوئی تازہ خبر؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"ابھی تک تو وہی پرانی خبر ہے۔ کہ بانو خیر سے دو جان سے ہیں۔ نئی خبر کا انتظار کیجئے!" وہ ہنس کر کہنے لگی۔

"کب تک سناؤ گی نئی خبر؟" صدیقہ نے بھی ہنس کر پوچھا۔

"یہی کوئی تین مہینے تک!" شبو نے کہا۔

"ہاں یہی کہہ رہی تھیں حنیفہ پھپھو اُس دن کہ نکلتی سردیوں میں بچہ ہو گا۔" حمیدہ کہنے لگی۔

"اونہہ! حنیفہ پھپھو جیسی کٹنی عورت میں نے آج تک دیکھی نہ سُنی! توبہ ہے کتنی خوشامد کرتی ہے دوزخن نہ ہو تو!" صدیقہ نفرت سے ناک بھوں چڑھا کر بولی۔

"کیا کرے بیچاری!" حمیدہ نے معنی خیز انداز سے کہا۔

"ہاں بیگم! اللہ دشمن کو بھی یوں بے خانماں اور بے سہارا نہ کرے جیسی یہ بیچاری حنیفہ بیگم ہیں۔"

شبو تک نے ترس کھا کر کہا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ آسیہ اپنی اس بے سہارا اور بے خانماں پھوپھی ساس کے ساتھ ماں سے بڑھ کر ادب و احترام محبت اور حُسنِ سلوک روا رکھتی تھی وہ سارے گھر کی مالک و مختار تھی سیاہ وسفید کی مالک تھی مگر باتیں بنانے والے سب کچھ جانتے ہوئے بھی حقیقت سے انحراف کرتے ہوئے جو منہ میں آئے کہہ گزرتے تھے۔

"کیا کر رہی تھیں آسیہ بھابی؟" حمیدہ نے مزید ٹوہ لینے کے لئے پوچھا۔

"بچگانے سوئٹر بُن رہی تھیں اصل خیر سے" شبو نے کہا۔

"ہاں کام کاج تو سارا پھپھو حنیفہ سنبھالے ہوئے ہے وہ بیٹھے بیٹھے بُنائی کا کام کرتی رہتی ہیں، فرصت کے ساتھ ہمیں تو گھر کی دوڑ بھاگ میں وقت ہی نہیں ملتا کہ ایک ہی سوئٹر بُن سکیں پورے سیزن میں!"

صدیقہ جل کر بولی۔ حمیدہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ہاں یہی میرا حال ہے مگر میں تو جب بھی کوئی آجائے تو باتوں کے ساتھ ساتھ بنائی بھی کرتی جاتی ہوں۔ اور اتنے ہی میں تین چار سوئٹر جاڑے میں بنا ہی لیتی ہوں۔ تمہارے میاں اور بچوں کو دیکھا ہے کہ واقعی ہمیشہ بازار کی

سوئیٹر ہی پہنتے ہیں۔" حمیدہ نے ہنس کر کہا۔

"مگر اللہ رکھے ہماری بڑی بانو تو خیر سے بنائی کا بہت کام کرتی ہیں۔ آنے والے بچے کے لئے سوئیٹر۔ جرابیں۔ ٹوپیاں۔ شالیں کیا کیا بُن رہی ہیں کہ واہ وا! سبحان اللہ! ایک سے ایک نیا رنگ اور نیا ڈیزائن کہ کمال کر دیا ہے بس!" شبو ہاتھوں سے بھاؤ بتاتے اور ہاتھ نچاتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"نکلتی سردیوں تو کہیں بچہ ہو گا تو کیا گرمیوں میں اتنے سارے سوئیٹر پہنے گا؟"

صدیقہ نے جل کر کہا تو حمیدہ اُس کے دلی حسد اور جلاپے کو اُس کے لہجہ میں محسوس کر کے بے ساختہ ہنس دی۔ ان سب لوگوں کی ہمدردیاں فی الحقیقت آسیہ بیگم سے وابستہ تھیں کیونکہ اُس نیک اور خوش اخلاق خاتون کا حُسنِ سلوک اور خلوص سب کو متاثر کئے ہوئے تھا لیکن صدیقہ کے ساتھ ظاہر داری رکھنا بھی ضروری تھا۔ اور گھریلو سیاستوں کے پیشِ نظر مصلحت یہی تھی۔ کہ دورُخی، پالیسی اختیار کی جائے۔

"بس حضور! بادشاہ لوگوں کی باتیں!"

میراثن ہنس کر کہنے لگی۔ اور ساتھ ہی ایک معنی خیز چشمک کے ساتھ حمیدہ کی طرف دیکھا۔

"امیرانہ ٹھاٹھ دکھانے کے چونچلے کہو۔ ورنہ بادشاہت تو اب ختم ہو چکی۔" صدیقہ جل کر بولی۔

"اگر ولی عہد" کی ماں بن گئی تو بادشاہت پھر اُسی کے ہاتھ ہو گی اس لئے ابھی تو یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ ختم!"

حمیدہ نے کہا تو صدیقہ چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے اندازہ کر رہی ہو کہ اُس نے یہ لفظ طنزیہ کہے ہیں یا سنجیدگی سے اور جب وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی تو صدیقہ کو تسکین ہو گئی کہ اُس نے محض مضحکہ سے کہا ہے۔

"یہ گٹھڑی میں کیا لائی ہو۔؟" حمیدہ نے بات کا رُخ پلٹنے کی غرض سے کہا۔

"حضور میرے وہاں بیٹھے ہی زمین سے گڑ کی بوریاں آئیں۔ بچوں کے لئے کچھ مصالحوں اور مغزیات والا گڑ بھی تھا۔ بانو نے اُسی میں سے کچھ مجھے بھی دے دیا۔ کہ لو بچوں کے واسطے لیتی جاؤ۔" شبو نے بتایا۔

"واہ وا! خوب کھانا سردیاں بھر۔ خاصہ پانچ سیر تو ہوگا؟" حمیدہ نے گٹھڑی کو نظروں ہی نظروں میں آنکتے ہوئے کہا۔

"ہاں اُن کے کونسا میکے سے آتا ہے۔ انہوں نے تو عمر بھر شوہر کا مال یونہی لٹایا دوسروں سے تعریف اور خوشامد وصول کرنے کے لئے۔ وہی جیسے کسی نے کہا تھا کہ "حلوائی کی دکان اور دادا جی کا فاتحہ" صدیقہ نے مارے حسد کے جل بھن کر کہا۔

"ہمیں بھی تو اللہ نے انہیں آپ کے گھروں کے نمک پر پالنا ہے نا حضور! اور کہاں جائیں ہم غریب اور آپ کے دُعا گو؟ دانے دانے پر مہر ہے۔ جو دانہ جس کی قسمت میں لکھا ہو ہر صورت اُس تک پہنچتا ہے اور مسلمان کا تو ایمان ہے کہ ؏

سینکڑوں کوس سے رزق اُڑ کے چلا آتا ہے
پَر لگا دیتا ہے رزاق میرا دانے کو!

شبو نے یہ شعر ترنم کے ساتھ گا کر ادا کیا۔ حمیدہ اُس کی گفتگو سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

"سچ کہتی ہو! سبحان اللہ! کس کا شعر ہے یہ؟" وہ پوچھنے لگی۔

"حضور یہ احمد حسین خان کا شعر ہے۔ بڑے اُونچے درجہ کے شاعر ہوئے ہیں۔ مجھے تو اماں نے اُن کی کئی غزلیں ازبر کرا رکھی تھیں وہ اُن کے گھر کی پروردہ تھی۔ کبھی سناؤں گی کسی موقعہ پر!"

شبو کہہ رہی تھی مگر صدیقہ نہایت کبیدہ خاطر ہو گئی، اب اُسے کسی گفتگو سے دلچسپی نہ رہی۔ اُس کے دل و دماغ میں تو جیسے ہلچل سی مچ گئی۔ جن زمینوں کی دولت پر وہ نظریں جمائے بیٹھی تھی اُس کی پیداوار پھر اُس کی مدمقابل کے گھر میں چلی آرہی تھی اور وہ یونہی منہ دیکھتی رہ گئی —— اور جو کہیں وہ لیس ہنری دیکھتی گئی اور آسیہ کے لڑکا ہو گیا۔ راؤ نیاز احمد کی جائیداد کا وارث! اُس کے دماغ میں جیسے دھماکا سا ہوا اور وہ تاؤ کھا کر یکدم اُٹھ کھڑی ہوئی اور اندر چلی۔ حمیدہ اور میراثن شبو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں!

(۷)

سرما کے تین مہینے ایک ایک دن گنتے گزر گئے۔ فروری کے آخری ایام تھے مگر سردی اب بھی کافی تھی۔ پت جھڑ کا موسم تھا اُداس اور بے رونق۔ سرد ہوائیں خزاں زدہ درختوں کی ننگی شاخوں کے جھنجھوڑتی اور فضا میں سسکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھیں اور اُس دن تو خاصہ طوفان بادوباراں تھا جس دن پھوپھی حنیفہ پَو پھٹتے ہی راؤ اعجاز احمد کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ اپنی تیز طبیعت اور کنجوسی کی حد تک پہنچی ہوئی کفایت شعاری کی عادت سے وہ غریب رشتہ داروں سے پرے رہنے میں عافیت سمجھتی تھی۔

"ابو! دادی حنیفہ آئی ہیں دروازہ پر کھڑی آپ کو بُلا رہی ہیں۔"

اعجاز کا سب سے بڑا لڑکا ایاز مسجد سے نماز پڑھ کر واپس آیا تو حنیفہ کو اس نے ڈیوڑھی میں کھڑے پایا۔ ایاز اپنے ایک شریف النفس ہم جماعت کی صحبت کے فیض سے پانچ وقت کی نماز کا پابند اور اچھے اخلاق کا مجسمہ تھا۔

"اندر بلا لو انہیں دروازہ پر کیوں کھڑی ہیں۔" اعجاز نے بستر میں اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو بہت کہا وہ کہتی ہیں تائی اماں بیمار ہیں انھیں واپس جانے

کی جلدی ہے۔" ایاز نے دھیمے لہجہ میں کہا۔

"ایسی ہی جلدی تھی تو آئیں کیوں؟" اعجاز نے غصہ سے کہا۔

"کسی دائی وائی کے ہاں جاتی بھلا بھاوج کی ایسی بیماری میں یہ کیا علاج کریں گے اُس کا!" صدیقہ پیچ وتاب کھاکر بولی۔

"امی وہ آ ہی گئی ہیں تو اُن کی بات تو سُننا چاہیئے نا!"

ایاز نے جیسے عاجز آکر کہا۔ وہ پندرہ سالہ لڑکا دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اور خاصہ سمجھدار تھا تایا کے ہاں اپنی آیندہ وابستگی کا بھی اُسے علم تھا اور اس کے دل میں اُن لوگوں کے ہمدردی کے جذبات جاگ رہے تھے۔

"تو بلاؤ نا انھیں یہاں! تمہارے ابو بستر سے نکل کر انھیں ملنے ڈیوڑھی میں جائیں؟" ماں کہنے لگی۔

"وہ بھی تو آخر اس طوفان میں یہاں تک آئی ہیں!" ایاز نے ہنس کر کہا۔

"یہاں تک آئی ہیں تو دو قدم اور آگے جائیں۔ جاؤ بلاؤ انہیں!"

باپ نے بھی خشمگیں آواز میں حکم دیا۔ تو ایاز چپکے سے سر جھکائے چلا گیا۔ اور بڑھیا کو جو سر سے پاؤں تک لرز رہی تھی اپنے بازوؤں میں تھام کر لے آیا۔

"کیا ہوا پھپھو؟ خیریت تو ہے آپ اس وقت اس موسم میں آئیں؟"
اعجاز نے یکدم پوچھا۔

"ادھر بیٹھ جایئے دادی جان!"

ایاز اُسے ایک کرسی کی طرف لیجاتے ہوئے کہنے لگا اور وہ بیٹھتے ہوئے سردی سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا کرتی بھیا! تمہاری بھاوج کل دوپہر سے تکلیف میں ہے۔ رحیمن کو کئی دفعہ ناجو دائی کے ہاں بھیجا وہ بدبخت بیمار پڑی ہے۔ شہر میں کسی لیڈی ڈاکٹر

سے بات طے کر رکھی تھی یہ اُس کا ٹیلیفون نمبر ہے جیسے بھی ہو اُسے اطلاع دو تاکہ فوراً چلی آئے۔" پھوپھی خلیفہ نے ایک پرچی اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لائیے میں ٹیلیفون کرتا ہوں جاکر!" ایاز نے کاغذ دادی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا اور ماں کے تیور دیکھے بغیر جلدی سے چل دیا۔

"تو کل دوپہر ہی کیوں نہ کچھ انتظام کر لیا؟" اعجاز نے پوچھا۔

"بہو نے مجھے بتایا ہی نہیں رات جو تکلیف بڑھی تو ناجو کو بلانے کو کہا" خلیفہ نے ویسے ہی کانپتے ہوئے کہا۔

"تو آپ اس طوفان میں خود کیوں آئیں رحیمن کو یا چوکیدار کو بھیج دیا ہوتا!" اعجاز اُس کی حالت دیکھ کر کچھ متاثر ہوا۔

"بھیا! میں نے سوچا ملازم کہیں اس وقت پیغام پہنچانے میں دیر نہ کر دیں۔ بہو کی حالت خراب ہے۔"

بڑھیا نے بھرآئی آواز میں کہا۔ صدیقہ غضبناک نظروں سے اس کی طرف دیکھتی جا رہی تھی، اتنے ہی میں ایاز واپس آگیا۔

"دادی جان وہ کہہ رہی ہیں کہ بس پندرہ منٹ میں پہنچ جائیں گی آیئے میں آپ کو پہنچا آؤں۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ خلیفہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم کہاں جاؤ گے؟ ان کے ساتھ وہاں سے کوئی نہیں آیا تھا؟" صدیقہ جیسے غم و غصہ کو مشکل سے دبا کر بولی۔

"نہیں بیٹی میں خود ہی چلی آئی۔ اور اب بھی چلی جاؤں گی بیٹے تم تکلیف نہ کرو سردی بہت ہے۔ اللہ تمہاری ہزاری عمر کرے۔" دادی نے ایاز کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ابھی اسکول بھی جانا ہے دادی جان! مجھے کونسا بستر میں گھس کر بیٹھ رہنا ہے

کوئی بات نہیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں!" وہ پھر ماں کی طرف دیکھے بغیر ضعیفہ کے ساتھ چلا۔

"ایسا ہی ہے تو کریموں کو بھیج دو خود مت جاؤ تمہیں اسکول سے دیر ہو جائے گی۔" باپ نے کہا۔

"مگر وہ آتے ہوئے راستہ نہ بھول گئیں تو جاتے ہوئے کہاں بھٹک جائینگی، کہ تم لوگ ان کے لئے ایسے پریشان ہو گئے ——!"

اب تو صدیقہ بے صبر ہو کر چیخی۔ ناچار ایاز بیچارے نے کریموں کو بڑھیا کے ساتھ بھیجا اور خود آکر اسکول جانے کے لئے تیار ہونے لگا اُسے اپنے والدین کا یہ طرزِ عمل اور تایا کی بیوہ یتیم بچیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ بے حد ناپسند تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ صرف کڑھ کر رہ جاتا۔

صدیقہ کا مزاج صبح ہی صبح برہم ہو گیا۔ بڑبڑاتے اور بچوں کو کوسنے دیتے اُس نے ناشتہ تیار کرایا اور بچوں کو اسکول بھیجا۔ اعجاز گھر میں اُس کے غصہ و غضب کا تختۂ مشق بننے کو رہ گیا۔ وہ جلی کٹی سناتی رہی وہ سُنتا رہا۔ اُسے خود بھی اس غیر متوقع حادثہ کا صدمہ تھا مگر وہ مردِ تھا حوصلہ اور صبر کے ساتھ آخری مرحلہ کا منتظر رہا۔ اس کے لئے اب بھی یہ موہوم اُمید وجہ تسلی تھی کہ اس کی بیوہ بھاوج کے ہاں اس مرتبہ بھی حسبِ سابق لڑکی ہو گی۔ اور اور آج تو وہ آخری مرحلہ آن ہی پہنچا۔ وہ عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا ایک تکلیف دہ انتظار اُس کے لئے عجیب خلجان بنا ہوا تھا۔ وہ باہر جانے کو تیار تھا کہ بڑی حویلی سے رحیمن آئی۔

"کیا بات ہے رحیمن؛ خیریت تو ہے؟"

اعجاز نے بے صبری سے ملازمہ کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے پوچھا صدیقہ کی پُر اشتیاق نظریں بھی خاموشی سے اس کے منہ کی طرف اٹھیں۔

"جی ہاں صاحب! اللہ پاک خیریت ہی رکھے —— مجھے بڑی بیگم نے

بھیجا ہے آپ کو بلانے کے لئے۔ ڈاکٹرنی آئی ہے وہ کہتی ہے اس سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ بانو کو ہسپتال لے جانا پڑے گا۔ بچہ اپریشن سے ہو گا!“ رحیمن نے جواب دیا۔ تو میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”تو ان کو کیوں بلایا ہے؟ یہ جا کر کیا کریں؟“

صدیقہ نے پوچھا۔ اُس کی برہم صورت سے ملازمہ سہم سی گئی۔

”حضور! اب مجھے تو انہوں نے جیسے کہا ویسے ہی میں نے عرض کر دیا“ ملازمہ بولی۔

”نا بھائی! ہم لوگ اس معاملہ میں دخل نہیں دیتے۔ کوئی اُونچ نیچ ہو جائے تو مفت میں باتیں سُنیں۔ میں تو تمہیں نہیں جانے دوں گی“ صدیقہ کہنے لگی۔

”وہ لیڈی ڈاکٹر جو آئی ہیں وہ اپنی ذمہ داری سے سارا انتظام کریں۔ اور مریضہ کو ہسپتال لے جائیں پھوپھی سے کہہ دینا کہ میں اس معاملہ میں واقعی دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ جب بھابی فارغ ہو کر گھر آجائیں گی تو انشاء اللہ ان کی خبر خبرگیری کے لئے سب سے پہلے میں حاضر ہوں گا۔ ہم لوگ یہاں الگ بیٹھے ہی ان کے لئے دعا گو ہیں“ اعجاز نے بڑی نرمی کے ساتھ رحیمن کو سمجھایا۔

”جی حضور! بہت اچھا“

رحیمن بھی جیسے کچھ سمجھتے ہوئے مطمئن انداز سے سر ہلا کر بولی۔ اور سلام کر کے رخصت ہوئی۔ جب گھر پہنچی تو دروازہ پر ہسپتال کی ایمبولنس گاڑی کھڑی تھی۔ مریضہ کو اس میں بٹھایا جا چکا تھا۔ پھوپھی حنیفہ اور لیڈی ڈاکٹر کے علاوہ بشیر بھی ساتھ جانے کو تیار تھا۔ وہ آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھ گیا اور گاڑی چل دی۔ بچیاں رو رہی تھیں مگر انہیں تسلی دینے کے لئے گھر میں سوائے رحیمن کے کوئی نہ تھا۔

ابنیار اک

”صاحبزادی! تم چھوٹی بہنوں کو بہلاؤ۔ تمہیں روتے دیکھ کر وہ اور بھی بے حال ہو رہی ہیں۔ تینوں مل کر اللہ سے دعا کرو۔ کہ امی پیارا سا بھیا لے کر گھر

آئیں تمہارے لئے ا ہوں ؛

وہ باری باری بچیوں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی گاڑی کو دیکھ کر محلہ کی کئی عورتیں خیریت دریافت کرنے چلی آ رہی تھیں ۔ رحیمن ہر ایک کو تپاک سے بٹھاتی حال بتاتی اور دُعا کرنے کے لئے التجا کرتی ۔ صاحب اولاد عورتوں کا دل نرم و نازک ہوتا ہے ۔ وہ بڑے خلوص سے آسیہ کی زندگی اور ہری بھری گود کے لئے دُعا کرتیں اور بچیوں کو دلاسا دیتیں ۔

” ان کی چچی اس موقعہ پر بھی نہ آئیں ؟ “

ایک نے پوچھا تو رحیمن نے صبح کا واقعہ سنا دیا ۔

” خدا بچائے ! وہ میاں بیوی تو جیسے کباب ہی ہو گئے ! “

” وہ بیچارے بشیر میاں نہ آ جاتے تو گاڑی کیسے آتی اور بانو کو ہسپتال کیسے لیجایا جاتا ؛ “ رحیمن کہنے لگی ۔

” دُعا کرو آسیہ بھابی کے ہاں اللہ زندگی والا بیٹا عطا کرے پھر دیکھنا ان کا حال ! “ دوسری کہنے لگی ۔

” اے بوا رحیمن ! جیسے ہی اللہ کے فضل سے خوشخبری پہنچے ایک دم سے ہمیں اطلاع کرنا خدا کی قسم تیرے منہ میں گھی شکر بھر دوں گی ! “ ایک ہمسائی بولی ۔

” لو میں تو مٹھائی لے کر بتانے آؤں گی اور بدھائی لوں گی ! “ رحیمن ہنس کر بولی ۔

” اری ! تیل چوائیں گے تیرے آنے پر ! خدا کرے تو جلدی سے آئے بس دُعا کر رہے ہیں ہم تو ! “

دوسری ہمسائی کہنے لگی ۔ اور بچیاں عورتوں کی ان مبہم باتوں پر غور کرتے ہوئے بہل گئیں ۔

” بوا ہم آج اسکول نہ جائیں گے —————— کیوں باجی ؟ “

عائشہ پوچھنے لگی۔

"ہاں آج تو بھیا آرہا ہے نا ____ ! ننھا سا بھیا!" عامرہ بولی۔

"اسکول تو ضرور جانا ہے ننھی! بھلا اسکول سے ناغہ کرنے کا کیا فائدہ!" عقیقہ نے عامرہ کو آغوش میں لے کر کہا۔

"مگر ____ "

عائشہ کچھ کہنے کو تھی کہ رحیمن نے پیار سے اُس کے گھنگھریالے بالوں کو سلجھاتے ہوئے میری منّی بیٹی جب پڑھ کر آئے گی تو سب موٹر میں بیٹھ کر بھیا کو دیکھنے! ہاں منّے سے بھیّا راجہ کو!"

عائشہ کی بادامی آنکھوں میں جیسے پریاں سی ناچنے لگیں۔ اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ مسکراہٹ سے کھل گئے۔ وہ اسکول جانے پر رضامند ہو گئی۔ اپنا باوا اس نے رحیمن کی گود میں تھما دیا جو اس وقت گہرے سبز رنگ کا اونی سیٹ پہنے ہوئے تھا۔ یہ عائشہ کی مہربانی اور عنایت کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ کہ جس پر خوش ہوتی اُسے باوا کھلانے کو دے دیتی ___!

لڑکیاں اسکول چلی گئیں۔ ہمسائیاں بھی رخصت ہوئیں۔ بوا رحیمن باورچی خانہ میں بھی مصروف تھی اور بانو کی سلامتی اور مراد مندی کی دعائیں کر رہی تھی۔ ان سب کا خلوص اور دلی ہمدردیاں، خود آسیہ کے حسنِ سلوک اور رواداری سے پیدا ہوئی تھیں۔ اُس کی شیریں زبانی اور حلیمی نے سب ملنے جلنے والوں کے دلوں کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔

بچیاں تین بجے اسکول سے واپس آئیں لیکن اُس وقت تک شہر سے کوئی خبر نہ آئی تھی۔ عقیقہ ماں کے لئے پریشان ہو رہی تھی اُس نے عصر کی نماز پڑھی اور نہایت عاجزی سے دعا مانگی۔ اتنے ہی میں اُسے صحن میں عائشہ اور عامرہ کے پر مسرت نعروں کی آواز سنائی دی۔

"آپا جی ماموں آ گئے —— ماموں آ گئے۔!"

وہ دونوں یک آواز ہو کر چلائیں۔ عتیقہ جائے نماز تہ کرتے ہوئے جلدی سے بالکنی میں آئی بشیر دونوں بچیوں کو دونوں پہلوؤں میں لئے پیار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"چلو باجی سے کہیں تیار ہو جائیں تمہیں ننھا سا بھائی دکھائیں! ارے بُوا کہاں گئیں وہاں ننھے راؤ صاحب پکار رہے ہیں کہ بھوک لگی ہے جلدی کھانا لے کر آؤ!"

"اے صدقہ ہو جاؤں! اس منہ میں گھی شکر! ہمیں ابھی لے چلیے —— پر ٹھہریئے ذرا" وہ جلدی سے پلٹ کر باورچی خانہ میں گئی اور ایک پلیٹ میں شرینی لئے ہوئے باہر آئی۔

"یہ منہ میٹھا کیجیے بھیا!"

اور بشیر نے بڑی خوشی سے منہ میٹھا کیا قلاقند کا بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں بھر لیا۔ اور بچیوں کے منہ میں بھی حلق تک مٹھائی ٹھونس دی۔ عتیقہ کو بالکنی میں ششدر سی کھڑی دیکھ کر ماموں نے پکارا۔

"ارے باجی عتیقہ! نیچے آؤ مگر منہ میٹھا کرانے کو ڈھیر ساری مٹھائی لیتی آؤ، بھتیا آیا ہے کچھ مذاق تو نہیں ہے۔"

اور اتنے ہی میں نور محمد ڈرائیور ایک بڑا سا ٹوکرا لئے صحن میں آیا کیونکہ آج زنانہ مکان میں پردہ نہیں تھا بالو گھر میں نہیں تھیں اور بچیاں اُس سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔

"بوا جاؤ محلہ میں شرینی تقسیم کرو اور راؤ نیاز احمد کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی خبر سناؤ —— اور وہاں کیا صلاح ہے تمہاری اعجاز کے ہاں شرینی بھیجی جائے یا نہیں؟

بشیر کہہ رہا تھا۔ کہ اتنے ہی میں اعجاز کا بڑا بیٹا ایاز گھر میں داخل ہوا۔ وہ

اسکول ہی سے اس طرف چلا آیا تھا۔ اس نے بشیر کو نہایت مودبانہ انداز سے سلام کر کے پوچھا۔

"تائی اماں کیسی ہیں ماموں جان؟"

"بالکل ٹھیک ہیں بیٹے! تمہیں مبارک ہو اللہ نے تمہارے تایا کا نام دنیا میں باقی رکھا ایک ننھا سا بھائی آیا ہے تمہارے ہاں!" بشیر نے ایاز کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کہاں ہے؟ دکھائیں مجھے!"

ایاز نے یکدم وفورِ شوق سے سُرخ ہوتا ہوا چہرہ بشیر کی طرف پھیر کر پوچھا۔

"تمہاری تائی اماں کو صبح ہسپتال لے گئے تھے وہیں ہے تمہارا ننھا بھیا! چلو نا ہمارے ساتھ چل کر دیکھ آؤ۔" بشیر نے بچے کا اشتیاق دیکھ کر کہا۔

"امی اجازت نہ دیں گی شاید!" وہ مرجھا کر کہنے لگا۔

"پوچھ تو آؤ شاید اجازت دے ہی دیں۔ ہم تمہارا انتظار کر کے روانہ ہوں گے۔"

بشیر نے کہا تو ایاز اُداسی سے گردن جھکا کر واپس جاتے ہوئے کہنے لگا۔

"امید تو نہیں جانے دیں!"

ادھر رحیمن بوا نے ایک طشت میں شیرینی بھر کر اُوپر سے رنگدار جالی کا رومال ڈالا اور ملازم کے ہاتھ چھوٹے راؤ کے ہاں بھیجا۔

"گیارہ روپے سے کم نہ لینا چھوٹے راؤ سے! اور جو کچھ ملے مجھے لا کر دینا۔ نوید کی ساری رقم جمع کر کے بانٹ لیں گے ہم تم! سُنا۔؟"

اور رحیمن بوا خود بڑا سا طشت سر پر رکھے محلہ میں شیرینی تقسیم کرنے نکلی۔

واپس آکر کھانا دسترخوان پر لگایا۔ اور کھانے سے فارغ ہو کر سب ہسپتال جانے کو تیار ہوئے۔ روانگی تک بیچارا ایاز نہ آیا تو بشیر نے سوچ لیا۔ کہ اُسے اجازت نہ ملی ہوگی۔ وہ سب کار میں بیٹھ چکے تھے مگر رحیمن بوا مکان بند کرنے کے بعد چوکیدار کو دروازہ پر موجود رہنے کی تاکید کر رہی تھی۔

”ارے چلو آبھی چکو رحیمن بوا!“ بشیر نے پکارا۔

”آگئی حضور!“ وہ اپنی شال سمیٹتے ہوئے دوڑی۔

”کیا نوید کی رقم گن رہی تھیں یا حصہ بخرا بانٹ رہی تھیں۔ بہت دیر کر دی تم نے۔!“

”جی نہیں صاحب وہ تو آکر بانٹی جائے گی سب۔ جمع ہے میرے پاس اکیس روپے ننھے راؤ صاحب کے چچا نے شرینی لیجانے والے چھوکرے کو دئے۔ اور کہلوایا ہے کہ وہ بچے کو دیکھنے خود آئیں گے بیگم اور بچوں کے ساتھ!“ رحیمن بوا حیران سی ہو کر بتا رہی تھی۔

”اچھا! بہت خوب!“

بشیر نے بھی حیرت کے لہجہ میں کہا اور کار چل دی۔

(۸)

راؤ نیاز احمد مرحوم کی بیگم بچے کو لے کر گھر آئی تو اُس کے بھائی بشیر نے صدقہ، خیرات اور خوشی کے اظہار میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ بعض ملنے والوں نے اعتراض کیا کہ یہ خوشی بچے کی سالگرہ پر ہوتی تو اچھا تھا ابھی تو باپ کی برسی بھی نہیں ہوئی۔ مگر بشیر نے ایک نہ سُنی۔

”اس بچے نے باپ کو زندگی بخشی ہے اس کے دم سے باپ کا نام دُنیا میں باقی رہے گا۔ اسی بات کی تو ساری خوشی ہے۔!“

بشیر نے ہر اعتراض کے جواب میں یہی کہا۔ اور ادھر خبر نہیں کیا معجزہ ظہور میں آیا کہ صدیقہ اور اعجاز نے اپنی عدم تعاون کی پالیسی یکسر بدل دی۔ اور خوشی میں برابر کے شریک ہوئے۔ صدیقہ کو ہر کام میں خوشی خوشی حصّہ لیتے اور چہک چہک کر باتیں کرتے دیکھ کر سب ملنے والیاں جو اُس کے منہ سے جلی کٹی باتیں سُن چکی تھیں حیران ہوئیں اور قسم قسم کے شکوک ظاہر کرتیں انہیں اس کینہ پرور عورت اور اس کے خود غرض اور حریص شوہر کی نیت پر شبہ تھا۔ اُن میں سے بعض نے تو آسیہ کو صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ کہ وہ ہرگز ان لوگوں پر اعتماد نہ کرے اور محتاط رہے۔ جہاں تک ہو سکے بچے کو ان سے

دُور رکھے۔ لیکن آسیہ ایک صاف باطن اور نیک دل خاتون تھی، وہ ایسی بُرائی کا تصوّر ہی دل میں نہیں لا سکتی تھی۔ اور ظاہر و باطن کا فرق جانچنے کی اہلیت نہ رکھتی تھی۔

"جب وہ میرے ساتھ خلوص ظاہر کرتے ہیں تو میں کیسے اُن کی نیّت پر شبہ کر سکتی ہوں۔"

آسیہ بس اتنا ہی کہہ کر رہ جاتی۔ لیکن پھپھو حنیفہ تو جیسے اس بچے کا سایہ بن کر رہ گئی ایک لمحہ بھر کے لیئے بھی اس سے غافل نہ ہوتی۔ اپنے ہاتھ سے اُسے دُودھ پلانے کے لئے ماں کی گود میں دیتی۔ اور جب ماں کے دُودھ کی کمی کے باعث لیڈی ڈاکٹر کی تجویز سے اُوپر کا دُودھ شروع کر دیا گیا تو تو بھی اپنی نگرانی میں سب چیزیں صاف کراتی۔ دُودھ بناتی اور خود اُسے پلاتی۔ خصوصاً جس دن صدیقہ گھر میں آتی حنیفہ بچے کو آسیہ کے بھروسے بھی نہیں چھوڑتی تھی۔ سارا دن اسے گود میں لئے اُس کے جھُولے سے لگی بیٹھی رہتی۔ کوئی اسے گود میں لینا چاہے تو کوئی نہ کوئی عذر کر کے ٹال دیتی اور دینے سے صاف انکار کر دیتی لیکن آسیہ یوُں نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کی طبیعت میں لحاظ بدرجہ اتم تھا۔ جیسے خود نیک نیت اور صاف باطن تھی ویسے ہی دوسروں کو سمجھتی تھی۔ لاکھ اُسے مِلنے جُلنے والے ہمدرد سمجھاتے تھے کہ فی زمانہ زندگی اور اخلاق کی یہ قدریں محض انسانی کمزوریاں ہیں اور ایک پختہ اور کامگار دُنیا دار ہونے کے لئے انسان کو ان سے اجتناب ہی لازم ہے۔ اس زمانہ میں دنیاوی لحاظ سے وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دوسرے کے ہر فعل کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے اور ہر قدم پر محتاط اور خود نگر رہتے ہیں۔ اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں دوسرے کے فائدہ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مگر آسیہ بیچاری اپنی فطرت سے مجبُور تھی اسے بدل دینا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ اگر پھوپی حنیفہ کو خدا نے اس کے لئے ایک سہارا نہ بنا دیا ہوتا تو وہ دشمنوں

ہے کب کی مات کھا چکی ہوتی۔

وقت گزرتا رہا۔ ہر طرح محتاط رہنے کے باوجود کئی چھوٹے چھوٹے واقعات ایسے رونما ہوئے جن سے ظاہر تھا۔ کہ دشمن گھات میں ہے۔ ایک دفعہ ننھے طیب کے پالنے سے کالے رنگ کا خوفناک بچھو نکلا سب حیران تھے کہ ایسا بچھو کہاں سے آگیا۔ کیونکہ پنجاب کے اس علاقہ میں ایسے زہریلے بچھو نہیں ہوتے۔ وہ ایک سال کا ہوا تو چچا نے اُسے سالگرہ کے تحفہ میں گائے دی۔ ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے وہ گائے واقعی ایک تحفہ تھی جیسے سنگِ مرمر کا تراشا ہوا مجسمہ ہو۔ دیکھنے والے عش عش کر اُٹھے۔ ماں نے یہ گائے صرف طیب کے لئے وقف کر دی۔ مگر تین ماہ کے بعد بچے کو ہلکا ہلکا سا بخار رہنے لگا اور اُس کا گول مٹول گداز جسم گھٹنے اور سوکھنے لگا۔ ان دنوں بشیر جاپان کے دَورہ پر گیا ہوا تھا واپس آکر اس نے بچے کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ اُسے بچوں کے ماہر معالج کو دکھانے کے واسطے لے گیا ڈاکٹر نے تحقیق اور معائنہ کے بعد تشخیص کیا کہ بچے کو ایک خطرناک قسم کا بخار ہے جسے ”ایبورڈس“ کہتے ہیں اسے کسی ایسی گائے کا دُودھ دیا گیا ہے جس کا بچہ ضائع ہو گیا تھا۔ ایسی گائے کے دودھ سے یہ بخار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بارہا مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اس خبر سے سارے گھر میں دہشت پھیل گئی۔ بشیر نے خفیہ طور پر تحقیقات کرائی تو معلوم ہوا کہ واقعی اُس سفید گائے کا بچہ ضائع ہو گیا تھا جو چچا نے اپنے شیرخوار بھتیجے کو سالگرہ کے تحفہ میں دی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ بچے کی جان لینے کی گہری سازشیں ہو رہی ہیں۔ بشیر نے فوری ضرورت محسوس کی کہ یہ بچے کو اس ماحول سے نکال لینا چاہیئے۔ بسرِدست تو علاج پر توجہ دینا لازمی تھا۔ اس نے ہسپتال میں فیملی وارڈ لے لیا اور سوائے تینوں بچیوں کے گھر کے سب لوگ ہسپتال میں اُٹھ آئے۔ لڑکیوں کی تعلیم کو بشیر خود آسیہ بیگم سے بڑھ کر اہم خیال کرتا

تھا۔ آسیہ بیگم کہتی رہی کہ وہ بھی ساتھ ہی ہسپتال چلی جائیں لیکن بشیر متفق نہ نہ ہوا اور انہیں ہوسٹل میں داخل کروادیا۔

"امتحان قریب ہے۔ اور ہسپتال میں کوئی دو چار روز کی رہائش نہیں۔ خبر نہیں کتنا عرصہ لگے۔ بچیوں کی سال بھر کی محنت کیوں ضائع کی جائے۔"

بشیر کے استدلال پر آسیہ بیگم خاموش ہوگئی۔ اور تشخیص کے لگتے ہی روز سب کام مکمل کر کے یہ لوگ ہسپتال میں اُٹھ آئے ننھے طیب کی حالت دن بدن نازک ہوتی جارہی تھی۔ آسیہ اور حنیفہ اس کی تیمار داری میں خواب و خورش حرام کئے ہوئے تھیں دوا کے ساتھ ساتھ دُعا کا سہارا ان کے لئے تقویت بخش تھا اور انہیں یقین تھا کہ اللہ پاک ان کی محنت کو رائیگاں نہ کرے گا۔ اُس کی شانِ بخشندگی سے بعید ہے۔ کہ ایک بے آسرا بیوہ کو سہارا دے کر پھر چھین لے۔ چنانچہ پورے اعتقاد و عقیدت کے ساتھ دوا اور دُعا جاری تھی۔ اُن دونوں عورتوں نے مامتا اور ایثار کی انتہا کر دی۔! پوری پوری رات آنکھوں میں گزر جاتی بیمار بچہ بے کل رہتا اور یہ باری باری اُسے گود میں لئے بہلاتی رہتیں۔

اعجاز اور صدیقہ بچے کو دیکھنے اکثر ہسپتال آتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے پرائیویٹ وارڈ تھا اس لئے ہسپتال کے عملہ کی طرف سے کوئی پابندی نہ تھی۔

"بھابی! اگر میری صلاح مانو تو بچیوں کو ہوسٹل سے منگوا لو میں کل گیا تو بے حد اُداس تھیں چھوٹی تو بلکنے اور ضد کرنے لگی کہ ساتھ ہی چلوں گی تینوں کا گلہ خراب ہے کھانسی ہو گئی ہے کھانا اچھا نہیں ملتا ناقص گھی استعمال ہوتا ہے۔ ننھے کے اچھے ہوتے ہوتے جو ان میں سے کوئی بیمار پڑ گئی تو کیا ہوگا؟" چچا نے انتہائی خلوص کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کیا جائے بھیا! امتحان بھی تو قریب ہے نا۔ یہاں سے کیسے اسکول

جا سکتی ہیں اور پھر ڈاکٹر اتنے آدمیوں کے یہاں رہنے کی اجازت تو نہیں دے گا۔"

آسیہ نے بچے کو گود میں لیتے ہوئے تھکے ہوئے لہجہ میں کہا۔ اور آہستہ سے پہلو بدلا۔

"لاؤ بھابی ننھے کو مجھے دے دو کب سے لیے بیٹھی ہو ذرا لیٹ جاؤ۔

صدیقہ نے ہمدردی سے آسیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور بچے کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر حنیفہ پھپھو لپک کر آگے بڑھی۔

"تم بیٹھو بہو بیگم! میں لیے لیتی ہوں۔"

"اس کا نیپکن بدلنے والا ہو رہا ہے پھپھو! میں بدل دوں تو لے لیجئے گا۔" آسیہ کہنے لگی۔

"میں بدل دیتی ہوں۔ بہو بیگم ٹھیک کہتی ہے تم ذرا لیٹ جاؤ۔ کب سے یوں ہی بیٹھی ہو رات بھی جاگنا پڑتا ہے۔

حنیفہ پھپھو بچے کو لے کر دوسری طرف جا بیٹھی۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ بچیوں کے یہاں لانے کی کیا ضرورت ہے. عتیقہ ماشاءاللہ جوان ہو چلی ہے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ وہ اس جگہ رہے لاکھ احتیاط کرے پھر بھی پردہ نہیں ہو سکتا۔" اعجاز کہنے لگا۔

"تو پھر رہنے دو وہیں ہوسٹل میں۔ آخر اور لڑکیاں بھی تو رہتی ہیں اور کوئی زیادہ عرصہ تو رہنا نہیں، منّا اصل خیر سے اچھا ہو جائے تو ہفتہ عشرہ میں گھر آ ہی جائیں گے۔" آسیہ بیگم نے جواب دیا۔

"میں کہتی ہوں آخر ہوسٹل میں بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میرے پاس کیوں نہ چھوڑ دیا۔"

صدیقہ کہنے لگی۔ تو آسیہ ہنسنے لگی۔

"عقیقہ اب سیانی ہے سب کچھ سمجھتی ہے اس نے تو خود بخود ایاز سے چھپنا شروع کر دیا ہے۔" وہ ہنس کر کہنے لگی۔

"تو وہاں رہتے ہوئے بھی پردہ ہو سکتا ہے۔ ایاز کو باہر کا کمرہ دے دیا جاتا۔" صدیقہ نے بڑی فراخدلی سے کہا۔

"نہیں دولہن! بچے کو خواہ مخواہ پریشانی میں ڈالنا کیا ضروری ہے ایک گھر میں رہتے ہوئے پردے میں دقت ہوتی ہے اور پھر لوگ خواہ مخواہ باتیں بنانے لگتے ہیں۔" آسیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"بھئی آپ لوگوں نے تو معمولی سی بات کو اچھا خاصہ بحث کا مسئلہ بنا لیا کیوں نہ پھوپھو لڑکیوں کے پاس گھر چل کر رہیں آپ رحیمن کو یہاں بلوا لیں" اعجاز نے تجویز پیش کی۔ "رحیمن چلی آئے تو پھوپھو سے گھر کا کام اب نہیں ہوتا۔" آسیہ نے کہا۔

"تو میں خود چند دن یہاں بھابی کے پاس رہ جاتی ہوں۔ آخر ہم لوگوں کو بچے کی جان سے بڑھ کر تو اپنا آرام پیارا نہیں۔ میرے بغیر گھر کا کونسا کام اٹکا رہ جائے گا۔"

ایثار کی انتہا تھی۔ کہ صدیقہ جیسی خود غرض اور آرام طلب، عورت اس قدر قربانی پر مائل تھی۔

"ہاں ـــــ چلو یوں ہی کر لو۔ مگر لڑکیوں کا ہوسٹل سے بلوا لیا جانا بے حد ضروری ہے۔ میں تو انہیں دیکھ کر حیران ہو گیا چند ہی دنوں میں ذرا ذرا سے چہرے نکل آئے ہیں ان کے!" چچا نے بے حد دلسوزی سے کہا۔

"کیا بات ہے کچھ مجھے بھی تو بتاؤ ـــ!" پھوپھو خلیفہ ننھے کو تھپکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"لو اس وقت سے سر پھوڑ رہا ہوں اور انہیں کچھ پتہ ہی نہیں کہ بات کیا

ہو رہی ہے !" اعجاز بولا۔

"بیٹا! کیا کروں اُونچا سنائی دینے لگا ہے۔"

وہ کہنے لگی۔ اعجاز نے سارا معاملہ ذرا بلند آواز میں اس کے روبرو پیش کیا تو وہ یکدم بگڑ کر بولی۔

"نا بابا ! اور جو کرو سو کرو تمہیں اختیار ہے لیکن میں بچے کو چھوڑ کر کسی صورت نہ جاؤں گی ! مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ وہاں فکر میں گھلتی رہوں۔ کون مجھے پل پل کی خبر وہاں پہنچائے گا یہاں سامنے ہے تو مجھے تسلّی رہتی ہے معوذتین پڑھ پڑھ کر دم کرتی رہتی ہوں تو میرے دل کو تقویت رہتی ہے۔"

اعجاز اور صدیقہ نے بہت کچھ کہا۔ حتّٰی کہ مجبور ہو کر ظاہرداری رکھنے کو خود آسیہ بیگم نے بھی کہا لیکن حنیفہ پھوپھی بگڑ گئیں اور صاف اِنکار کر دیا۔ وہ بچّے سے جُدا ہونے کے لئے قطعاً آمادہ نہ ہوتی تھی۔

"حد ہے بھئی ! وہی مثل ہوئی کہ "ماں سے زیادہ چاہے پھاپا کٹنی کہلائے" اب یہ تو کوئی ماننے سے رہا کہ تم بھابی سے بھی بڑھ کر بچے کی چاہت میں نڈھال ہو رہی ہو؟" صدیقہ نے جل کر کہا۔

"تم چاہے جو کہہ لو۔ مجھے کسی سے بحث نہیں کرنا۔"

حنیفہ پھپھو جیسے بات کو ختم کر کے چُپ ہو رہی۔ منہ دوسری طرف پھیر کر بیٹھ گئی۔

"یوں کہو۔ کہ اندھے کو حمام خوش آیا ہے ! گھر جاؤ گی تو کام دھندہ کرنا پڑے گا۔ یہاں بچے کو گود میں سمیٹے پلنگڑی پر بیٹھی رہتی ہو۔!"

صدیقہ نے ایک اور چنگاری پھینکی اُسے اس بڑھیا پر بے حد غصّہ آرہا تھا جس کی وجہ سے اس کی ہر تجویز ناکام رہ جاتی تھی۔ اور حنیفہ نے ایک ہی چُپ سادھ لی۔ آسیہ نے آنکھ کے اشارہ سے صدیقہ کو مزید کچھ کہنے سے

منع کر دیا۔ اور وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اعجاز بھی سر جھکائے اس کے پیچھے چلا۔ اُس دن کے بعد اُسے بھتیجیوں کی صحت کی چنداں پرواہ نہ رہی نہ ہی اُس نے کبھی اس کے متعلق کچھ ذکر کیا۔

دو ماہ کے مسلسل علاج کے بعد بچے کی طبیعت سنبھلی اور وہ رو بصحت ہوا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ اُسے دو ہفتے مزید ہسپتال میں زیر علاج رکھا جائے۔ تاکہ اُسے مکمل صحت ہو جائے۔ اسی وقفہ میں ایک دن صدیقہ اور اعجاز آئے تو ایاز بھی ان کے ساتھ تھا۔ مُنّا اُسے دیکھ کر ہمکنے اور کلکاریاں مارنے لگا جیسے اس کی صورت سے مانوس ہو۔ صدیقہ نے اس بات کو محسوس کیا اور قدرے استعجاب سے شوہر کی طرف دیکھا۔ جیسے اسے شُبہ ہو کہ ایاز ان کی لاعلمی میں اکثر یہاں آتا جاتا ہے۔

"لو دیکھو ایاز! مُنّا تمہیں اتنے دنوں بعد بھی آؤ تو پہچان لیتا ہے۔ کوئی مہینہ بھر تو ہو گیا ہو گا جب تم اپنے ابو کے ساتھ یہاں آئے تھے؟"

آسیہ ایاز سے کہہ رہی تھی۔ اور ایاز نے مُنّے کو گود میں لے لیا۔

"جی ہاں تائی امی! بلکہ مہینے سے بھی زیادہ! جس دن ابو نے مجھے کالج کے لئے آٹو سائیکل لے کر دی اُسی دن ہم دونوں یہاں سے ہوتے ہوئے گھر گئے تھے ـــــ شاید پچھلے مہینے کی دس تاریخ کا ذکر ہے اور آج سولہ تاریخ ہے۔"

ایاز منو کے ساتھ کھیلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اعجاز نے اس کی بات سن کر بیوی کو نگاہوں ہی نگاہوں میں اطمینان دلایا۔ کہ لڑکا درست کہہ رہا ہے۔

"منو کے کھلونے تو لے دئے ہوتے! یہاں لاؤ! بازار سے؟"

ماں نے کہا تو ایاز یک دم اس طرح چونکا جیسے اُسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اور وہ پریشان ہو کر وہیں ساکت کھڑا ہوا۔ کچھ استعجاب آمیز تذبذب سے

ماں کی طرف دیکھنے لگا جو اپنی ساتھ لائی ہوئی باکسٹ میں سے بچّے کے لئے کھلونے نکالنے میں مصروف تھی۔

"لو یہ دو منّے بھیا کو!"

وہ لفافہ میں سے ایک ربڑ کی چڑیا نکال کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ مگر ایاز وہیں کھڑا رہا۔

"اے ہے ایاز! کیا ہو گیا تم جیسے سو رہے ہو بات ہی نہیں سُن رہے!"

ماں نے خفگی سے کہا اور خود اُٹھ کر کھلونا منّو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بچّہ خوشی سے کلکاری مار کر جھپٹا اور کھلونا لے کر حسبِ عادت منہ میں لینا چاہا۔

"اُہو —! نہیں نہیں! منّے منہ میں نہیں ڈالو اسے!" ایاز نے بچّے کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"اے تو کیا حرج ہے بچّے ہر چیز مُنہ میں ڈالتے ہیں!" ماں نے کہا۔

"نہیں — بو آنے لگی ربڑ کی!"

اتنا کہہ کر ایاز منّے کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔

"دادی جان! منّے سے یہ کھلونا لے لیجیے اس کے ہاتھ غسلخانہ میں جا کر صابن سے دھو ڈالیے۔ یہ ہاتھ یا کھلونا ہرگز منہ میں نہ ڈالے۔!"

ایاز نے بچّہ حلیفہ کو دیتے دیتے سرگوشی میں کہا۔ وہ حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ مگر سمجھدار عورت تھی کچھ استفسار نہ کیا اور بچّے کو لے کر دوسرے دروازہ سے باہر کے باغیچہ میں نکل گئی۔

"کہاں چلیں پھپھو! بچّے کو باہر نہ لے جاؤ ابھی تو باہر خاصی لو چل رہی ہے!"

صدیقہ کہنے لگی۔ مگر حنیفہ نے کچھ جواب نہ دیا اور جب وہ منو کو لئے ہوئے واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کھلونا نہیں تھا بلکہ کھلونا چھن جانے سے وہ رونے لگا تھا۔

"ائے ہے پھپھو! اس کا کھلونا کیا ہوا؟" صدیقہ نے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اس نے غسلخانہ میں پھینک دیا۔ کھلونوں سے پیار ہی نہیں اسے!"

پھپھو حنیفہ نے بچّے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"اتنا تو خوشی سے لیا تھا اس نے؟ حد ہے بھئی! کچھ سمجھ میں نہیں آتیں تم لوگوں کی باتیں۔!"

صدیقہ نے عجیب قہرناک نگاہوں سے حنیفہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

مگر حنیفہ نے کچھ جواب نہ دیا وہ نہایت سنجیدگی سے ایاز کے لفظوں اور اس کے اس طرزِ عمل پر غور کر رہی تھی —— "کیا اسے بھی اپنے والدین کی نیت پر شبہ ہے؟ یا واقعی کسی ٹھوس وجہ سے وہ ایسا کہنے پر مجبور ہو گیا؟" اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال ابھر رہا تھا۔ اور ادھر صدیقہ کو بیٹے پر غصہ آنے لگا جس نے اس بڑھیا کو خواہ مخواہ وہم میں ڈال دیا۔ اور وہ باقی کھلونے واپس ٹوکری میں ٹھونستے ہوئے جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اعجاز چھوٹے بچے کو انگلی سے لگائے کمرے میں داخل ہوا تو بیوی کو واپسی پر آمادہ پایا۔

"ابھی سے جانے کو تیار ہو گئیں؟" وہ تعجب سے پوچھنے لگا

"تو اور کیا یہاں چھاؤنی ڈال کر بیٹھ جاؤں؟ اتنے دنوں سے ہسپتال کی دوڑ میں گھر اوندھا پڑا ہے۔ تم ہو کہ باہر کے سارے کام ویسے کے ویسے الکا رکھے ہیں۔ اور یہاں کسی کو پرواہ ہی نہیں، ان پھپھو کو دیکھئے انھیں ہر بات ٹیڑھی ہی سوجھے گی۔ بھلا اس کھلونے میں کیا کیڑے پڑے تھے

کہ بچہ روتا ہی رہ گیا یہ اس کے ہاتھ سے چھین کر خبر نہیں کہاں پھینک آئیں!

صدیقہ نے فرطِ غیظ و غضب میں یہ بھی نظر انداز کر دیا۔ کہ وہ ہسپتال جیسے مقام میں کھڑی ہے اور اس طرح پوری آواز سے چلّا کر باتیں کرنا ساتھ کے کمروں کے مریضوں کے لئے بے آرامی کا باعث ہوگا۔

"ہیں! پھینک آئیں! وہ کیوں ——— ؟" اعجاز نے حیرت سے پوچھا۔

"اے بھیا! تمہیں اپنی دولہن کی عادت تو معلوم ہی ہے بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا لینا اس کا کام ہے ——— ! ہوا یوں کہ وہ کھلونا بچے کے ہاتھ سے چھوٹ کر غسلخانہ کے گندے فرش پر گر پڑا۔ میں نے اُسے دھو کر باہر دھوپ میں رکھ دیا۔ کہ سوکھ جائے۔ تو اس میں میری ایسی ہی کیا خطا ہو گئی؟" بیچاری پھپھو حنیفہ عاجزانہ صورت بنائے کہہ رہی تھی۔

"دھو کر ——— اُہو! ——— چلو خیر! تو اس میں خفگی کی ایسی ہی کیا بات ہو گئی؟" وہ بیوی سے پوُچھنے لگا۔

"ہاں دُولہن! چلو جانے دو۔ معمولی بات ہے!"

آسیہ نے ہنس کر کہا تو صدیقہ اور بھی آگ بھبوکا ہو گئی۔

"بھابی تمہارے ایسے دھیمے مزاج ہی نے تو اس بڑھیا کو اتنی جرأت دے رکھی ہے ورنہ اس کی کیا مجال کہ یوُں ہر ایک کے منہ آئے!"

وہ چلّا کر بولی۔

"اے ہے صدیقہ دولہن! آخر یہ ہسپتال ہے کوئی گھر تو نہیں کہ اس جگہ لڑائی جھگڑا کیا جائے دوُسرے مریض کیا سوچیں گے کہ یہ کون لوگ ہیں؟"

"آخر مجبوُر ہو کر آسیہ کو کہنا پڑا۔ پھوپھی حنیفہ کے ساتھ صدیقہ کا ایسا

رویہ اُسے بے حد ناگوار گزرا تھا وہ اس عورت کی ماں کی طرح عزت وقدر کرتی تھی۔

"اچھا اچھا ـــــ! جا رہے ہیں ہم لوگ۔ تم ہی یہاں مریضوں کی سگی بن کر رہو ـــــ! ہماری بیزار کو کیا پڑی کہ اب ادھر کا رُخ بھی کریں۔"

وہ باہر نکلتے نکلتے کہہ رہی تھی۔

"آفرین ہے ـــــ!"

آسیہ بیگم کے منہ سے بے ساختہ نکلا اعجاز نے اشارہ سے اُسے منع کر دیا۔ کہ کچھ مت کہے اور اسے جاتے دے۔ اور وہ چُپ ہو رہی۔

"پھپھو آپ بھی اس قدر وہم نہ کیا کریں۔ کیا فائدہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے میں ؟ رہنے دیا ہوتا کھلونا منّو کے ہاتھ میں!" اس خواہ مخواہ کی جھڑپ سے بیزار ہو کر آسیہ بیگم نے کہا۔

"ایسی ہی غافل رہو گی تو اس بچے کا اللہ ہی حافظ ہے میری بنّو ـــــ! تم ایسی سیدھی اور بھولی ہو۔ دشمن ہر آن گھات میں ہے۔ میں بڑھیا آج مری کل دوسرا دن، کب تک تمہیں ہوشیار رکھنے کو جیتی رہوں گی ـــــ!"

خلیفہ نے لمبا سانس بھر کر کہا تو آسیہ بیگم نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"بات کیا ہوئی ؟"

جواب میں اس نے ایاز کا پورا قصہ بیان کر دیا۔

"تو کہاں ہے وہ کھلونا ؟ تمہارے قیاس میں کھلونے میں کیا خطرہ ہو سکتا ہے ؟"

"ہو سکتا ہے وہ کسی زہریلی چیز میں ڈبو کر بچے کے واسطے لایا گیا ہو۔ اسی لیے تو ایاز نے کہا۔ کہ منّے کے ہاتھ اچھی طرح دھو دینا کھلونے والے ہاتھ بھی وہ منہ میں نہ ڈالے!"

بڑھیا آنکھیں پھاڑے ہوئے حیرانگی کے انداز میں کہہ رہی تھی کہ بشیر کمرے میں داخل ہوا اس کے ساتھ عتیقہ۔ عائشہ اور عامرہ تھیں وہ آتے ہی مُنّے پر جھپٹ پڑیں۔ اور اُسے گود میں لینے کے لیے ایک دُوسری سے کشمکش کرنے لگیں۔

دیکھو اس طرح کھینچ تان نہ کرو۔ بچہ گھبرا جائے گا! عتیقہ تم منّے کو ساتھ کے کمرے میں لے جاؤ اور باری باری ان دونوں کی گود میں دو۔ مجھے تمہارے ماموں سے ایک ضروری بات کرنی ہے شور نہ ہونے پائے۔"

ماں نے بڑی بیٹی سے کہا اور اُس نے نہایت خاموشی سے تعمیل کی۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟"

بشیر نے استفسار کیا تو آسیہ نے اُسے سارا واقعہ سنایا۔

"تو کہاں ہے وہ کھلونا! کہیں سچ مچ ہی پھپھو نے اُسے دھو تو نہیں ڈالا؟" وہ پوچھنے لگا۔

"نہیں ویسے ہی رکھا ہے۔"

اتنا کہہ کر حنیفہ جلدی سے باہر گئی اور وہ کھلونا اُٹھا لائی۔ بشیر نے اُسے ایک پیالی میں رکھ کر دھویا اور اس پانی کو احتیاط سے ایک بوتل میں ڈال کر اُسی وقت کیمیائی معائنہ کی غرض سے لے گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو اُس کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔

"آسیہ بہن! اس بچے کی زندگی چاہتی ہو تو اسے لے کر ان لوگوں سے دُور چلی جاؤ۔ ورنہ کبھی نہ کبھی تو اُن کا وار چل ہی جائے گا۔"

اس نے آتے ہی بدحواسی کے لہجہ میں کہا۔ اور آسیہ بیگم بھی اڑی ہوئی رنگت سے اُس کے مزید بیان کی منتظر رہی۔

"کیوں بھیا! کیا خبر لائے؟" ساتھ کے کمرے سے حنیفہ نکلتے ہی

پوچھنے لگی۔

”نہایت مہلک قِسم کا زہر اِس کھلونے پر مل کر بچے کو دیا گیا۔ کہ وہ اُسے منہ میں ڈالتا رہے اور وہ زہر رفتہ رفتہ اس کے اندر سرایت کر کے خاتمہ کر دے۔ اب ان لوگوں نے دیکھا۔ کہ گائے کے دودھ کے مہلک جراثیم اس بچے کی جان لینے سے ناکام بنا دیئے گئے تو اب انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ میں کہتا ہوں آسیہ بہن! اگر تم اس بچے کی زندگی چاہتی ہو تو اسے خطرے کے اس ماحول سے نکال لے جاؤ۔ ورنہ کب تک کوئی ایسے واروں کی مدافعت کر سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن کوئی کارگر چال چل جائے“

بشیر نے کہا تو دونوں عورتیں دہشت زدہ سی صورت بنائے اِس کی طرف دیکھتی رہیں۔

”وار تو شاید آج ہی چل چکا ہوتا۔ اگر ایاز ہوشیار نہ کر دیتا“ آسیہ بیگم نے سہمے ہوئے سے لہجہ میں کہا۔

”اس کا یہ مطلب سمجھنا چاہیئے کہ ایاز کو اپنے تایا کے کنُبے سے ہمدردی اور اُنس ہے۔ ؟ چلو یہ بھی خدا کا شکر ہے ورنہ خطرہ وہ چند بڑھ جاتا“ بشیر کہنے لگا۔

”میں کہتی ہوں بشیر بیٹا! اگر ایاز وقت پر خبردار نہ کر دیتا تو آج قیامت ٹوٹ پڑتی، ہزاری عمر ہو اُس بچے کی! زندگی کی بہاریں دیکھنا نصیب ہوں اُسے“ حنیفہ پھوپھی ایاز کو دعائیں دیتے ہوئے بولی۔

”کتنی کمینگی ہے کہ یہ ناعاقبت اندیش لوگ اس نوعمر لڑکے کو ایسی خطرناک سازشوں میں شریک کر کے اس کے اخلاق کو مسموم اور اس کی معصومیت کو داغدار بنانے سے نہیں چوکتے۔ دُنیا کی ہوس اور دولت کی حریص نے انہیں اس حد تک بداخلاق بنا دیا ہے؟“ بشیر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے اس نے ان کی باتیں اتفاقیہ سُن پائی ہوں گی۔ ورنہ صدیقہ ایسی بد احتیاطی نہیں کر سکتی۔ اُسے معلوم ہے۔ کہ ایاز ہم لوگوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔" آسیہ بیگم بولی۔

"یوں ہی ہو گا ـــــ وہ اسے اپنی تجویزوں میں شریک رکھتے تو ہمارے حق میں بہتر تھا۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے اور روز روز ایسے اتفاقات تو نہیں ہو سکتے کہ ایاز ان کی باتیں سُن پائے چنانچہ ہمیں قبل از وقت بچے کو محفوظ کر لینا چاہیئے۔ کیوں پھپھو؟" آخر میں وہ قریب کھڑی ہوئی حنیفہ پھوپھی کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں بھیا! میں تو آج کے اس قصّے سے بالکل ہی ڈر گئی۔ جلدی کچھ سوچ کہ کیسے ان کے ہاتھ سے بچّے کی جان بچے۔" حنیفہ پھوپھی کہنے لگی۔

"میں سوچتا ہوں کہ منّو کو لے کر تم جمیل کے پاس چلی جاؤ آسیہ بہن!" بشیر نے تجویز پیش کی۔

"لو بھیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لڑکیوں سے الگ کیونکر اتنی دور چلی جاؤں ـــ؟"

آسیہ حیران ہو کر بشیر کا منہ تکنے لگی۔ یہ تجویز اس کے نزدیک کسی طرح بھی قابلِ قبول نہ تھی۔

"ہاں، بچیاں اس کے بغیر کیسے رہ سکیں اور مجھے منّو کے بغیر کیسے چین آئے گا۔ یہ ٹھیک نہیں کوئی اور تدبیر کرو۔" حنیفہ پھوپھی بولی۔

"تو راولپنڈی چل رہو ـــ"

بشیر نے ایک اور تجویز پیش کرتے ہوئے استفسار سے آسیہ کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر بدستور وہی کیفیت تھی جیسے یہ تجویز بھی اُسے پسند نہیں۔ مگر وہ خاموش رہی۔

"کیوں نہ گاؤں اُٹھ چلیں ـــ؟ راولپنڈی چلے جائیں تو یہاں کے سارے

کام تلپٹ ہو جائیں گے اعجاز کو تم جانتے ہی ہو۔ اور پھر یہ لوگ قسم قسم کی افوائیں پھیلائیں گے۔" پھوپھی غیفہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ ٹھیک رہے گا بھیا! کون آئے دن گاؤں آتا رہے گا ان لوگوں میں سے؛ اور معقول عذر بھی ہو گا۔ کہ اراضی کی دیکھ بھال کے لیئے ہم لوگ گاؤں میں اُٹھ گئے ہیں شہر کی رہائش ویسے بھی مہنگی ہے۔"

آسیہ بیگم کو اس تجویز سے اتفاق تھا۔

"لڑکیوں کی تعلیم کا کیا کرو گی؟" بشیر نے پوچھا۔

وہ ہوسٹل ہی میں رہ سکتی ہیں۔" آسیہ بیگم کہنے لگی۔ اور تھوڑے سے تبادلۂ خیالات کے بعد یہ لوگ اسی تجویز پر متفق ہو گئے۔

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱 0307-2128068
@Stranger ❣❣❣❣❣❣❣

(۹)

دستِ قدرت کسی کام کو سُلجھانے پر آئے تو خود بخود ایسے وسائل اور قرائن پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہ مُدتوں کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں۔ اور انسانی ذہن کی تدبیریں جن عقدوں کو حل نہ کر سکی تھیں۔ تقدیر اُنھیں ایسی آسانی سے واشگاف کر کے ہموار کر دیتی ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اعجاز اور صدیقہ کے ہاتھوں بیچاری آسیہ بیگم کا امن حرام ہو رہا تھا۔ اس کے اکلوتے بچے پر ان کی طرف سے پے در پے کئی خطرناک حملے ہوئے تھے۔ وہ اس کی جان کو بچائے بچائے پھرتی تھی۔ اور ہر آن یہی دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کہ ایسا نہ ہو کبھی بے خبری میں دشمنوں کا وار کارگر ہو جائے۔ حنیفہ اور آسیہ گاؤں میں اُٹھ آنے کے بعد بھی سایہ کی طرح مُنے طیب کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی نامساعد وقوعہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ اعجاز کے کارکن اس جگہ بھی مقرر ہیں۔ ان لوگوں کو موضع نیاز آباد میں آکر مقیم ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ کہ شہر سے خبر آئی صدیقہ کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے۔ یہ خبر بشیر نے سُنی تو وہ فوراً نیاز آباد پہنچا اور بہن کو مشورہ دیا۔ کہ وہ نوزائیدہ بچی کو طیب کے ساتھ منسوب کرے۔ تاکہ اس طریقہ سے بچے کی

زندگی محفوظ ہو جائے۔ آسیہ بیگم کے ذہن میں پہلے ہی یہ خیال آیا تھا بشیر کے امّا پر اُس نے اور حنیفہ نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اُن لوگوں سے میل جول کا سلسلہ تو قائم ہی تھا۔ ان کی نیاز آباد میں رہائش کے دوران وہ دونوں میاں بیوی دو مرتبہ آکر رہ گئے تھے۔ ایاز ہمیشہ چھٹیاں گزارنے گاؤں چلا آتا تھا۔ اگرچہ ماں کو اپنے بیٹے کا یہ رویہ پسند نہ تھا۔ لیکن جوان بیٹے کی دلچسپی اور میلانِ طبع پر وہ بندش لگانے میں ناکام رہی تھی۔

اس تجویز کے قرار پاتے ہی آسیہ بیگم نے تیاریاں شروع کر دیں۔ اور بڑے ٹھاٹھ سے شگون کی چیزیں لے کر پہنچی۔ شیرینی کے کئی خوان، بچی کے بیش قیمت فراک اور مُنّی سی ہیرے کی انگوٹھی۔ اتنی مدت کے بعد بڑی بھاوج اعجاز کے گھر آئی تھی۔ دل میں گو کچھ ہی تھا مگر بظاہر خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اور مسرت کا اظہار کیا گیا۔ صدیقہ ہنوز زچہ خانہ میں تھی۔

"میرا خیال ہے بھابی کو کسی نے غلط خبر سنائی ہے۔ انہوں نے سمجھا لڑکا ہوا ہے جب ہی تو اس قدر کرّوفر سے شگون لے کر آئی ہیں۔"

اعجاز آسیہ بیگم کو ساتھ لیے ہوئے صدیقہ کے کمرے میں داخل ہوا اور ہنس کر بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خیر سے تین بھائیوں کے اُوپر کی بہن بھی تو کچھ کم لاڈلی نہیں ہوتی اور پھر میں تو کسی اور نیت سے آئی ہوں ـــ ! لڑکے تمہیں مبارک رہیں۔ اس بچی کو اللہ پاک صاحبِ نصیب کرے یہ میرے گھر کی روشنی ہے ـــ ! لاؤ دُولہن اپنے ہاتھ سے میری امانت میری جھولی میں ڈال دو۔"

آسیہ بیگم دلی مسرت اپنے چہرے پر لیے نہایت فراخدلی سے کہہ رہی تھی اور صاف ظاہر تھا۔ کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے صاف باطن سے کہہ رہی ہے۔ اعجاز ہنسنے لگا۔ صدیقہ نے معنی خیز انداز سے شوہر کی طرف دیکھا۔ دونوں

کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوتے صدیقہ نے بھی ہنستے ہوئے اپنے پہلو سے بچی کو اٹھایا اور آسیہ بیگم کی گود میں ڈال دیا۔ آسیہ بیگم نے اپنا پرس کھولا اور ننھی سی الماس نگار انگشتری نکال کر بچی کی انگلی میں پہنادی۔ اس کے مرمریں رخسار پر محبت سے بوسہ دیا تو اس نے چونک کر لمبی لمبی سیاہ آنکھیں کھول دیں۔ اور غنچہ جیسا منہ کھول کر مسکرانے لگی۔

"کتنی پیاری ہے میری گڑیا!"

وہ بچی کو چومتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ حنیفہ بیگم منو کو گود میں لیے قریب ہی کھڑی تھی۔

"اعجاز! تم منو کے لئے بھی انگوٹھی منگوالو بھیا!" وہ کہنے لگی۔

"بہت اچھا ابھی منگواتا ہوں۔"

اور وہ جلدی سے اٹھ کر مردانہ میں آیا۔ اور منشی کو صرافہ میں بھیج کر ننھی سی انگوٹھی منگوائی۔ ہر طرف سے جیسے حقیقی مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی مبارک سلامت کی آوازیں آرہی تھیں۔ شیرینی بٹ رہی تھی۔ آسیہ بیگم نے ملازموں اور کمینوں کو داد و دہش سے خوش کر دیا۔ آسیہ بیگم ابھی بچی کو لیے بیٹھی تھی۔ کہ چند رشتہ کی خواتین صدیقہ کی عیادت کو آگئیں۔

"ارے یہاں تو ایسے چہل پہل ہے جیسے لڑکی نہیں لڑکا پیدا ہوا ہو۔"

ایک بولی۔ پھوپھی حنیفہ نے بتایا۔ کہ نوزائیدہ بچی کو آسیہ نے اپنے بچے سے منسوب کرلیا ہے۔ اسی خوشی میں یہ چہل پہل ہے۔

"بس یہ ٹھیک ہوگیا۔" دوسری نے معنی خیز لہجہ میں کہا۔

"بھئی صدیقہ بھابی بڑی دور اندیش عورت ہے! کیسی پتے کی بات سوچی!" پہلی نے کہا۔

"یہ دور اندیشی صدیقہ نے نہیں آسیہ بیگم نے سوچی ہے۔" حنیفہ پھوپھی کہنے لگی۔

چلو بہت اچھا ہوا۔ اس رشتہ سے آپس کے اختلاف مٹ جائیں گے۔ اور طرفین اپنی اپنی جگہ مطمئن رہیں گے جو دُور اندیش بزرگ گھریلو سیاست کو کامیاب بنانے کے لیے اس قسم کے گٹھ جوڑ سوچ لیتے ہیں اُن کے خاندان میں باہمی مخالفت پیدا نہیں ہوتی ___ واقعی آسیہ بیگم نے یہ بڑی ہی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ خدا مبارک کرے اور بیچاری کو بچے کی خوشیاں دیکھنا نصیب ہوں" تیسری خاتون بولی۔

اور اتنے ہی میں آسیہ بیگم خود مہمان بیبیوں سے ملنے چلی آئی۔ سب نے رسمی الفاظ میں خیر مقدم کیا اور مبارکباد دی۔ آسیہ بیگم بے حد مسرور نظر آرہی تھی۔ اس کی زندگی کا ایک بہت ہی نازک اور پیچیدہ مسئلہ آج یوں ایکا ایکی سُلجھ گیا تھا۔ اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے سنگِ گراں بار اس کے سر پر سے اُتار کر پھینک دیا ہو۔

"خدا کسی سے ناانصافی نہیں کرتا۔ اُس نے تمہیں ناامیدی میں اُمید کا سہارا دیا تو اب اس بچے کو زندگی دے اور تمہیں اس کی خوشیاں دیکھنا نصیب ہو۔"

بیبیوں میں سے ایک نے کہا۔ باقی بھی اپنے اپنے انداز میں خیر سگالی اور خوشی کا اظہار کرتی رہیں۔ چائے اور شیرینی سے ان کی تواضع کی گئی۔ جب آسیہ بیگم مہمان خواتین کو رخصت کر کے صدیقہ کے کمرے میں آتی تو تو عجب پُر لطف منظر دیکھا۔ ننھا طیب چچی کے پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور گود میں ننھی بچی کو لیے ہوئے تھا۔ صدیقہ دلی مسرت کے جوش سے گلگوں ہو رہی تھی اور اس سرخی میں صفائے قلب کی چمک سے اس کا چہرہ منور تھا۔ آسیہ کے دل کو تسکین ہوئی کہ اس عورت نے، جو اس کے بچے کی جانی دشمن تھی۔ اب اپنی اولاد کے تعلق سے اس کی طرف سے دل صاف کر لیا ہے۔

"دولہن! میں نے اپنے اس بچے کو تمہاری اولاد میں شامل کر دیا ہے خدا کرے کہ یہ تمہارا ہو کر ہی جئے اور پروان چڑھے۔"

نیک دل آسیہ نے متاثر ہو کر کہا۔ کیونکہ اس کے دل میں صدیقہ کے اس فتح مندانہ جیسے انداز نے مسرت کے ساتھ ہی ساتھ کچھ دلگداز سا تاثر پیدا کر دیا تھا۔ جیسے وہ اس کی مامتا میں شریک ہو گئی ہو۔ لیکن بچے کی زندگی کی خاطر اس نے خود ہی تو اسے اپنی مادرانہ محبت میں شریک کیا تھا۔ اور یہی خیال اس کے لئے وجہ تسلی تھا کہ اب اس کا منو خطرے سے باہر، محفوظ و مامون ہے۔!

اعجاز باہر سے آیا تو وہ منو کے لئے کپڑے، کھلونے اور انگوٹھی لے کر آیا تھا۔ بھاوج کے ساتھ بھیجنے کے واسطے کئی خوان شیرینی کے آئے تھے۔

"بھابی! آپ ننھی کا نام اپنی پسند سے رکھیئے" اس نے آتے ہی کہا تو۔ تو آسیہ یکدم بولی۔

"اس کا نام سعدیہ رکھا ہے میں نے۔ خدا کرے مبارک اور نیک بخت ہو۔ صاحب نصیب ہو۔"

"خدا کے فضل سے مبارک تو ہے ہی میری بچی!"

اعجاز نے جیسے بے ساختہ کہہ دیا۔ اور صدیقہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ آج اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ جس دولت کے لئے وہ مری جا رہی تھی جس کے لالچ میں وہ ہر وقت شوہر کو برائی پر اکساتی اور خطرناک منصوبے بناتی تھی۔ اس دولت کے حصول کی کلید خود بخود اس کی گود میں آن گری تھی وہ جس بچے کی جان کے درپے آزار تھی وہی بچہ اب اسے اولاد کی طرح عزیز ہو گیا۔ بعض لوگوں کی عجیب ذہنیت ہوتی ہے ان کی اخلاقی قدریں تک اپنی تعمیر و تخریب کے لئے زور دولت کی رہین ہوتی ہیں۔ دنیا

کی طلب اُن کی انسانیت تک کو ادھورا کر دیتی ہے۔ اور اس کے حصول پہ ہی وہ خود کو صحیح معنوں میں انسان تصور کر سکتے ہیں، بہرکیف غنیمت تھا کہ طلب دُنیا کی بدولت ہی یہ دونوں میاں بیوی اپنی بہیمانہ حرکات سے باز رہے اور انسانیت کے دائرہ میں واپس چلے آئے۔ قدرت جب مہربان ہوئی تو ایک خاندان کے ان دونوں کنبوں کا ایک بہت بڑا مخمصہ جو ان کے لئے اپنے اپنے طور پر ذہنی خلجان بنا ہوا تھا آنِ واحد میں نپٹ گیا۔ اور ان کے شب و روز امن اور سکون سے کٹنے لگے ننھا طیب جس کی زندگی کے ساتھ طرفین کا اپنا اپنا مفاد وابستہ تھا، ناز و نعم سے پرورش پانے لگا۔

۲

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

میرزا غالب

(۱۰)

تائی امّی! مبارک ہو! کچھ مٹھائی وٹھائی بھی منگوا کر رکھی ہوئی ہے آپ نے؟ آپ کا بیٹا خاصے اچھے نمبروں پر پاس ہو گیا!"

اعجاز کا سب سے چھوٹا بیٹا ریاض کہہ رہا تھا۔ ریاض، طیب کا ہم عمر تھا۔ پہلے اس کے ساتھ پڑھتا رہا، لیکن اسکول میں دو سال مسلسل فیل ہونے سے اس سے پیچھے رہ گیا تھا اور اب آئندہ سال یہ بھی ایف۔اے کا امتحان دینے والا تھا۔

"خدا کا لاکھ شکر ہے میرے بیٹے! اللہ پاک تم سب بھائیوں کو ہمیشہ کامیابی اور ترقی بخشے اور اتفاق اور محبت سے سدا اکٹھے رہنا نصیب ہو۔ کہاں ہے میرا طیب؟"

وہ مارے خوشی کے ریاض کا سر منہ چومتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ اتنے ہی میں اپنی خمیدہ کمر پہ ہاتھ رکھے موٹے موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے تجسس سے آنکھیں جھپکتے پھوپھی حنیفہ برآمدہ سے نکل کر صحن میں آئی۔

"اے کیا بات ہے ــــــ؟ کوئی مجھے بھی تو بتائے؟" وہ۔

پوچھ رہی تھی۔

"پھپھو! تمہارا بیٹا پاس ہوگیا!"

آسیہ نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔ بیچاری پھپھو حنیفہ اب اُونچا سُننے لگی تھی۔

"ہاں دادی جان! بس اب مٹھائی منگوایئے مٹھائی!"

ریاض نے دادی کے کان کے قریب منہ لگا کر اور پوری آواز سے چیخ کر کہا۔

"اچھا اچھا! ابھی لو مٹھائی تو میں نے صبح سے منگوا رکھی ہے۔"

وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی اندر گئیں۔ کمر خم ہوگئی تھی مگر رفتار میں وہی پھرتی تھی۔

"تو جلدی لایئے! طیب کو تو باہر دوستوں نے گھیر رکھا ہے وہ کہتے ہیں جب تک مٹھائی نہ آئے گی وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔" ریاض ہنس کر کہہ رہا تھا۔

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور یقین دلاؤ کہ اُن کے واسطے چائے اور مٹھائی ابھی بھیجی جاتی ہے۔ مگر میرے بیٹے کو تو آنے دیں میرے پاس!"

آسیہ بیگم ہنس کر کہہ رہی تھیں۔ کہ پھوپھی حنیفہ ایک بڑے طشت میں شیرینی ڈالے ہوئے آئی۔

"تیرے منہ میں گھی شکر! میرے بیٹے تو نے آج یہ خوشخبری سنائی ہے جس کے لیے میرے کان ترس رہے تھے۔" اس نے آتے ہی ریاض کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"اوہو! گھی شکر سے مجھے چڑ ہے! آپ بھی امی کی طرح مجھے "گھی شکر" ہی میں ٹالنے لگیں — ! ایسی خوشخبری سنانے پر تو کہنا چاہئے تھا "تیرے منہ میں قلاقند"! تیرے منہ میں گلاب جامن!" وہ طشت لیتے ہوئے کہہ

رہا تھا۔

"لو اصل خیر سے جس قدر جی چاہے کھاؤ دوستوں کو کھلاؤ۔ رحیمن چائے بنا کر بھیجتی ہے! تم میرے طیب کو اندر بھیجو۔"

آسیہ بیگم کہہ رہی تھی۔ ریاض طشت اٹھائے قدم برداشتہ باہر نکل گیا اور ایک منٹ کے بعد ہی ایک کشیدہ قامت، وجیہہ اور صحت مند نوجوان مردانہ ڈیوڑھی کی طرف سے صحن میں داخل ہوا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر اس وقت وفورِ مسرت سے عجب دلفریب جلا پیدا ہو گئی تھی کشادہ اور منور پیشانی چمک رہی تھی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلی جا رہی تھی۔ وہ پریشان بالوں کو پیشانی پر سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا۔

"امی! اب اپنا وعدہ پورا کیجئے گا —— ! میں اب سکوٹر پر کالج نہیں جایا کروں گا۔"

وہ بچوں کی طرح لاڈ کے انداز سے بولا۔ اتنے ہی میں پھوپھی حنیفہ باورچی خانہ سے نکلی، وہ اپنے سامنے چائے تیار کروا رہی تھی۔

"انشاءاللہ اپنے بیٹے کو کار لے کر دوں گی —— جاؤ دادی جان سے ملو۔ دیکھو تو سہی کیسی خوش ہو رہی ہیں تمہارے پاس ہونے پر! صبح سے اب تک جائے نماز پر بیٹھی ہوئی دعائیں مانگ رہی تھیں۔" ماں نے اس کی خوبصورت پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"نتیجہ تو صبح سے بہت پہلے چھپ چکا تھا —— ! بہرکیف مجھے ان کا شکر گزار ضرور ہونا چاہیئے!"

طیب نے ہنس کر کہا۔ اور ضعیفہ کی طرف بڑھا۔

"آپ نے کچھ سنا بھی دادی جان! اب انعام دلوایئے!"

وہ بڑھیا کے کان کے قریب منہ کر کے اور اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو

اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے ہنس کر کہنے لگا۔

"میں صدقہ ہو جاؤں! اللہ ہزاری عمر کرے میرے لال کی! میں تو اپنی جان بھی قربان کر دوں! تو انعام کہتا ہے!"

ضعیفہ نے جوشِ مسرت سے اس کی پیشانی پر کئی بوسے دیئے۔ اور وہ ہنسنے لگا۔

"لیجئے امی ـــــ! بھلا ان کی جان انعام میں لے کر میں کیا کروں گا ـــــ! سستے داموں ہی ٹالنا چاہتی ہیں مجھے!"

طیب نے ہنس کر ماں سے کہا۔ مگر آسیہ بیگم سنجیدہ ہو گئیں۔

"تم نہیں جانتے طیب! ان کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ میں تو اپنے موجود حالات کے لیے ان ہی کی شکر گزار ہوں۔ تمہیں انہوں نے دنیا کے سرد وگرم سے بچا بچا کر پالا ہے۔ یہ میرے حق میں فرشتۂ رحمت ہیں بیٹے یہ نہ ہوتیں تو مخالفوں کے ہاتھوں مجھے خبر نہیں کیا کیا مصیبتیں جھیلنا پڑتیں۔"

آسیہ بیگم کہہ رہی تھی لیکن پھوپھی حنیفہ کی سماعت تک اُس کے یہ لفظ پہنچ نہیں سکتے تھے۔

"لو بیوی! اب میرے بچے کا انعام دلواؤ اسے! تم نے وعدہ کیا ہوا تھا کہ پاس ہو گا تو موٹر لے کر دو گی۔"

حنیفہ پھوپھی، طیب کا ہاتھ پکڑے ہوئے آسیہ کے قریب لے آئی اور تقاضہ کے انداز سے کہا۔ آسیہ نے ہاتھ کے اشارہ سے اُسے یقین دلایا۔ کہ ضرور اور جلد وعدہ پورا کیا جائے گا۔

"چچا کے ہاں بھی گئے ہو یا نہیں؟"

پھوپھی حنیفہ کو جیسے یکایک کچھ یاد آگیا۔

"اے ہاں عقیقہ اور عائشہ تو راہ تک رہی ہوں گی۔" آسیہ بیگم کو جیسے یکدم کچھ یاد آگیا۔

،، بھائی فیاض جو بتا دے گا انہیں اب میں گھر گھر جا کر خود بتاتا پھروں؟ باجی اور آپی کو خود آنا چاہیئے آپ کو مبارکباد دینے کے لئے:

طیب چڑ گیا۔ اس کے چہرے سے جیسے ساری خوشی مفقود ہو گئی۔ اس کی پیشانی پر شکن پڑ گئے۔ جب سے اُسے معلوم ہوا تھا۔ کہ سعدیہ اس کی منسوبہ ہے وہ چچا کے گھرانے سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا بہنوں کو ملنے کے لئے بھی بہت کم جایا کرتا۔ عتیقہ اور عائشہ کی شادی اعجاز کے دونوں بڑے لڑکوں ایاز اور فیاض سے ہو چکی تھی۔ دونوں کی شادی ایک ہی دن ہوئی تھی دس سال ہونے کو آئے تھے مگر کوئی ناخوشگوار واقع نہ ہوا، صدیقہ سے سب کو خدشہ تھا لیکن وہ توقع سے کہیں بڑھ کر مہربان ساس ثابت ہوئی اپنی بہوؤں اور اُن کے بچوں سے اُسے دلی اُنس ہو گیا تھا۔ اس اُنس میں خلوص تو ان نیک سرشت ماں کی نیک نہاد بچیوں نے پیدا کر لیا تھا۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے تقاضوں کو انہوں نے کبھی اہمیت دے کر ماں سے بیان نہ کیا تھا۔ آپس کے معمولی اختلافات کو نزع کا رنگ دے کر باہمی تنازعہ کا موجب نہ بنایا تھا۔ عائشہ کی طبیعت اگرچہ کچھ تیز اور پُرجوش تھی مگر عتیقہ بردبار اور متحمل تھی کبھی کوئی ایسا موقعہ آجاتا تو فوراً معاملہ پر قابو پا لیتی اور بہن کو ڈانٹ ڈپٹ کر دیا لیتی تو معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔ اس طرح آج تک نہ صدیقہ کو ان سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تھی نہ ہی کبھی صدیقہ اور آسیہ کی اس بنا پر کشیدگی کی نوبت آئی تھی۔ سعدیہ ان دونوں بھاوجوں سے عمر میں بہت چھوٹی تھی، اسی لیے اپنی شوخ اور چنچل طبیعت کے باوجود بھی ان سے دبتی اور لحاظ کرتی تھی کیونکہ وہ دونوں ہی اسے دل سے چاہتی اور پیار کرتی تھیں۔ عتیقہ اُس کی طبیعت کو رفتہ رفتہ اپنے رنگ پر لا رہی تھی تاکہ یہ لاڈلی لڑکی اُس کی ماں کے لیے پریشانی کا موجب بننے کی بجائے اس کی ضعیفی میں ایک ہمدرد اور خدمت گزار بہو بنے۔ وہ اس وقت پندرہ برس کی حسین دوشیزہ تھی اور دسویں جماعت

میں پڑ رہی تھی۔ اور اُس کے عالی دماغ منسوب طبیب نے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ایف۔ اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔

آسیہ بیگم نے سمدھیانے میں بھیجنے کے لیے خاص طور پر عمدہ شیرینی تیار کرائی اور بیٹے کو خود لے کر جانے کے واسطے مجبور کر رہی تھیں کہ عین اس وقت ہی دروازہ پر کار ٹھہرنے کی آواز آئی۔

"لیجئے وہ لوگ خود ہی آ گئے۔ اب میری جان بخشی کیجئے۔ اور کچھ کھانے کو دلوائیے اچھے پاس ہوئے کہ شکرانے میں روزہ ہی رکھوا دیا گیا ہمیں ۔۔۔! رحیمن بوا! آج کھانا نہیں ملے گا کیا؟"

اس نے پہلے ماں سے مخاطب ہو کر کہا اتنے ہی میں رحیمن جو سامنے نظر آئی تو اُس نے روئے سخن براہ راست اُس کی طرف کر دیا۔

"اے میاں! صدقہ ہو جاؤں شوق سے کھاؤ۔ کھانا تو کب سے تیار رکھا ہے عامرہ بی بی آج آپ کی خاص مدارات پر تُلی ہیں آپ کے لیے اپنے ہاتھ سے مٹر پلاؤ اور شامی کباب بنا رہی ہیں۔" رحیمن ہنس کر کہنے لگی۔

"ہاں میرا خیال بھی یہی ہے۔ تمہاری چچی آئی ہیں ——"

آسیہ بیگم متوقع نگاہوں سے ڈیوڑھی کے دروازہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"شاید پردہ ہو گا۔ میں تو مردانہ میں چلا کھانا جلدی بھیج دیجئے گا۔" وہ قدم برداشتہ مردانہ ڈیوڑھی کی طرف چلا تو آسیہ بیگم ہنس کر بولی۔

"تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے تمہیں کسی سے پردہ ہے۔"

"مضمون واحد ہے!"

ماں کی بات کا جواب دیتے ہوئے اُس نے ہنس کر کہا اور چلا گیا اُس کے دوست ابھی تک اُن کے منتظر تھے باہر پہنچتے ہی پارٹی کا تقاضہ شروع ہوا، شور اور قہقہوں کی آوازیں اندر تک آ رہی تھیں۔

„رحیمن جاکر معلوم کرو کتنے لڑکے ہیں باہر، اور شانو سے کہو اسی کے مطابق کھانے کی میز باہر کے ڈرائنگ روم میں درست کرے۔"

آسیہ بیگم مہمانوں کی پذیرائی کے واسطے اٹھتے اٹھتے کہہ رہی تھی۔ اور اتنے ہی میں صدیقہ اور اس کے پیچھے پیچھے عتیقہ اور عائشہ اندر آئیں۔ دو خادمائیں ساتھ تھیں ایک عائشہ کی ننھی بچی کو گود میں لیے تھی۔ دوسری کے سر پر ایک بہت بڑا خوان تھا جس پر خوبصورت کامدانی خوان پوش ڈھکا ہوا تھا۔

„مبارک ہو بھابی جان!" صدیقہ نے آگے بڑھ آسیہ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

„تمہیں بھی مبارک ہو —— ارے تو کیا سعدیہ کو نہیں لائیں؟" آسیہ بیگم نے پوچھا تو صدیقہ ہنسنے لگی۔

„بہت کہا وہ آنے کو تیار ہی نہ ہوئی۔ اب تو سمجھدار ہو گئی ہے نا بہت شرماتی ہے!" صدیقہ کہنے لگی۔

„کہاں ہے طیب ——؟ عتیقہ پوچھنے لگی۔

„وہ شیرینی لے کر تمہارے ہاں جانے کو تیار تھا مگر چند لڑکے مہمان آئے ہوئے ہیں انہیں کھانے پر روک لیا ہے۔ عامر باورچی خانہ میں مصروف ہے —— اے عامی باہر آؤ دیکھو تو کون کون آیا ہے ——؟

وہ عامرہ سے اب تک یوں پیش آتی جیسے وہ ابھی تک چھوٹی سی بچی ہو۔ حالانکہ وہ تئیس سال کی ہو چکی تھی۔ اس کی چھوٹی پھوپھی کا بڑا بیٹا! اصغر جو اس کا منسوب تھا امریکہ سے واپس آنے والا تھا اور تین مہینے تک اس کی بھی شادی ہونے والی تھی۔ اصغر کی ماں رئیسہ بیگم راؤ نیاز کی چھوٹی بہن تھی اور جوانی کی عمر ہی میں اصغر اور صغیر دو کمسن بچوں کو چھوڑ کر چل بسی تھی۔ اس کا شوہر ایک صاحب ایثار شخص تھا اس نے اپنی عمر ان دو بچوں کے

لیئے وقف کردی اور دوبارہ شادی نہ کی۔ اس نے ان بچوں کو ماں کا پیار بھی دیا اور باپ کا تحفظ بھی۔ جب وہ بڑے ہوئے تو خود اُن کا دوست اور ہم مجلس بھی بنا انہیں اعلےٰ تعلیم دلائی اس وقت وہ دونوں بیٹوں کو لے کر امریکہ گیا ہوا تھا۔ اور اب جلد ہی وطن واپس آکر ان کی شادیاں کر کے اپنے ویران کدے کو ایک بار آباد دیکھنے کا متمنی تھا۔

عامرہ جلدی سے باہر آئی تھی اور دونوں بہنوں سے بغلگیر ہوئی اور خوان پر سے کپڑا ہٹاتے ہوئے بولی۔

"آہا! طیب کے لیے ہار بھی آئے ہیں امی! دیکھیے! ہمیں اس کا خیال ہی نہ آیا۔ کہ ہار بھی پہنانے چاہیں! اور چچی جان ہیں۔ کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز نہیں کرتیں۔" وہ ہنس کر کہہ رہی تھی۔

"ہم کب سے پہنچ گئے ہوتے۔ یہ تو چچی امیّ کے ان ہاروں کی وجہ سے دیر ہوئی۔ چچا جان خود جا کر تازہ پھولوں کے ہار گندھوا کر لائے اور یہ کرن اور سلمے کے ہار فیاض خرید کر لایا۔" عتیقہ کہہ رہی تھی۔

"طیب کو بلوا تو دیجئے نا امی؟ وہ تو دوستوں ہی کا ہو کر رہ گیا باہر؟" عائشہ نے شکایت کے لہجہ میں کہا۔

"شانو جاؤ میاں سے کہو تھوڑی دیر کے لیے اندر چلے آئیں اور ہاں کہہ دینا پردہ نہیں ہے بلا تکلف چلے آئیں۔" آسیہ بیگم ہنس کر کہہ رہی تھی۔

"پردہ کیسا؟" عائشہ پوچھنے لگی۔

"اُسے خیال تھا کہ شاید سعدیہ ساتھ آئی ہوگی تو اُسے پردے کے لیے وقت نہ ہو۔ یہی کہتا ہوا باہر چلا گیا جس وقت باہر کار ٹھہرنے کی آواز آئی"۔

یہ سُن کر تینوں لڑکیاں اور صدیقہ، ہنسنے لگیں۔ اتنے ہی میں شانو باہر سے طیب کو بلا لایا۔ صدیقہ اُسے آتے دیکھ کر کمال جوشِ محبت سے اُٹھی۔

"بسم اللہ! چشم بد دور! ہزاری عمر ہو میرے بیٹے کی!"

امّی نے طیب کو ہار پہناتے ہوئے کہا اس کے بعد عتیقہ اور عائشہ نے بھی بھائی کو ہار پہنائے اتنے ہی میں اعجاز بھی آگیا اور مبارکباد دیتے ہوئے بھتیجے کو گلے لگالیا۔ ریاض کیمرہ لیے ہوئے ساتھ تھا۔ اُس نے سب کے ساتھ طیب کی تصویریں اتاریں۔ صدیقہ نے اپنے ہاتھ سے سب میں شیرینی تقسیم کی، ملازموں کو بخشش دی۔ طیب کو قیمتی تحفے دیئے۔ چچا نے داخلہ کا خرچ اور بی۔ اے کی بیش قیمت کتابیں خود خرید کر دینے کا وعدہ کیا لیکن بایں ہمہ طیب کچھ بجھا بجھا سا نظر آرہا تھا۔ ان لوگوں کے آجانے سے اُس کی رُوحِ مسرت جیسے مرجھا گئی تھی۔ چچا کے کنبہ سے اُسے ابتدا ہی سے لگاؤ نہ تھا۔ حتیٰ کہ جب سے اس کی بہنیں اس کنبہ میں بیاہ کر گئی تھیں اسے اُن سے بھی محض رسمی سا تعلق رہ گیا۔ اور وہ پہلی سی موانست کا احساس نہ رہا۔ جب سے اُسے یہ معلوم ہوا کہ ماں نے سعدیہ سے اُس کی زندگی وابستہ کر رکھی ہے۔ اُسے ایک گھٹن کا احساس ہونے لگا جیسے کسی نے اس کے گلے میں پھندا ڈال رکھا ہو۔ اس لڑکے کو اپنے صاف اور بے کدورت دل کے شفاف اور مصفا آئینہ میں ان لوگوں کی ہستی کی جو پرچھائیاں نظر آتی تھیں وہ ان کی ظاہری صورتوں سے مختلف اور مسخ شدہ تھیں۔ کیونکہ وہ ظاہرداری کے نظر فریب خول سے معرا اور حقیقت کا صحیح عکس تھیں۔ اور ان کے ظاہر و باطن کے اس کریہہ اور خودغرضانہ تفاوت نے ہی طیب کو متاثر کر رکھا تھا۔ اگرچہ وہ اس حقیقت سے واقف نہ تھا کہ اس کی اور سعدیہ کی نسبت کسی خاص اجارہ کے پیشِ نظر ہوئی ہے۔ نہ ہی کبھی کسی نے اس پر یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کی ماں نے اس کی زندگی خریدنے کے لیئے اُس املاک کی ایک معنوی دستاویز کی صورت میں، جو اس کی ہستی سے وابستہ تھی۔ اسے خردسالی ہی میں چچا کی تحویل میں دے دیا تھا۔ اور چچا نے حصولِ مقصد کا یہ ایک محفوظ ذریعہ خیال کرتے ہوئے اسے قبول کر لیا تھا —— اس رشتہ کی بنیاد

کسی باہمی تعلقِ خاطر پر استوار نہ ہوئی تھی بلکہ دنیا سازی اور خود غرضی اس کی محرک تھی۔ لیکن ان سب بنیادی وجوہ سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی کوئی نامعلوم احساس اُن لوگوں کی طرف سے اسے بدظن کیئے ہوئے تھا اور وہ کبھی بھی چچا کے گھر والوں سے گھل مل نہ سکا صدیقہ کو اس کا یہ اجتناب یہ روکھا پن کھٹکتا تو ضرور تھا مگر وہ ان لوگوں میں سے تھی جو "آم کھانے سے غرض رکھتے ہیں پیڑ گننے پر توجہ نہیں کرتے"۔ وہ مطمئن تھی کہ آسیہ بیگم کا بیشتر اندوختہ وہ اس کی دونوں لڑکیوں کے ساتھ اپنے گھر میں لے آئی ہے اب راؤ نیاز کی املاک خود اپنی بیٹی سعدیہ کے ذریعہ سے اس کے تصرف میں آجائے گی۔ طیب کے اخلاص و محبت کی وہ خواہاں نہ تھی اُسے تو اُس کی دولت سے غرض تھی۔ اور وہ ظاہر داری کا نقاب اوڑھے دنیا داری کے تمام کردار نہایت خوبی سے نبھا رہی تھی۔ کہ بادی النظر میں اس کی نیت پر کسی کو شبہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ آسیہ بیگم بھی مطمئن تھی۔ صرف طیب ہی تھا جو اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکا، اور وہ بھی اس کی اصلی وجہ یہ خیال کرتا تھا۔ کہ اس کے دل کا مکیں کوئی اور تھا۔ اور وہ اپنی زندگی کے اس فیصلہ کو بزرگوں کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا تھا۔ وہ وقت گزر چکا تھا جب اس قسم کے فیصلے حتمی اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ بزرگ اپنی زبان پر اٹل رہنے کے لئے محبت اور شفقت تک کو پاسِ عہد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر چٹان کی مانند بے حس بن جاتے۔ اور خود بارہا اُن کی ضد پر اپنی زندگی کی خوشیاں تیاگ دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ مگر اب تو تہذیبِ نو کی خیرہ کُن روشنی نے پرانے نظریوں کو تاریک پس منظر میں دھکیل دیا تھا۔ آزادی نے انسان کو نئے حقائق سے روشناس کراتے ہوئے اُس کے پیدائشی حقوق تفویض کر دیئے تھے۔ کارزارِ حیات میں اب نئی قدریں کارفرما تھیں۔ اس بیس سال کے عرصہ میں دُنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی نئی تہذیب کی دوڑ میں "مشرق" کم از کم انفرادی آزادی کے مرحلہ پر "مغرب"

سے کہیں آگے نکل گیا! ایک انقلاب عظیم نے زندگی کی بساط کو کچھ اسطرح پلٹا کہ مشرق کی اونچی اور پُر تقدس چہار دیواریوں نے اپنی مقدس امانت کو سرِ راہ اُگل دیا! مغرب کی پُر تجسس اور مرعوب نگاہیں جو ان ناقابلِ عبور چہار دیواریوں سے ٹکرا کر ناکام پلٹ آتی تھیں اور ان کے عقب میں مستور "مشرقی حرم" انہیں پُر اسرار۔ اور تحیر زا معلوم ہوتے تھے۔ اب اُن کے لیے وہی حرم اور ان کا اسرار وانکشاف ہو چکا تھا۔ مشرق کی بیٹیاں نہایت طمطراق کے ساتھ اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئی تھیں جس صنفِ مخالف کو وہ کبھی دیکھنے کے واسطے نہ ملی تھیں اب زندگی کی ہر منزل میں وہ اُس کے دوش بدوش، پہلو بہ پہلو گامزن اور رواں دواں نظر آنے لگیں۔ دورِ آزادی کے اس رُخ نے دنیا ہی بدل دی۔ معاشرہ ایک نئے ڈگر پر چلنے لگا۔ رسم و رواج نے نئی کروٹ بدلی۔ نوجوان طبقے نے رفقائے حیات کے انتخاب کا حق بزرگوں کے ہاتھ سے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور زندگی کے اس نازک مسئلہ کو نہایت آسان اور سہل خیال کرنے لگے۔

(۱۱)

طیّب نہایت سنجیدہ اور باوقار نوجوان تھا اگرچہ اس نے حلقۂ احباب کو زیادہ وسعت دینے کی کبھی کوشش نہ کی اور اسے چند بلند کردار اور سنجیدہ مزاج دوستوں تک ہی محدود رکھا مگر اس کے باوصف وہ اپنے کالج میں ہر دلعزیز تھا۔ ہر طالب علم اس کے ساتھ دوستانہ مراسم پیدا کرنے کا مشتاق تھا اس کے دوست اُس کی رفاقت کو باعثِ فخر خیال کرتے تھے. اُستاد اس کی اعلےٰ صلاحیتوں کے معترف تھے۔

وہ ایف اے کے دوسرے سال میں تھا کہ وفا درانی سے اس کی واقفیت ہوئی وفا کے والد کا تبادلہ راولپنڈی سے اس جگہ ہوا تو وہ اس کالج میں داخل ہو گئی، اتفاق سے اس کے مضامین بھی وہی تھے جو طیّب کے تھے۔ وہ اچھی لائق اور ذہین طالبہ تھی تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اپنی غیر معمولی قابلیت کے باعث اپنی پوری جماعت پر چھا گئی اور اساتذہ کی توجہ و تحسین کی مستحق بن گئی۔ اس کی عادات و خصائل بھی پسندیدہ تھیں اور حُسنِ صورت کے لحاظ سے بھی خاصی پُرکشش تھی۔ طیّب کو اس کے بلند کردار کی یہ خصوصیت سب سے زیادہ دلپذیر محسوس ہوئی کہ دوسری طالبات کی طرح اظہارِ خیال میں جھجک

اور شرم کا مظاہرہ نہ کرتی تھی۔ اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں بات کرتی۔ باہمی گفتگو کے دوران بھی کبھی بے صبری یا عجلت کا اظہار نہ کرتی۔ نہایت توجہ اور تحمل سے دُوسرے کی بات کو پوری طرح سُننے کے بعد چند ثانیے اس پر غور کرتی اور پھر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیتی۔ اس لمحے اس کی غزالیں آنکھوں کا وہ اندازِ تفکر بے حد دلنشیں معلوم ہوتا۔ پھر اس کی مسکراہٹ اس کے دلکش چہرے کی سب سے بڑی کشش تھی۔ خوبصورت پیشانی پر روشن دماغی اور ذہانت کی چمک اور جلا تھی۔

طیب اس واقعہ کو کبھی فراموش نہ کر سکا اور وہ دن اس کی زندگی کا ایک یادگار دن قرار پا چکا تھا جب حُسنِ اتفاق سے پہلی مرتبہ وفا نے طیب کو مخاطب کیا۔ "فائنل ٹیسٹ" ہو رہے تھے لکھتے لکھتے ناگاہ طیب کے ہاتھ سے قلم گر پڑا۔

"افوہ!" بے ساختہ اس کے مُنہ سے نکلا تو اس کے دائیں ہاتھ کی قطار میں بیٹھی ہوئی وفا کی نگاہ بے اختیار اُس کی طرف اُٹھ گئی اُس کے قلم کی نِب ٹوٹ گئی تھی اور وہ مایوسی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی تو وفا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اس نے اشارہ ہی سے اُسے اپنا دُوسرا پین پیش کیا اور ساتھ ہی اُٹھ کر سپرانٹنڈنٹ ٹیچر سے اجازت حاصل کر کے پین اسے دے دیا اس کے بعد دونوں پوری محویت سے پرچہ حل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ طیب لِکھنے کے دوران جب بھی نگاہ اُٹھا کر دیکھتا وہ اپنے کاغذات پر جھکی ہوئی نہایت روانی سے قلم برداشتہ لکھ رہی ہوتی۔ آخر پرچہ ختم ہوا اور طلباء کمرۂ امتحان سے آ گئے۔ طیب نے وفا کے قریب پہنچ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کا قلم واپس کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کی بروقت مدد نے آج مجھے بڑی اُلجھن سے بچا لیا ورنہ"

وہ اتنا ہی کہہ کر چُپ ہو گیا اور کچھ خفت کے انداز میں اپنے ہاتھ مَسلنے لگا۔

"ورنہ کیا ہوتا ___؟"

قریب ہی کھڑی ہوئی شوخ نظر روشن نے گردن ٹیڑھی کر کے طیب سے استفسار کیا۔

"کافی پریشانی ہوتی مجھے!" وہ سادگی سے کہنے لگا۔

"اتفاق سے میرے پاس دو پین تھے۔ ایک آپ کے کام آگیا نہ ہوتا تو آپ مسٹر لودھی سے کہتے وہ فوراً آپ کو دوسرا قلم مہیا کر کے دیتے۔ اس سے زیادہ کیا ہوتا؟" وفا نے مسکرا کر کہا۔

"بہر حال صاحب! میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔" طیب کہنے لگا۔

"ہاں ___! بھلا ان بیچاروں کو موقعہ مل ہی گیا ہے تو اب یہ مارے شکر گزاریوں کے تمہارا ناک میں دم نہ کر دیں تو سہی!"

روشن بول اٹھی طیب شرمسار جیسا ہو کر ہنسنے لگا۔

"یہ روشن بڑی شریر ہے، آپ اس کی باتوں کا کچھ خیال نہ کیجئے گا۔" وفا نے بھی ہنس کر اخلاقاً کہا۔

"جی ہاں! مسٹر نیاز! میری باتوں کا مطلق خیال نہ کیجئے گا ___! دوسرے معنوں میں آپ کو اجازت دی جا رہی ہے کہ ہر روز جب بھی موقعہ ملے۔ شکر گزاری کے اظہار سے کبھی نہ چوکیے گا!"

روشن نے تیز نظروں سے وفا کو گھورتے ہوئے طیب سے کہا۔ طیب کا پورا نام راؤ طیب نیاز تھا اور عموماً کالج میں لوگ اسے راؤ نیاز یا مسٹر نیاز کہہ کر پکارتے تھے، چند قریبی اور بے تکلف دوست اس کے اصلی نام یعنی طیب سے مخاطب کرتے۔

"فضول باتیں نہیں کیا کرتے روشن! مذاق میں تو تم بعض اوقات حد سے گزر

جاتی ہو، شکر گزاری کی ایسی ہی کونسی بات ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا سب کا فرض ہے اگر میری بجائے تم ہوتیں تو کیا ایسا ہی نہ کرتیں؟" وفا نے حسبِ عادت دھیمے لہجہ میں کہا۔

"ہوتی کیا معنی! تھی تو سہی میں ——! اور میرے پاس ایک چھوڑ دو فالتو قلم بھی تھے مگر اسی خیال سے کہ ان بیچارے لڑکوں کی مدد کر بیٹھو تو پھر یہ مارے شکر گزاری کے نڈھال اور بے حال ہوتے ہوتے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ میں نے سوچا بس عافیت اسی میں ہے روشن آرا بیگم! کہ چپکی بیٹھی رہو اور ہرگز کسی کی ہمدردی کا دم نہ بھرو!" وہ آنکھیں پھاڑے ہوئے کہہ رہی تھی۔

طیّب کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔

"معاف کیجئے بڑی خود غرض ہیں آپ!"

"جی ہاں چلیے خود غرض ہی کہہ لیجئے۔ بہرکیف مجھے اپنی عافیت درکار ہے۔ ورنہ اس وقت آپ کی شکر گزاری جھاڑ کا کانٹا بن کر وفا کی بجائے مجھے چمٹی ہوئی ہوتی ——!"

روشن کی اس بات پر وفا اور طیّب دونوں ہنس پڑے۔ روشن کی بذلہ سنج طبیعت سے سب ہی واقف تھے اسی لیے اس کی باتوں کو سنجیدگی کا رنگ نہ دیتے تھے۔ وہ تو پروفیسروں تک سے بعض اوقات ایسی بات کہہ دیتی تھی کہ وہ بیچارے ہنس دیتے اور برا نہیں مانتے تھے۔ کیونکہ اس لڑکی کے دل میں برائی نہ تھی اسی لیے اس کی تلخ باتیں بھی اپنے اندر خلوص کی حلاوت لیے ہوئے ہوتی تھیں۔

"تو یہ ہے روشن! خدا بچائے تم سے! جھاڑ کا کانٹا بن کر تو خود تم اس وقت بیچارے نیاز صاحب کے دامنگیر ہو گئی ہو!" وفا نے ہنس کر کہا۔

"اچھا تو یہ بات ہے؟"

روشن نے اپنی شوخ چمکیلی آنکھوں میں انتہائی شرارت بھر کر اور پوری پوری آنکھیں پھاڑ کر وفا کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بُری عادت ہے روشن! بہک نہ جایا کرو۔ مذاق بھی اپنی ایک خاص حد رکھتا ہے؟"

وفا نے اپنی سہیلی کی طرف ملامت کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ لیکن اس کے دلفریب چہرے کے نقوش کو نہ تو خشونت نے بگاڑا نہ غصّے نے متاثر کیا صرف اُن سیاہ موٹی موٹی آنکھوں میں شکایت اور ملامت کا تاثر ظاہر تھا

کتنا ٹھہراؤ تھا اس لڑکی کے مزاج میں!

"اچھا خدا حافظ!"

طیب نے اس موقعہ پر اس منظر سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھتے ہوئے مسکرا کر دونوں لڑکیوں کو سر کے خفیف جیسے خم سے تعظیم دی اور قدم برداشتہ ایک طرف چل دیا۔ اُس دن اسے پہلی مرتبہ وفا کو قریب سے دیکھنے اور اس سے مخاطب ہو کر بات کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ اب تعارف ہو ہی گیا تو اکثر آمنا سامنا ہوتے پر "سلام۔ سلام" اور مزاج پرسی کا اتفاق ہونے لگا۔ کبھی کبھی دو چار باتیں بھی ہو جاتیں۔ جب سالانہ امتحان ختم ہو گئے اور نتائج کا اعلان ہوتے تک ایف۔ اے کے طلباء کالج سے رخصت ہو گئے تو طیب کو محسوس ہوا کہ وفا سے اُس کا تعلق خاطر محض ایک اچھی ہم جماعت ہونے تک ہی محدود نہ تھا جیسا کہ وہ ابھی تک خیال کرتا رہا تھا بلکہ وہ خوش ادا اور خوش اخلاق دوشیزہ اس کے دل کی انتہائی گہرائیوں میں بس چکی تھی۔ وہ ہر وقت اُسے یاد آتی ہر گھڑی اس کے تصور میں موجود رہتی۔ اور بارہا اُسے دیکھنے کی تمنا اسے بے چین کر دیتی۔ کسی دن تو وہ بے مقصد ہی گھر سے نکل کر کالج پہنچ جاتا کہ شاید وہ بھی کسی کام سے کالج آئے۔ مگر اُسے مایوس اور بددل ہو کر واپس آنا پڑتا۔ وہ کبھی اُسے کہیں نظر نہ آئی۔

پھر ایک دن حسنِ اتفاق سے اُسے ایرپورٹ پر روشن مل گئی۔ وفا کی سہیلی کو دیکھ کر ہی طیب کے بجھے ہوئے دل میں اُمیدوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ وہ لپک کر اُس کے پاس پہنچا۔

"ہیلو مس روشن آرا! خیریت ہے؟" اس نے روشن کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"سب خیریت ہے! آپ سنائیے کیا کرتے ہیں آجکل؟" روشن بھی خوش ہو کر بولی۔

"بس سوائے انتظار کے اور کیا کیا جا سکتا ہے — اُمید و انتظار! بس یہی وقت گزارنے کا سہارا ہے!" وہ دو معنی انداز سے بولا۔

"اُمید و انتظار؟ خوب! بڑے شاعرانہ خیالات ہیں!" وہ ہنس کر کہنے لگی۔

"جی ہاں بس گھر میں بیکار پڑے پڑے شاعر ہی بننا پڑے گا اور کیا کیا جائے؟" وہ بھی ہنس کر بولا۔

"آج آپ کچھ بے جوڑ سی باتیں کر رہے ہیں؟ اور وہ امید و انتظار کا کیا ذکر تھا پہلے اُس کی تو وضاحت کیجیے؟" روشن کہہ رہی تھی۔

"کامیابی کی اُمید اور نتیجے کا انتظار!" طیب نے مختصر سا جواب دیا۔

"سبحان اللہ! آپ واقعی سچے اور خالصۃً طالب علم ہیں میں نے آپ کو خواہ مخواہ شاعر سمجھا!"

وہ کہنے لگی۔ اور دونوں ہنسنے لگے۔

"اس جگہ کیسے آنا ہوا کہیں جا رہی ہیں کیا؟" وہ پوچھنے لگا۔

"اگر — میں بھی آپ سے یہی سوال کرتی؟" وہ کہنے لگی۔

"تو میں صاف کہہ دیتا۔ کہ ایک دوست ڈھاکہ جا رہا تھا میں اُسے خدا حافظ کہنے کے واسطے آیا تھا۔"

طیب نے ہنس کر کہا اُسے روشن کی باتیں ہمیشہ دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔

"میری بھی ایک نہایت، عزیز دوست کراچی سے آرہی ہے۔ اُسی ہی چڑیل سے ملنے آئی ہوں اس قدر اُداس کر دیا ظالم نے مجھے تو!" وہ کہنے لگی۔

"خوب۔ تو چڑیل ہے آپ کی دوست؟" وہ ہنس کر پوچھنے لگا۔

"ہیں ___؛ میری وفا کی شان میں یہ گستاخی؛ ارے ۔ ؟ آپ جانتے تو ہیں وفا کو؟"

وہ یکدم چونک کر پوچھنے لگی جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔

"اچھا تو وفا آرہی ہیں؛ انہیں کے خیر مقدم کے واسطے آئی ہیں آپ؟" طیب حیران سا ہو کر پوچھنے لگا۔

"جی ہاں بالکل! آپ اس قدر حیران کیوں ہوئے کیا یہ بات۔ ایسی ہی حیرت، انگیز ہے کہ وفا "بائے ایئر" کراچی سے آرہی ہے؛ اگر آپ اُسے ابھی ابھی چڑیل نہ کہہ چکے ہوتے تو میں اس سے یہی کہتی کہ آپ بھی میرے ساتھ اسے ریسیو کرنے آئے ہیں ۔ !"

وہ شرارت بھری نظروں سے طیب کے تمتماتے ہوئے چہرے کو گھورتے ہوئے کہنے لگی۔

"معاذ اللہ! یہ میں نے کب کہا ___؛ آپ خود ہی تو فرما رہی تھیں مجھے کیا خبر کہ آپ وفا کے متعلق یوں کہہ رہی ہیں"۔ طیب نے اور بھی گھبرا کر کہا۔

"لو اب میرا نام لگانے گے ___!" وہ چمک کر بولی۔

"خیر چھوڑیئے اس بات کو غلطی ہوئی معاف کر دیجئے!" وہ ہنس کر لجاجت سے کہنے لگا۔

"میں خوشامد سے متاثر ہونے والی نہیں ہوں مسٹر ___! اور پھر مجھے کہا تھا

تو معاف بھی کر دیتی۔"

روشن نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔ طیب ہنسنے لگا۔

"آپ کی وہی عادت رہی ——!"

اس سے اور کچھ بن نہ پڑا تو اتنا ہی کہہ کر ہنس دیا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"خیر اس وقت تو چھوڑیئے اس بات کو —— بس پانچ ہی منٹ میں "۳۰۲" ایئر پورٹ پر اترنے والا ہے۔ کیا آپ کے دوست کا جہاز پرواز کر چکا ہے۔؟" وہ پوچھنے لگی۔

"جی ہاں —— ڈھاکہ کی فلائیٹ کے جانے کے بعد میں اندر آیا تو آپ کو دیکھا۔" طیب نے بتایا۔

وہ اب سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اناؤنسر کی آواز ہال میں گونج اٹھی وہ "۳۰۲" کی آمد کا اعلان کر رہی تھی آنے والے مسافروں کے لئے آئے ہوئے لوگ اشتیاق سے باہر کی طرف لپکے۔ جانے والے مسافروں کے احباب واقربا انہیں گلے مل مل کر "خدا حافظ" کہنے اور رخصت کرنے لگے۔ روشن اور طیب بھی باہر آ کر ریلنگ کے قریب کھڑے ہو گئے اور جہاز کو "رن وے" پر دوڑتے ہوئے دیکھنے لگے۔ چند ہی منٹ کے بعد وہ مستقر پر آ ٹھہرا سیڑھیاں لگا دی گئیں دروازے کھولے گئے اور مسافر اترنے لگے ان دونوں کی نگاہیں تجسس کے انداز سے لوگوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ وہ لوگ بھی اس ہجوم میں اپنے اپنے عزیزوں کے چہرے ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ اتنے ہی میں روشن نے طیب کا کندھا ہلا کر کہا۔

"وہ رہی میری وفا! وہ نیلی ساڑھی میں! آیئے ادھر چلتے ہیں! اس نے ہمیں ابھی تک نہیں دیکھا۔"

وہ ریلنگ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ اور وہ دونوں اس طرف چلے جہاں سے گزر کر مسافروں کو اندر ہال میں جانا تھا۔ وفا نے انہیں

دیکھ لیا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے رفتار ذرا تیز کر دی۔

"روشن! تم اکیلی آئی ہو۔ امی نہیں آئیں؟"

اس نے ریلنگ کے قریب پہنچتے پہنچتے کہا۔ اور سر کے اشارہ سے طیب کو بھی تعظیم دی۔

"اکیلی؟ دیکھتی نہیں ہو مسٹر نیاز آئے ہیں میرے ساتھ!"

روشن نے کہا اور ریلنگ کے آر پار تینوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"وہ تو — بہت بہت شکریہ! مگر میں پوچھ رہی تھی خیریت تو ہے امی کیوں نہیں آئیں؟ ان کی طبیعت تو اچھی تھی؟"

وہ متفکر جیسے انداز سے اپنی سہیلی کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"خالہ جان نے مجھے ٹیلیفون پر تمہارے آنے کے متعلق بتایا۔ میں نے کہا مجھے بھی ساتھ لے لیجئے گا ایرپورٹ پر جاتے ہوئے تو کہنے لگیں کہ زنانہ کلب کی میٹنگ ہے اگر بروقت فارغ ہو گئیں تو پہنچ جائیں گی ورنہ کار بھیج دیں گی۔ چنانچہ وہ فارغ نہ ہوئی ہوں گی کار بھیج دی تو میں تمہیں لینے کے واسطے آ گئی —— اور تم ایسی چڑیل ہو کہ ذرا بھی خوش نہیں ہوئیں مجھے —— یعنی ہمیں دیکھ کر!"

وہ خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ اور طیب "چڑیل" کے لفظ پر مسکرا دیا۔

"میں تو بے حد خوش ہوئی ہوں ——! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ ——"

وہ کچھ کہنے کو تھی کہ روشن جھٹ درمیان میں بول اٹھی۔

"یہ مسٹر نیاز ہی کہہ رہے تھے کہ —— بتا دوں؟"

کچھ کہتے کہتے رک کر وہ طیب کی طرف منہ پھیر کر زیر لب پوچھنے لگی۔

"خدا کے لیے بس روشن! کوئی ایسی ویسی بات نہ کہیے گا؟"

اس نے زیر لب، کہا۔ ذرا تجسس سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی،

آگے بڑھ گئی اور انہیں دوسرے بیرونی راستہ سے ہال میں آنے کے لئے اشارہ کیا۔ اور وہ بھی قدم برداشتہ اُسی طرف۔ چلے جس طرف سب لوگ گروہ در گروہ چلے جارہے تھے۔ اندر پہنچے تو وفا ان سے پہلے منتظر کھڑی تھی۔

"آپ کیسے ہیں مسٹر نیاز؟"

وہ صریحاً طیب کو روشن کے ساتھ دیکھ کر حیران تھی لیکن اس نے تعجب کا اظہار نہ کیا حسبِ عادت باوقار سنجیدگی سے اپنے ہم جماعت کی خیریت پوچھی۔

"بس ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیے ــــ!"

وہ صرف رسمی جیسے لفظ ہی ادا کر سکا۔ اس طرح اچانک۔ وفا کو اپنے سامنے پاکر وہ سٹپٹا سا گیا تھا اس کی رنگت گلگوں ہو رہی تھی۔ وفورِ شوق و مسرت سے آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہونٹوں سے تبسم پھوٹ رہا تھا۔

"ان کے سامنے تو وہ "اُمید و انتظار" والا شاعرانہ ذکر نہ چھیڑا اور بڑی شرافت سے کہہ دیا کہ بس ٹھیک ہوں۔!" روشن نے وفا کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"مس روشن کو تو ایک بات مل جائے گرفت کے لیے بس پھر معاف نہیں کرتیں!" طیب نے بے ساختہ ہنس کر کہا۔

"وہ قابلِ گرفت بات تو ابھی بتانا باقی ہے ـــ آپ ٹھہر تو جائیے" وہ دھمکانے کے انداز سے اُس کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ تو وہ سمجھ گیا۔

"مس روشن! للہ! باز رہیئے گا! آپ خود جانتی ہیں وہ میں نے نہیں آپ نے کہا تھا"

اس نے یک دم روشن کی طرف پلٹ کر زیرِ لب مگر نہایت عاجزانہ لہجہ میں کہا تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

"چلیئے اس وقت معاف کر دیا پھر کسی موقعہ پر سہی۔" وہ کہنے لگی۔

"شکریہ! یہ وقتی معافی ہی غنیمت ہے اس وقت!"

وہ ہنس کر کہنے لگا۔ در وفا کی طرف دیکھا وہ ان دونوں کی گفتگو کو نہ سمجھتے ہوئے بھی کچھ تجسس آمیز دلچسپی سے سُن رہی تھی۔

"مسٹر نیاز! آپ آج اس روشن کے ہتھے کیونکر چڑھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے یہ اس وقت تک آپ کو کافی تنگ کر چکی ہے۔" وفا نے بھی ہنس کر کہا۔

"یہ تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ میں انہیں ہتھیا کر اپنے ساتھ لیے پھرتی ہوں اور اس میں ان کی اپنی مرضی شامل نہیں؟"

اُس نے مواخذہ کے انداز سے کمر پر ہاتھ رکھ کر وفا کے سامنے ڈٹتے ہوئے کہا۔

طیب نے بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا وفا بھی بے ساختہ ہنسنے لگی۔

"کلمہ طیب صاحب! یہ آپ "لاحول" کس پر پڑھ رہے ہیں؟ میں کوئی شیطان تو نہیں ہوں ـــــ!"

اب تو جسارت کر کے طیب نے بھی کہہ دیا۔ روشن کے بے تکلفانہ انداز نے اس کی جھینپ کم کر دی تھی اور اب وہ بھی برابر کی چوٹ جواب دینے کے قابل ہو گیا تھا!

"ماشاء اللہ! چل نکلے ہیں اب تو!"

وہ جیسے تحسین کے انداز سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ پھر وفا کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"اس جگہ کب تک کھڑا رہنے کا ارادہ ہے؟"

"میرا سامان آجائے تو چلتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا۔ اور اتنے ہی میں پورٹر، ٹرالی پر چند سوٹ کیس لیے ہوئے آگیا۔ یہ تینوں باہر آئے وفا کی کار موجود تھی، ڈرائیور نے مودبانہ تعظیم دی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ طیب نے بدستور اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے انہیں خدا حافظ کہا لیکن روشن نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا کیا ارادہ ہے۔ کیا یہیں ایرپورٹ پر ڈیرہ ڈال دیا جائے گا؟"

"ابھی کوئی سواری مل جائے تو —— اور ہاں خوب یاد آیا آپ دونوں صاحبان مجھے اپنے رول نمبر تو بتا دیجئے گا —؟"

وہ اپنا پہلا فقرہ نامکمل ہی چھوڑ کر کچھ یاد آجانے سے یکدم موضوع بدل کر کہنے لگا۔

"کیوں — ؟ محکمہ میں کچھ "واقفیت" ہے کیا؟"

روشن نے فوراً اپنی آواز کو رازدارانہ انداز میں دھیما کر کے کہا تو طیب اس کے اس تمسخرانہ انداز پر بے ساختہ ہنس دیا۔

"میں نے تو اس خیال سے پوچھا تھا۔ کہ نتیجہ نکلنے پر آپ کی کامیابی کا علم ہو جائے گا۔ یہ اب معلوم ہوا۔ کہ محکمہ میں واقفیت پیدا کرنے کی ضرورت درپیش ہے!"

"ہوں — ! خیر دیکھا جائے گا —! آپ کو شہر چلنا ہے یا کہیں اور؟"

روشن موضوع بدل کر پھر پہلے ہی مضمون پر آگئی۔

"چلنا تو شہر ہی ہے اور کہاں جاؤں گا؟" وہ کہنے لگا۔

"تو آجائیے نا ہمارے ساتھ ہی ہم آپ کو گھر تک پہنچا آئیں گے!"

وفا نے نہایت لجاجت سے کہا تو وہ اس پیشکش کو ٹھکرا نہ سکا۔ اور آگے کی نشست پر بیٹھ گیا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔

"مگر ایک شرط ہے ـــــ آپ کو میرے ہاں اُترنا ہوگا تھوڑی دیر کے لئے!" وہ کہنے لگا۔

"اُونہہ! بعد از وقت شرط پیش کرنا بھی آپ ہی کا کام ہے بیٹھنے سے پہلے کہا ہوتا تو شاید ـــــــــ ہمیں ماننا پڑتا۔ کیوں؟" روشن کہنے لگی۔

"تو اب، گویا انکار ہے آپ کو میرے ہاں اُترنے سے؟" طبیب بدمزہ ہو کر پوچھ رہا تھا۔

"کیوں ـــ؟"

روشن نے پھر وفا ہی سے استفسار کیا۔ گویا اُسے بذاتِ خود انکار نہیں۔ یہ سُن کر وفا ہنسنے لگی۔

"اچھا سر دست آج تو آپ دونوں میرے ہاں چل رہے ہیں پھر کسی روز میں اور روشن آپ کے ہاں آئیں گے۔"

وفا نے فیصلہ کر دیا اور ساتھ ہی وعدہ کر لیا۔ دونوں باتیں طبیب کے لئے باعث مسرت اور وجہ تسلی تھیں۔ کس قدر غیر متوقع تھے یہ حالات۔ جو کسی ذاتی سعی کے بغیر محض اتفاق سے رونما ہو گئے۔

یہ لوگ گھر پہنچے تو ابھی تک وفا کی امی کلب کی میٹنگ سے فارغ ہو کر واپس نہ پہنچی تھیں اس لیے ڈرائیور ان کے واسطے کار لے گیا۔ روشن کا طرز عمل اور ہر بات میں بے تکلفانہ مداخلت اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کی یہاں بہت آمد و رفت اور بے تکلفی ہے ملازم اُسے گھر کے افراد کا درجہ دیتے تھے۔ وہ چند منٹ بیٹھ کر اندر چلی گئی۔ تو طبیب نے رُخصت چاہی۔

"اچھا مس وفا آپ سفر سے آئی ہیں تھکی ہوئی ہوں گی اب آپ آرام کیجئے میں چلتا ہوں۔" وہ کہنے لگا۔

"لیجئے! آپ چل دیئے تو وہ روشن آکر مجھ سے لڑے گی! وہ آپ

کے لیے چائے تیار کرنے گئی ہے ـــــ اور پھر ابھی تو آپ نے ہمارے رول نمبر بھی نہیں لیے۔"

وفا کہنے لگی۔ طیب نے ایک لمحہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وفا کو محض اپنی سہیلی کا پاسِ خاطر ہے یا وہ خود بھی اسے دیکھنے کی تمنائی ہے۔ لیکن اُسے اس معصوم جیسے چہرے پر سوائے جھجکی سی کے اور کوئی تاثر نظر نہ آیا۔ تاہم وہ اس پیشکش کو قبول کرنے پر مائل ہو گیا۔

"مجھے رول نمبر تو آپ لکھوا ہی دیجئے۔ آپ نے یاد نہ دلایا ہوتا تو میرے حافظہ سے بات ہی اُتر چکی تھی۔"

وہ اپنی نوٹ بک جیب سے نکالتے ہوئے بولا ـــــ وفا نے اپنا اور روشن کا رول نمبر لکھوایا۔

"اب خدا کرے کہ جب آپ گزٹ میں دیکھیں تو یہ رول نمبر بھی آپ کے ساتھ اُس میں موجود ہوں سہی ـــــ!" وفا نے ہنس کر کہا۔

"انشاءاللہ ضرور ہوں گے! آپ کے تو سارے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے اور اُمید کرنی چاہیئے کہ مس روشن کے بھی ضرور اچھے ہوئے ہوں گے۔ آخر آپ کی ہم نشین ہیں ضرور آپ ہی کی طرح لائق ہوں گی۔" وہ کہنے لگا۔

"آپ نے خود بخود کیونکر فرض کر لیا کہ میرے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"میں دیکھتا تھا۔ کہ سارا وقت خوب لکھتی تھیں۔ پھر بعد میں ابھی پرچے پر تبصرہ کا موقعہ ملتا تو آپ نہایت خوبی سے اظہارِ خیال کیا کرتیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ انشاءاللہ! امتیازی پوزیشن سے پاس ہوں گی۔"

وہ کہہ رہا تھا کہ روشن تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ارے — ! میں نے سوچا کوئی نجومی ادھر آنکلا ہے اور تم اُس سے اپنے نتیجہ کا زائچہ بنوا رہی ہو کہ یوں پختہ یقین کے ساتھ پیشنگوئی فرمائی جا رہی ہے"

— اچھا تو نیاز صاحب! آپ اس علم میں بھی دخل رکھتے ہیں؟ کچھ ہمارے متعلق بھی تو ارشاد فرمائیے؟" وہ سنجیدہ صورت بنائے کہہ رہی تھی۔

"آپ کے متعلق تو پہلے ہی پیشینگوئی ہو چکی ہے آپ، دونوں کا خانہ واحد ہے انشاءاللہ بہت اچھے نمبروں پر پاس ہوں گی" وہ ہنس کر کہنے لگا۔

"بھئی آپ کی زبان مبارک ہو۔ ایسی پیشینگوئی کے لیئے پیشگی منہ میٹھا کرانا چاہیئے"

اُس نے ٹرالی میں سے شیرینی کی پلیٹ اٹھا کر اُس کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔ نوجوان خادمہ نے بھی اس پُرمسرت منظر پر مسکراتے ہوئے چائے کی ٹرالی ان کی نشستوں کے قریب ٹھہرا دی۔ ہنسی خوشی چائے پی جانے لگی۔

خاصی دیر طیبؔ، وفا کے ہاں بیٹھا رہا۔ آخر رخصت چاہی اور نئی اُمنگوں کو دل میں بسائے ہوئے وہ وفا کے خوش فضا بنگلہ سے نکل کر گھر کی طرف، پاپیادہ ہی روانہ ہوا وہ اس عجیب و غریب اتفاقیہ ملاقات پر، بڑے سکون کے ساتھ نظرِ ثانی کرنا چاہتا تھا۔

— وہ دن اُس کی زندگی کا ایک نہایت اہم اور مبارک ترین دن تھا۔ اُس دن اُس کے تصوروں نے حقیقت کی طرف قدم اُٹھایا تھا۔ اور اس دن کو طیبؔ نے ہمیشہ اپنی زندگی کا یادگار دن قرار دیا —!

(۱۲)

بی۔ اے میں بھی طیب، وفا اور روشن اکٹھے ہی رہے۔ ان دو سالوں میں طیب اور وفا ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے۔ وفا کی امی بھی طیب کو بے حد چاہنے لگی تھی۔ روشن سے انہوں نے اس کے متعلق تفصیل پوچھی تو اُس نے یہی بتایا کہ وہ ایک بڑے متمول زمیندار کا بیٹا ہے اور باپ کی وسیع اراضی کا واحد مالک ہے۔ اس کے باوصف تعلیم کا دلدادہ اور شرافت کا مُرقّع ہے، بیگم درانی ایک آزاد خیال خاتون تھیں۔ عالمِ شباب ہی میں بیوہ ہوگئیں۔ صرف بچی محبوب شوہر کی یادگار ان کے پاس تھی اُنہوں نے اسے ہی زندگی گزارنے کا سہارا بنالیا۔

شوہر نے ان دونوں ماں بیٹی کے لیے کافی جائیداد چھوڑی تھی۔ ان کے اپنے والد ایک متمول رئیس تھے، بیوہ بیٹی کو برابر حصہ دیا تھا۔ اور اب بیگم درانی کے مالی حالات ان کی رئیسانہ زندگی کی کفالت کے واسطے نہایت سازگار تھے۔ اکلوتی بیٹی کو انہوں نے نازو نعم سے پرورش کیا۔ وہ اعلےٰ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اُس کی آمد و رفت کے واسطے کار موجود تھی۔ بیگم درانی اپنی حور شمائل بیٹی پر بجا طور پر نازاں تھیں۔ وہ جیسی خوبصورت تھی ویسی ہی خوب سیرت اور خوش اخلاق بھی تھی۔ انہیں اس پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ تھا۔ انھیں کسی وقت اس کے مستقبل کا خیال پریشان

کرتا اور وہ تمنا کیا کرتیں کہ ان کی ہمہ موصوف بیٹی کے لیے کوئی ایسا شریکِ حیات مل جائے جو اس کا پرستار اور قدردان ہو جو اسے ایسے ہی آرام و آسائش سے رکھ سکے جس کی وہ بچپن سے خوگر تھی۔ اور اب طیب کو دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئیں انہیں اپنی یہ تمنا بھی پوری ہوتی نظر آنے لگی۔ یہ شکیل اور وجیہہ نوجوان ہر پہلو سے ان کے معیار پر پورا اترا اور انہوں نے اسے بخوشی اپنے ہاں آنے جانے کی اجازت دے دی۔ انہیں اس پر بھی ایسے ہی اعتماد تھا جیسا کہ اپنی بیٹی پر۔ وہ دونوں اپنے اعلےٰ کردار اور بلند اخلاق کی بنا پر ہر گھٹیا لغزش سے بالاتر تھے۔

وہ بی۔ اے کے فائنل امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔ کہ روشن کے والد کا تبادلہ مشرقی پاکستان ہو گیا۔ روشن امتحان کے اختتام تک وفا کے ہاں ٹھہر گئی، یہ چار یا پانچ ماہ کا زمانہ طیب اور وفا کے لیے ناقابلِ فراموش تھا۔ روشن کی شوخی اور زندگی سے بھرپور شرارتیں، اِن کی محفلوں کی رُوحِ رواں تھیں اگرچہ اس سے متوقع جُدائی نے ان کی معصوم خوشیوں کو گہنا دیا اور وفا عموماً یہ سوچ کر اُداس ہو جاتی کہ عنقریب روشن غیر معین عرصہ کے لیے اس سے الگ ہونے والی ہے۔ مگر روشن یہ سوچنے کا بہت ہی کم موقعہ دیتی اور اسے ہنسی مذاق سے فوراً بہلا لیا کرتی۔

جب امتحان ختم ہو گئے تو روشن کے والد نے اُسے چاٹگام تک چلے آنے کے واسطے لکھا۔ خط پڑھ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش اور اُداس ہو گئی۔

„کیا بات ہے روشی ڈیر! تم چُپ کیوں رہ گئیں ——— وفا نے پوچھا۔

„کچھ نہیں ڈیڈی کا خط ہے ———!" اس نے لمبا سانس کھینچ کر جواب دیا۔

" طلبی کا پروانہ ہوگا ـــــــ کیوں ؟"

" طیب بھی کھیل سے ہاتھ روک کر بولا۔ اس وقت وہ تینوں کیرم کھیل رہے تھے۔

" جی ہاں ـــــــ ! آپ تو ہر بات ہی نجوم کا زائچہ لگا کر کرنے لگ گئے ـــــــ !"

روشن نے وفا کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتے دیکھ کر فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا تاکہ رنج کا ماحول پیدا نہ ہو۔

" دیکھوں کیا لکھا ہے ؟"

وفا نے اس کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھنا شروع کیا۔ طیب بھی اس کے کندھے پر جُھکا ہوا ساتھ ہی پڑھ رہا تھا۔ اور پڑھنے کے بعد دونوں چُپ کے چُپ رہ گئے۔

" ارے ! تم دونوں کو کیا ہوا ؟ تم تو یوں گُم سُم ہو گئے جیسے مجھے باپ کی طلبی کا خط نہیں بلکہ پھانسی کا حکم مِلا ہے ؟" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

" میں نے جو تمہیں کہا تھا کہ ایم۔ اے میں داخلہ لینے کی اجازت مانگو۔ اگر تم نے لکھا ہوتا تو اس خط میں خالو جان ضرور اس کے متعلق کچھ لکھتے۔" وفا نے روشن کی بات کو اَن سُنا کر کے اور خط کے مضمون سے متاثر ہو کر کہا۔

" ہاں روشی بہن ! تم نے لکھ دیا ہوتا شاید اُن کی سمجھ میں کچھ آ ہی جاتا۔ کیا تم خود بھی جانا ہی چاہتی ہو ؟" طیب نے بھی بُجھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

" یہ تو تم دونوں کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کہاں تک جانا چاہتی ہوں۔ وہ زہر خند کرتے ہوئے بولی۔

" تو پھر لکھا کیوں نہیں ؟" وفا نے پوچھا۔

"بھئی لکھا ہے میں نے! تم لوگ سُنتے تو! میرا خیال ہے یہ خط وہ لکھ چکے ہوں گے تو میرا وہ خط ملا ہو گا — طیب بھیا لگانا ذرا زائچہ کیا جواب آئے گا وہاں سے؟" وہ ہنس کر پوچھنے لگی۔

"میرا خون خشک ہو گیا اور تمہیں ہنسی سوجھی ہے؟" اس کا یہ مطلب سمجھو کہ تم خود بھی خوش ہو اور جانا ہی چاہتی ہو۔" وفا نے رنجیدہ لہجہ میں کہا۔

"میں نے تو اس خط میں رو رو کر ضد کی ہے۔ ڈیڈی کو اپنی جان کی قسمیں دے دے کر مجبور کیا ہے اس کا جواب آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں جانا چاہتی ہوں یا نہیں! ایسا الزام مجھ پر دے کر تم نے اچھا نہیں کیا وفا! تم بڑی بُری ہو۔" اس نے روہانسی آواز بنا کر کہا۔

"کیا سچ مچ تم نے ایسا ہی لکھا ہے؟ پھر تو وہ ضرور مان جائیں گے تمہیں یہاں چھوڑنے کے واسطے؟" اب بھی وفا نے جیسے شُبہ کی نظروں سے روشن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر خدانخواستہ اس کے خلاف ہوا تو تم دونوں میری جان کو آجاؤ گے کہ میں نے مؤثر لفظوں میں اجازت نہ مانگی —! چنانچہ میں چاہتی ہوں خط کا جواب آتے آتے کوئی اور تدبیر بھی سوچ لی جائے!"

روشن ہنس کر بولی۔ اس کے اس موقعہ پر ہنسنے سے وفا جل جاتی تھی۔ اور اُسے بدگمانی ہوتی تھی کہ روشن بذاتِ خود بھی جانے ہی کو ترجیح دیتی ہے۔ اسی لئے وہ تیز نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی اور خاموش تھی۔

"مثلاً کیا تدبیر سوچی جائے؟" طیب نے سوال کیا۔

"مثلاً یہی کہ روشن ایک حادثہ میں — مگر نہیں ایسا لکھا تو وہ فوراً خود یہاں آ پہنچیں گے — ارے ہاں! خوب سُوجھی یوں کرو ڈیڈی کو لکھ دو کہ روشن نے اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے —! عمر، زید، بکر

کسی کا نام لکھ دو کہ اس کے ساتھ ہمارے ہاں سے چلی گئی ہے! بس پھر تمام زندگی مجھے تم سے کوئی جدا نہ کر سکے گا۔ حتیٰ کہ تم خود مجھ سے تنگ آجاؤ گے مگر میں تمہاری جان نہ چھوڑوں گی۔ !“

روشن نے تدبیر بتائی۔ جسے سن کر طیب ہنسنے لگا۔ مگر وفا سنجیدہ ہو گئی۔

”پھٹکار ہے ایسی تدبیر پر! بے غیرت نہ ہو تو۔ کتنی بے حیائی سے بکواس کر رہی ہے ——؟“ وفا نے غصہ اور ملامت بھری نظروں سے روشن کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لو دیکھ لیا طیب بھیا! ابھی سے اس قدر گالیاں دینا شروع کر دیا ہے وفا نے تو آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!“

روشن نے عجیب معصوم شکل بنا کر اور روہانسی آواز نکال کر کہا۔ کہ وفا تک کے لبوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں یہ تدبیر پسند نہیں؟ اس سے بڑی قربانی تو اور مجھ سے ہو نہیں سکتی۔ حادثہ کا لکھا تو ڈیڈی کے خوب چلے آنے کا خدشہ ہے —— تم ہی بتاؤ اور کیا صورت ہو سکتی ہے طیب بھیا!“

وہ اس قدر سنجیدگی سے کہہ رہی تھی کہ اب تو وفا اور طیب دونوں کو اس کی صورت، دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

”اتنا ہی رفاقت، کا دم بھرتے ہو تم دونوں تو ایک تدبیر اور ہے جس میں تمہاری کوشش اور قربانی درکار ہے ——؟“ روشن کہنے لگی۔

”بتاؤ —— ! ہم بدل و جان کوشش کرنے کو تیار ہیں!“ طیب نے جوش سے کہا۔

"ہوں ——— ! تم تو بدل و جان تیار ہو ہی جاؤ گے برخوردار! مگر تمہاری یہ ——— ؟"

روشن نے فقرہ پورا نہ کیا تھا کہ وفا نے اُسے ٹوکا۔

"کوئی ڈھنگ کی بات کیا کرو روشن! بیہودہ ہی بکتی نہ چلی جایا کرو!" وہ روشن کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"لو میں نے کون سی بے ڈھب بات کہہ دی ؟" وہ مسکین جیسی صورت بنا کر پوچھنے لگی۔

"خیر تم بتاؤ تو سہی وہ کیا تدبیر ہے جس میں ہماری کوشش درکار ہے ؟" طیب نے واقعی سنجیدگی سے پوچھا۔

"تم دونوں ایم۔ اے وغیرہ کا قصہ رہنے دو اور جلدی سے شادی کر ڈالو۔ پھر تم میرے ساتھ مشرقی پاکستان چلو ——— !"

روشن نے چٹکی بجاتے ہوئے اپنی نئی تدبیر پیش کر دی۔ جیسے نہایت ہی آسان بات ہو۔

"دیکھ لیا ؟ اس روشن کا دماغ خراب ہے یا نہیں ؟" وفا نے طیب کو مخاطب کر کے کہا۔

"خیر اس میں تو دماغ کی خرابی کی کوئی ایسی بات نہیں کہی اس نے !" طیب نے اس طرح کہا جیسے یہ تدبیر واقعی قابلِ عمل تھی۔

"دیکھا ؟ میں نہ کہتی تھی کہ تم تو مان جاؤ گے مگر ——— !"

روشن نے معنی خیز نظروں سے طیب کی طرف دیکھا اور وفا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"سیدھی سی بات کو پیچ و خم دے کر کہاں سے کہاں لے گئی۔ بڑی چالاک ہے یہ روشی! تم اسے نہیں سمجھتے طیب ! اصل بات یہی ہے کہ یہ ٹھہرنا نہیں چاہتی اور حیلے حوالے کر کے ہمیں ٹال رہی ہے !" وفا کہنے لگی۔

"خیر میرے خط کا جواب آ لینے دو! پھر تمہیں معلوم ہو گا۔ کہ میں نے کس کس طرح ہاتھ پیر جوڑ جوڑ کر ڈیڈی سے اجازت مانگی ہے۔" وہ عاجز آ کر کہنے لگی۔

"خط کیا ہو گا فلم ہو گی جس میں تم ہاتھ پیر جوڑتی ہوئی بھی نظر آ ؤ گی ڈیڈی کو!" وفا نے مسکرا کر کہا۔

"ہاتھ جوڑنا تو خیر ایک بات ہوئی، یہ پیر جوڑنے والا محاورہ آج ہی سُنا ہے!" طیب ہنس کر کہنے لگا۔

"آج میں نے کہا تم نے سُنا کل تم کہو گے کوئی اور سُنے گا اسی طرح یہ محاورہ چل نکلے گا ——! محاورے تو خیر بنتے ہی رہتے ہیں کوئی تدبیر بننا مشکل ہے اُس وقت سے مغز کاری کر رہے ہیں۔ کوئی بات ہی نہیں بن رہی۔" وہ مایوس ہو کر کہنے لگی۔

"خیر سر دست اُمید کرنی چاہیئے کہ تمہارے ڈیڈی مان جائیں گے اور ان کا جواب آنے تک ہمیں پُر اُمید رہنا چاہیئے۔" طیب کہنے لگا۔

"ہاں ——! دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے!" وفا نے مسکرا کر کہا۔

مگر یہ سب تدبیریں دھری ہی رہ گئیں اور آئندہ ہفتے روشن کے ڈیڈی بذاتِ خود آ کر اُسے ساتھ لے گئے۔ اُن کے سامنے کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ بات کرے، طیب کا منظر پر آنا ہی خلافِ مصلحت تھا۔ بحث و تکرار کرنا وفا جیسی کم گو لڑکی کی عادت میں داخل نہ تھا۔ البتہ بیگم درانی نے ان لوگوں کی وکالت میں مناسب طریقہ سے بہت کچھ کہا لیکن روشن کے والد نے نہایت مناسب الفاظ میں اپنی مجبوریوں کا ذکر کر کے انہیں خاموش کر دیا۔ اور روشن کو لے کر چلے گئے۔ تو جیسے گھر بھر سونا اور خاموش ہو کر رہ گیا —— وفا کئی دن تک اپنی اُداسی پر قابو نہ پا سکی۔ اس مرحلہ پر بیگم درانی نے اسے طیب کے ساتھ باہر تفریح کے واسطے جانے کی اجازت دے دی۔ کیونکہ وہ اپنے ذہن میں فیصلہ کر چکی تھیں کہ وہ انہیں رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیں گی اسی لئے انہیں یہ

بات کچھ قابلِ اعتراض محسوس نہ ہوئی۔ طیب کو اگرچہ شروع شروع میں کچھ اجتناب اور جھجک محسوس ہوئی لیکن وفا کی رفاقت کے خیال اور خوشی نے جلد ہی ہر خیال پر غلبہ پا لیا۔ وہ اُسے لے کر اکثر باہر جانے لگا۔ اگرچہ وہ ایک قدامت پسند گھرانے کا فرد تھا لیکن اس کی تعلیمی زندگی اسے تہذیب نو سے روشناس کرا چکی تھی۔ اور وہ نئی قدروں کے کئی ایسے پہلوؤں سے روشناس تھا جو اس کے گھر والوں کے لیے ہنوز اجنبی تھے۔

(۱۳)

"ذرا میری بات تو سنیے بھابی!"

عتیقہ نے قدرے تجسّس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اُٹھ کر اُس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اُسے فیاض کے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے آثار نظر آئے اور وہ دل ہی دل میں دُعا کرنے لگی کہ وہ کوئی خیریت کی خبر سُنائے وہ صحن کی پوری پوری لمبائی طے کر کے اپنے کمروں کی طرف جا رہا تھا عتیقہ بھی اس کے پیچھے لپکی چلی جا رہی تھی عجلت اور پریشانی سے قدم بہک رہے تھے چپل پیروں میں سے نکل نکل جاتے۔ کبھی گرتے گرتے بچتی کبھی دوپٹہ سنبھالتی وہ فیاض کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔

"بیٹھ جائیے!"

اس نے تولیہ سے پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔ عائشہ بھی شوہر کے چہرے پر اہمیت کے آثار دیکھ کر قریب چلی آئی۔

"کیا بات ہے؟"

وہ پریشان سی ہو کر کبھی بہن کی طرف دیکھتی کبھی فیاض کی طرف۔

"دیکھو ساتھ کے کسی کمرے میں کوئی چھوکری تو نہیں؟ یہ دروازہ بیچ میں سے

بند کر دو۔" اس نے بیوی سے کہا۔

"الٰہی خیر!"

عتیقہ نے زیرِ لب، کہا اور اس کا ہاتھ بے اختیار دھڑکتے ہوئے دل پر دب گیا۔ عائشہ دروازہ بند کر کے آئی اور فیاض کے قریب ہی پلنگ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے پھر پوچھا۔

"کیا بات ـــ ؟"

"آج [illegible] منظر دیکھنے میں آیا۔" اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا ـــ ؟" دونوں عورتیں یک زبان ہو کر بولیں۔

"مجھے ایک دوست نے چائے پر مدعو کر رکھا تھا۔ اُس کا مکان سینما ہاؤس کے بالمقابل ہے۔ ہم دونوں اُوپر کی منزل میں بالکنی پر بیٹھے تھے۔ اتنے ہی میں ایک کار سینما ہاؤس کے سامنے رُکی اور اُس میں سے طیب ایک لڑکی کو ساتھ لیے ہوئے نکلا اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے اندر چلے گئے۔ ڈرائیور نے کار باہر دوسری گاڑیوں کے ساتھ پارک کر دی۔ میں نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا ہے اب سراغ لگاؤں گا کہ یہ کس کی کار تھی اور وہ لڑکی کون ہے۔ اُسے یوں ایک آزاد بے پردہ لڑکی کے ساتھ دیکھ کر میرے تو حواس جاتے رہے حتیٰ کہ اُس دوست تک نے میری پریشانی کو محسوس کیا اور وجہ دریافت کی۔ میں نے اُسے عذر کر کے ٹال دیا اور جلدی ہی اُٹھ کر گھر چلا آیا ـــــ اب بتائیے کیا کرنا چاہیئے؟ امّی سے ذکر کیا تو وہ ایک دم مصیبت کھڑی کر دیں گی۔ کیا رائے ہے آپ دونوں کی۔؟"

دونوں عورتیں حیرانگی سے آنکھیں پھاڑے ہوئے یہ سارا بیان سُنتی رہیں باہر کی دُنیا اور اس کی ترقی یافتہ روش سے یکسر بیگانہ تھیں ان کے نزدیک کوئی بے پردہ اور باہر پھرنے والی عورت شریف اور بااخلاق نہیں ہو سکتی تھی۔

"پھر ــــ؟ اب کیا کیا جائے؟"

عتیقہ نے فیاض کی بات کا جواب دینے کی بجائے خود سوال کر دیا۔

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں!" اس نے عتیقہ کے زرد اور متغیر چہرے کی ط دیکھ کر کہا۔

"رے خیال، میں امی کے پاس چلیں اور انہیں سارا واقعہ سنائیں۔" عائشہ نے کہا۔

"ہاں ــــ اور ان سے کہیں کہ اب جلدی سے طیب کی شادی کر دیں۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ وہ بالکل ہی ہاتھ سے نکل جائے۔" عتیقہ نے دبی زبان سے کہا۔

"ہاتھ سے نکل جانے میں کسر ہی کون سی رہ گئی ہے وہ تو اس لڑکی کے ساتھ یوں بے تکلفی سے کار میں آیا جیسے اس کے گھر والوں کی رضامندی سے اس کے ساتھ سینما دیکھنے آیا ہو اگر وہ اس حد تک بداخلاق ہو چکا ہے تو شادی کا سوال ہی نہیں رہتا۔ بیچاری سیدھی سادھی معصوم لڑکی کو کنوئیں میں دھکیلنے سے رہے۔" فیاض نے تلخ لہجہ میں کہا۔

"چل کر اس سے پوچھنا تو چاہیئے کہ آخر اُس نے یہ کیا وطیرہ اختیار کیا ہے؟" عائشہ بولی۔

"ضرور پوچھو۔ مگر امی سے کیا کہہ کر اجازت لی جائے گی ــ؟" فیاض پوچھنے لگا۔

"میں کہہ دوں گی امی نے بلوا بھیجا ہے۔ واپسی پر کوئی عذر کر دیں گے۔" عتیقہ کہنے لگی۔

"جلدی کیجئے زیادہ دیر ہو گئی تو وہ منع کر دیں گی۔"

عائشہ بولی۔ عتیقہ جلدی سے اُٹھ کر چچی کے پاس آئی اور کہا کہ امی نے بلوا بھیجا ہے۔

”اس وقت ____؟ خدا کرے خیریت ہو۔ میں بھی چلوں تمہارے ساتھ؟“

صدیقہ نے کہا تو عتیقہ یک دم سٹپٹا گئی۔

”جی چچی جان آپ؟ نہیں آپ اس وقت کیوں تکلیف کریں گی۔ بس ہم لوگ ابھی واپس آتے ہیں۔ بچوں کو بھی چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“

اس نے کہا اور جلدی سے پلٹ آئی۔ وہ دونوں فیاض کے ساتھ آسیہ بیگم کے ہاں پہنچیں تو وہ مغرب کی نماز پڑھ چکی تھی۔ ناوقت ان لوگوں کو آتے دیکھ کر اور ان کے بجھے بجھے جیسے انداز پر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

”آؤ بسم اللہ! خیریت سے تو ہیں سب؟ کیسے آنا ہوا اس وقت؟“ آسیہ بیگم ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”طیب آ گیا ہے باہر سے؟“ عتیقہ پوچھنے لگی۔

”نہیں ____ کیوں؟“

آسیہ بیگم اور بھی پریشان ہو گئی۔

”ذرا اس طرف اندر آ جائیے۔“

فیاض مردانہ ڈرائینگ کی طرف چلا گیا۔

”کیا بات ہے بیٹی؟“ آسیہ بیگم نے گہرے تجسس سے عتیقہ کے منہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”فیاض بتائے گا۔ دادی جان کو خبر نہ ہو وہ اونچا سنتی ہیں خواہ مخواہ سب کے کانوں تک آواز پہنچے گی۔

عتیقہ نے جواب دیا۔ اور سب مردانہ ڈرائینگ روم میں آ بیٹھے۔ فیاض کے اشارہ پر عتیقہ نے ماں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ تو وہ یک دم حواس چھوڑ بیٹھی اور سر تھام لیا۔

"ہائے میری قسمت!" اس نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا اور چپ کی چپ رہ گئی۔

"امی جان! آپ اس پر سختی کریں۔ دیر تک بلاوجہ گھر سے باہر نہ جانے دیا کریں۔"

عائشہ کہنے لگی۔ مگر آسیہ بیگم کچھ نہ بولی اُسے تو جیسے سکتہ سا ہو گیا جس لڑکی سے بچپن میں وہ اُس کی نسبت ٹھہرا چکی تھی۔ اُس کا بھائی اُسے اپنی آنکھوں سے ایک غیر لڑکی کے ساتھ تفریح میں مصروف۔ دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ وہ اس کا داماد تھا مگر وہ اُس سے یہ توقع نہیں کر سکتی تھی۔ کہ وہ بہن کے مستقبل کو خطرے میں ڈال کر اس معاملہ کو اخفا میں رکھے گا۔

"امی! ہمیں اس معاملہ پر غور کر کے کچھ تدبیر کرنی چاہیئے۔ اگر آپ یوں حوصلہ ہار بیٹھیں گی تو کام اور بگڑ جائے گا۔" عائشہ کہنے لگی۔

"ہاں تو تائی امی! آپ یوں پریشان نہ ہوں بلکہ سوچ سمجھ کر کچھ بتایئے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔" فیاض نے کہا۔

"بیٹے میرا تو سن کر سر چکرا گیا۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ یہ میں طیب کے متعلق سن رہی ہوں جس کے اخلاق اور شرافت پر مجھے فخر تھا۔" آسیہ بیگم کی آواز مارے رقت کے رندھ گئی۔

"بے شک آپ کا رنج کرنا حق بجانب ہے۔ خود میرا اُس وقت جو حال ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔ واقعی طیب کے متعلق تو یوں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں حیران رہ گیا جب میں نے اُسے ایک بے پردہ لڑکی کے ساتھ یوں کھلے بندوں سینما جاتے ہوئے دیکھا یہ بہت بڑی جسارت ہے۔ اُسے ذرا خوف نہ آیا کہ اُسے کوئی دیکھ پائے گا تو کیا ہوگا؟" فیاض کہنے لگا۔

"یہی تو مجھے حیرت ہے!"

آسیہ بیگم نے پوری پوری آنکھیں کھولے ہونٹ پر انگلی رکھ کر انتہائی حیرت کا اظہار کیا۔

„آپ نے اُسے روپیہ پیسہ علی الحساب دینا شروع کر دیا اور یہی چیز ایک لڑکے کی خرابی کا باعث بن جاتی ہے۔" فیاض کہنے لگا۔

„ہرگز نہیں بس وہی مقررہ جیب خرچ دیتی ہوں۔ دس روپے بھی زیادہ مانگ لے تو سو بار پوچھتی ہوں کہ کیا ضرورت پیش آگئی میں نے اُسے کبھی وافر پیسہ نہیں دیا بھیّا!"

آسیہ بیگم اب ذرا ہوش و حواس سے اس معاملہ پر سوچنے کے قابل ہوئی تو علیقہ کو اطمینان ہوا ورنہ وہ تو ڈر گئی تھی کہ اس غیر متوقع خبر سے وہ کہیں بیمار ہی نہ پڑ جائے۔

„امی میں تو سوچتی ہوں کہ اب اس کی شادی کر دیں" وہ کہنے لگی۔

„شادی کوئی اس کی اصلاح کے لیے تسلی بخش ذریعہ تو نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اسے درست کرنے کی کوشش میں ایک معصوم لڑکی کے گلے عمر بھر کے لیے پھندا ڈال دیں۔ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا چاہیئے اور پھر سعدیہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ طیب کی عمر بھی ابھی شادی کے قابل نہیں۔ اُسے اپنی تعلیم ختم کر لینی چاہیئے تھی مگر وہ ابھی سے لڑکیوں کو ساتھ لیے پھرنے کے چکر میں پڑ گیا۔"

فیاض کی گفتگو، آسیہ بیگم کے خدشہ کے عین مطابق تھی اُس نے معنی خیز نگاہ سے دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھا۔

„بار ہا شادی کے بعد لڑکے سنبھل جاتے ہیں۔ کوئی لازمی تو نہیں کہ طیب کا اُس لڑکی کے ساتھ کوئی سنجیدہ تعلق ہو۔ آزاد خیال لڑکے لڑکیاں محض دوستوں کی طرح تفریح کے لیے چلے جاتے ہیں۔ ہو گی اس کی کلاس فیلو!" عائشہ نے اس واقعہ کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے کہا۔

"واہ جی وا! آپ تو گھر بیٹھے بیٹھے ماڈرن ہوگئیں! کہ لڑکیوں لڑکوں کا یوں باہم گھل مل جانا کہ وہ فلم تک دیکھنے ایک دوسرے کے ساتھ چلے جائیں، قابلِ اعتراض نہ رہا؟" فیاض نے طنز اور ملامت کی ملی جلی نگاہ سے اپنی شریکِ حیات کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اس میں میرے ماڈرن ہو جانے کا کیا ذکر ہے۔ آخر ہم لوگ بھی میٹرک تک اسکول میں پڑھی ہیں اور ماڈرن لڑکیوں سے ملنے جلنے کا موقعہ ملا ہے ان کی باتوں سے جو خیالات اخذ ہوئے وہی میں بیان کر رہی ہوں اور پھر اس کو بھی دس برس گزر چکے ہیں اس عرصہ میں دنیا اور بھی آگے بڑھ گئی ہوگی۔" عائشہ نے بحث کا انداز اختیار کر لیا۔

"پھٹکار ہے ایسی دُنیا اور اس کی ترقی پر!" آسیہ بیگم بولیں۔

"ہمارے پھٹکارنے پر زمانے کی رفتار بدل نہیں سکتی امی! ہم قدامت پسند لوگ اپنے پرانے رنگ ڈھنگ کو سنبھالے اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ وقت کے تقاضوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہی جائیں گے ہم انہیں آگے بڑھ جانے پر لعنت پھٹکار کریں گے اور بے حیائی کا طعنہ دیں گے تو وہ ہمیں پیچھے رہ جانے پر پس ماندہ اور غیر مہذب ہونے کا الزام دیں گے۔" عائشہ نے اپنی بحث کو دلیل کا رنگ دینے کی کوشش کی۔

"تو گویا تمہارے نزدیک اُن کی یہ روش عین قابلِ قبول اور مستحسن ہے؟"

فیاض کے لہجہ میں خشونت اُبھری۔

"یہ میں نے کب کہا کہ میرے نزدیک مستحسن ہے۔ میں اپنے خیالات ظاہر نہیں کر رہی بلکہ ایک حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ ہم اُسے اچھا کہیں یا بُرا سمجھیں، حقیقت اور واقعات اپنی جگہ موجود ہیں۔ یہ بحث جُداگانہ ہے کہ وہ اچھے ہیں یا بُرے؟" عائشہ نے شوہر کی طرف دیکھے بغیر محض ایک

عام جیسے طریقہ سے کہا۔

"اب ذرا اپنے خیالات بھی بتا ہی دو — تمہارے نزدیک وہ اچھے ہیں یا بُرے؟" فیاض نے پوچھا۔

"یہ تو انسان کی اپنی نیّت اور کردار پر منحصر ہے کہ وہ اچھی بات میں بُرا پہلو ڈھونڈھ لے یا بُری بات میں اچھا پہلو نکال لے۔" وہ کہنے لگی۔

"تمہارے بھیّا جو یوں کھُلے بندوں چھوکریوں کو ساتھ لیے پھرتے ہیں تو وہ عین راستی پر ہیں؟"

اب تو فیاض کی آواز میں دَبے ہوئے غصّے کی چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔

"آہستہ بولو فیاض! کسی نوکر چاکر کے کان میں بھنک پڑ گئی تو سارے میں ڈھنڈورا پٹ جائے گا۔" عتیقہ نے تنبیہ کے لیے فیاض کا بازو دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ نیا لڑکا شانو تو ویسے بھی بات کو لے اُڑتا ہے!" آسیہ بیگم کہنے لگی۔

"آپ کے صاحبزادے کو تو اپنی عزّت یا بے عزّتی کا خیال نہیں۔ ورنہ وہ کیا جانتے ہیں کہ سارے شہر کے لوگوں میں انھیں کوئی نہیں پہچانتا؟ یا لوگوں کی آنکھیں اور زبانیں بند ہیں کہ کوئی اُنہیں نہ دیکھتا ہے نہ اُن کے اس وطیرہ پر رائے زنی کر سکتا ہے؟"

فیاض نے آسیہ بیگم کو مخاطب کر کے بھی خاصے تلخ لہجہ میں کہا۔

اُسے خیال ہوا کہ ان لوگوں نے اس واقعہ کو اتنی اہمیت نہیں دی جس قدر دینی چاہیئے تھی۔ خصوصاً عائشہ پر اسے بے حد غصّہ آرہا تھا۔ چند لمحے کمرے میں خاموشی رہی۔

"یہ بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ کی پریشانی آگئی! میں کچھ سوچ رہی تھی یہاں

کچھ ہو گیا!" آسیہ بیگم سر تھام کر بولی۔

"طیب کو آ لینے دیں امی! اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں کہاں تک سنجیدہ ہے۔ اگر وہ محض دوستانہ طریقہ سے کسی لڑکی کے ساتھ چلا گیا تھا تو اُسے تنبیہہ کر دیں۔ کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔ ہمارے ہاں یہ باتیں روا نہیں رکھی جاتیں! بس وہ سمجھ جائے گا۔" عائشہ نے ماں کی پریشانی سے متاثر ہو کر اُسے تسلی دینے کو کہا۔

"میں تو بخدا ڈرنے لگا ہوں تمہارے ایسے خیالات سے! لڑکیوں کی ماں ہوتے ہوئے تم لڑکیوں اور لڑکوں کی باہمی دوستی میں کسی اچھے پہلو کی قائل ہو تو آئندہ چل کر ہمارے خاندان کی عزت و ناموس کا خدا حافظ!" وہ عائشہ کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آپ تو بس ہاتھ دھو کر میرے ہی پیچھے پڑ گئے —— ! میں نے یہ کب کہا۔ کہ میں قائل ہوں؛ میں تو زمانے کی روش کا ذکر کر رہی تھی اور یہ میں نے غلط نہیں کہا۔ کہ اپنی قدامت پسندی کے زیرِ اثر جو بات ہمیں نہایت معیوب اور قابلِ اعتراض نظر آئے گی۔ وہ ان کے لیے کسی برائی کی حامل نہیں اور ان کے معمول اور روزمرہ میں شامل ہے۔" عائشہ کہنے لگی۔

"چلو چھوڑو اس بحث کو! رہ رہ کر تم وہی بات کہتی ہو جس پر وہ تم سے اُلجھ رہا ہے۔ جن کے معمول اور روزمرہ میں شامل ہو گا، ہو گا۔ جب ہمارے ہاں ایسی باتیں روا نہیں رکھی جاتیں تو ہمارے گھر کا کوئی فرد کیوں اس معمول کو اپنائے؛" علیقہ نے بہن کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"اگر اپنائے گا تو بے راہ رَو اور بد اخلاق ہی کہا جائے گا اُسے ہمارے معاشرہ میں تو!" فیاض کہنے لگا۔

"اگر وہ واقعی اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات خیال نہ کرتا تو جس لڑکی کو لے کر وہ سینما جا سکتا ہے۔ اسی دوستانہ بے تکلفی کے ساتھ کبھی اُسے

اپنے گھر کی عورتوں سے ملاقات کے واسطے بھی لے آتا۔ ہم سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی ــــــ؟" عتیقہ کہنے لگی۔

"مجھے یاد آیا ــــــ! ایک دفعہ اس نے کہا تھا۔ کہ اُس کی دو کلاس فیلو لڑکیاں گھر آکر ہم لوگوں سے ملنا چاہتی ہیں تو میں نے اُسے ڈانٹ دیا تھا۔ کہ جماعت میں صرف لڑکوں سے میل جول رکھو۔ لڑکیوں سے تمہارا کیا واسطہ کہ انہیں گھر اُٹھا لاؤ! اس کے بعد اُس نے کبھی ذکر نہیں چھیڑا۔"

آسیہ بیگم یک دم کسی واقعہ کے یاد آجانے سے کہنے لگی۔ اتنے ہی میں باہر سکوٹر کی آواز آئی۔

"لو آگیا طیب ــــــ! فیاض بیٹا! کسی ایسی ترکیب سے بات کرو کہ وہ ڈر کر جھوٹ بولنے پر مجبور نہ ہو بلکہ حکمتِ عملی سے اصلیت معلوم کر لو ــــــ!"

آسیہ بیگم نے آواز کو رازدارانہ انداز سے دبا کر کہا، اور اتنے میں طیب اندر داخل ہوا۔ وہ عموماً زنانہ ڈیوڑھی کی طرف سے آیا کرتا تھا لیکن آج باہر کے ڈرائینگ روم میں روشنی دیکھ کر وہ اسی طرف سے اندر چلا آیا۔

"السلام علیکم! واہ وا! یہاں تو بڑے بڑے لوگ آئے بیٹھے ہیں!" اس نے کہا۔

"وعلیکم السلام! ہم تو بڑی دیر سے آئے ہوئے ہیں۔ جب بھی آؤ تم گھر سے غائب ہوتے ہو کہاں تھے اس وقت تک؟" عتیقہ نے اُٹھ کر اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"بس جب تک نتیجہ نہیں نکلتا وقت گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔" وہ ہنس کر کہنے لگا۔

"تو گویا وقت گزارتے پھر رہے ہو؟" فیاض نے پوچھا۔

"بس کچھ ایسا ہی سمجھ لیجئے۔" اس نے پھر ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"سناؤ پھر فلم کیسی رہی؟"

فیاض نے اچانک سوال کیا تو وہ چونک کر اُس کی طرف دیکھنے اور مسکرانے لگا۔

"بہت اچھی! آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں فلم دیکھ کر آ رہا ہوں؟"

وہ براو راست جیسے لہجہ میں پوچھنے لگا تینوں عورتوں کی نگاہیں اُس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھیں اور اس کے خیالات کا اندازہ کرنا چاہتی تھیں۔

"میں اپنے ایک دوست کے ہاں بیٹھا ہوا تھا جب تم سینما ہاؤس کے سامنے کار سے اُترے۔"

فیاض نے جیسے ایک عام سی بات کی۔

"اچھا اچھا — وہ جو ایڈووکیٹ ہیں؛ کیا نام ہے اُن کا؛ فرخ نہاد زیدی؟"

طیب نے اصل موضوع کو حذف کرنے کی کوشش کی مگر اس کے چہرے سے گھبراہٹ کے آثار ظاہر نہ ہوئے۔

"ہاں — تمہارے ساتھ وہ کون محترمہ تھیں؛ خاصی حسین اور طرح دار تھیں —!"

فیاض نے واقعہ کو جیسے مزاح کا رنگ دیتے ہوئے ہنس کر پوچھا باقی سب خاموش رہے اور بدستور اس کے چہرے کے مطالعہ میں مصروف۔

"سنتی ہو آپی! ان فیاض بھائی کی باتیں؛ یہ پرائی لڑکیوں کو گھورتے پھرتے ہیں!" طیب نے ہنس کر عائشہ سے کہا۔

"تم پرائی لڑکیوں کے ساتھ سینما جا سکتے ہو اور یہ دُور ہی دُور سے گھور بھی نہیں سکتے؟" عائشہ نے بھی ہنس کر کہا۔

"کیا فضول باتیں کر رہے ہو تم لوگ؛ امی کا لحاظ بھی جاتا رہا۔" عتیقہ نے

ڈانٹا۔

"مگر تھی کون وہ لڑکی ——؟" آسیہ بیگم نے قدرے تلخی سے پوچھا۔

"امی میری ایک کلاس فیلو ہے۔ بڑی اچھی لڑکی ہے میں نے تو آپ سے بارہا پوچھا اُسے گھر لانے کے لیئے۔ وہ بھی آپ سب سے ملنے کا بہت شوق رکھتی ہے۔ آپ یقیناً اُسے پسند کریں گی!"

وہ نہایت سادگی سے کہہ رہا تھا۔ عائشہ اور علیقہ نے ایک دوسری کی طرف دیکھا وہ طیب کے ردِّ عمل سے کوئی خاص بات اخذ نہ کر سکیں۔

"وہ تو ظاہر ہی ہے کہ کتنی اچھی ہوگی وہ لڑکی جو غیر لڑکوں کے ساتھ فلم دیکھنے جاتی ہے!" ماں نے خفگی سے کہا۔

"لیجیئے امی تو خفا ہوگئیں! اجی امی حضور! آپ تو وہی پرانی باتیں کرتی ہیں۔ مگر اب زمانہ نہیں رہا۔ اور شرفا اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ کیا بُرائی ہے اگر میں ایک دوست کی حیثیت سے اس کے ساتھ چلا گیا۔ اور اُس کی والدہ کی اجازت سے گیا۔" طیب اب سنجیدہ ہو کر کہہ رہا تھا۔

"اس کی ماں بھی کوئی حرام زادی جس نے جوان چھوکری کو ایک غیر لڑکے کے ساتھ پھرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ کہ وہ جہاں چاہے اُسے لیے پھرے۔" آسیہ بیگم غصّہ سے سُرخ ہو کر کہنے لگی۔

"امی! وہ لوگ بہت روشن خیال ہیں اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ علاوہ ازیں اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ آپ جس چیز کو اس قدر اہمیت دے رہی ہیں گویا وہ کوئی گناہ ہے۔ وہی چیز ان لوگوں کے خیال میں معمولی ہے۔ کیونکہ وہ اسے بُرائی یا گناہ نہیں سمجھتے۔" طیب نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے کے انداز سے کہا۔

"تم اپنے گھر کی بات کرو ـــــ جیسا تمہارے گھر کا اصول ہے۔ تم اس پر چلو۔ تمہیں دوسروں سے کیا ـــ ؟" عقیقہ نے کہا۔

"اپنے گھر کے اصول کا احترام اپنی جگہ قائم ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو کبھی ماڈرن زندگی کی طرف مائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اس کے باوصف میں زندگی کی نئی قدروں سے انحراف نہیں کر سکتا۔ اگر چاہوں بھی تو زمانے کی رفتار کو روک کر اُسے اپنے ڈگر پر چلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ وقت کی رفتار تو سیلِ بے پناہ ہے جس میں بڑی بڑی اٹل چٹانیں خس و خاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ ذرا باہر نکل کر دیکھئے تو بھی ایسے ایسے گھرانے منظرِ عام پر نکل آئے ہیں جن کا پردہ ضرب المثل تھا۔ مگر اس کے باوجود آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ سب شرفاء اب گمراہ اور بد اخلاق ہو گئے ہیں جنہوں نے وقت کے ساتھ سمجھوتہ کر کے زندگی کے تقاضوں کو اس کے مطابق ڈھال لیا ہے بلکہ ان کی شرافت کا معیار نسبتاً زیادہ بلند زیادہ محکم تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ زندگی کی ترغیبوں اور آزمائشوں سے پہلو تہی کر کے کنارہ کش رہنا اور اُن سے ڈر ڈر کے جائے پناہ ڈھونڈھنا اتنا مستحسن نہیں جتنا کہ اُن کے قریب تر ہونے کے باوجود اُن سے دامن ملوث نہ ہونے دینا قابلِ ستائش ہے۔"

وہ جوش سے تقریر کر رہا تھا۔ کہ فیاض نے درمیان میں بول کر سلسلۂ کلام کو منقطع کیا۔

"معلوم ہوتا ہے حال ہی میں اس موضوع پر کسی مباحثہ میں حصہ لے چکے ہو میاں صاحبزادے! مگر اتنا تو بتاؤ کہ کتنے ہیں جو ان ترغیبوں سے قریب تر ہوتے ہوئے دامن بچا سکتے ہیں؟ بہت کم! لاکھوں میں سے کوئی ایک ـــ! چنانچہ میں تو عافیت اسی میں دیکھتا ہوں کہ اپنے آپ کو آزمانے کی نسبت بچانا زیادہ بہتر ہے۔ تم بھی اگر میرے مشورہ پر عمل کرو تو

میں یہی کہوں گا کہ "اگر خواہی سلامت برکنار است"!

فیاض کو جیسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ طیب عائشہ کے خیال کے مطابق اور جیسا کہ اس وقت تک کا اس لڑکی سے میل جول اس نے خود ظاہر کیا تھا محض عام دوستی تک محدود تھا۔

"مجھے تو اس میں کوئی ایسا جان لیوا خطرہ محسوس نہیں ہوتا" طیب نے ہنس کر کہا۔

"یہی تو نادانی ہے تمہاری! انسان اس خطرہ سے آگاہ اسی وقت ہوتا ہے جب حالات کی بے پناہ رَو اُسے اپنی لپیٹ میں لیے کہیں سے کہیں بہالے جاتی ہے" فیاض نے اپنی تقریر کو زیادہ ناصحانہ رنگ دیتے ہوئے کہا۔

"جس بات پر گھر والوں کو اعتراض ہو وہ آخر کی ہی کیوں جائے گو اس میں خطرہ ہو یا نہ ہو۔ پھر تم پر اپنے ہی گھر سے نہیں چچا کے گھر سے بھی پابندی عائد ہوتی ہے۔ تم اپنے کردار و اطوار کے لیے ان کے ہاں بھی جواب دہ ہو گے۔۔۔ تم آزاد نہیں ہو۔ جس طرح ہنسی ہنسی میں ابھی تم نے فیاض کو پرائی لڑکیوں کو گھورنے کا الزام دے کر ٹوکا۔ اسی طرح تمہیں بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ غیر لڑکیوں کو ساتھ لیے پھرو۔ تمہاری منسوبہ کو تم سے بدگمانی پیدا ہو گی۔ جس کا تمہاری آئندہ زندگی پر بُرا اثر پڑے گا۔"

علیقہ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے نہایت شیریں لہجہ میں اُسے ناصحِ مشفق بنی سمجھا رہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھا سُن رہا تھا مگر اس کے آخری فقرہ نے یک دم اُسے آتش زیر پا کر دیا وہ جیسے تلملا کر بہن کے پہلو سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اپنے کردار و اطوار کا خود ذمہ دار ہوں باجی! مجھے اپنی عزت اور نیک نامی بہت عزیز ہے یہ آپ نے غلط کہا۔ کہ میں اپنے کسی بھی فعل

کے لئے سوائے اپنی ماں کے کسی کے سامنے جواب دہ ہو سکتا ہوں سوائے امی کے کسی کو مجھ سے مواخذہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا اور مجھے کسی کی بدگمانی یا اعتماد کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ——!" وہ تیز آواز سے کہنے لگا۔

"عزت اور نیکنامی تو تمہیں نہایت عزیز ہے۔ جب ہی تو چھوکریوں کو لیے منظرِ عام پر دندناتے پھرتے ہو ——!" فیاض نے بھی تیز لہجہ میں طعنہ زنی کی۔

"فیاض بھائی! آپ بار بار ایک ہی رٹ لگائے جا رہے ہیں میں نے نہایت تحمل سے آپ کی تشفی کرنا چاہی لیکن آپ ہیں کہ اُسی ایک بات پر اڑے ہوئے ہیں —— دیکھئے بس آپ کی عزت کرتا ہوں۔ بہتر ہے کہ آپ میرے معاملہ میں دخل نہ دیں!"

وہ اُسی تلخ آواز میں کہہ رہا تھا کہ عامرہ اور ریاض داخل ہوئے۔

"ارے یہاں کیا معاملہ درپیش ہے؟ آپ لوگ کب سے آئے بیٹھے ہیں؟ مجھے تو اطلاع ہی نہ ہوتی اگر ابھی ریاض آپ کو کھوجتا ہوا میرے پاس نہ پہنچ جاتا۔"

عامرہ استفسار کے انداز سے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سب چُپ رہے تو اُس نے آہستہ سے عتیقہ کے قریب صوفہ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے باجی؟"

آسیہ بیگم غصہ کی نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اپنے جوان بیٹے کو آج تک کبھی ڈانٹ ڈپٹ نہ کی تھی مگر آج کا واقعہ سُن کر وہ اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی اب جو وہ بڑے بہنوئی کے روبرو اس طرح بولا تو اسے بہت ناگوار گزرا۔

"اتنا بھی غنیمت ہے کہ تم نے مواخذہ کرنے کا میرا حق بھی منسوخ نہ کر دیا؟ اسی رعایت کا سہارا لیتے ہوئے میں تمہیں حکم دیتی ہوں۔ کہ آج کے بعد تم کبھی اُس لڑکی کے ساتھ یا اور کسی بھی لڑکی کے ساتھ نہ دیکھے جاؤ! سُن لیا تم نے؟" آسیہ بیگم نے کہا۔

"جی ہاں خوب سُن لیا!"

طیب نے جواب دیا۔ گویا سُن تو لیا مگر تعمیل کا وعدہ نہیں!

"کونسی لڑکی طیب؟ کیا وفا تو نہیں؟"

ریاض نے پوچھا تو طیب نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی اور کمرے سے نکل گیا۔

"یقیناً وفا ہی ہو گی یا پھر روشن! اُن دونوں کے سوا طیب کی اور کسی لڑکی سے راہ و رسم نہیں۔" ریاض خود بخود بڑبڑا رہا تھا۔

"وہ وفا کون ہے؟" عتیقہ نے پوچھا۔

"کسی بریگیڈیر کی بیٹی ہے۔ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ نہایت شاندار بنگلے میں رہتی ہے۔ اچھے دولت مند لوگ ہیں یہ وفا اور روشن دونوں طیب کی کلاس فیلو ہیں۔ اور اس کے ساتھ خاصی بے تکلف ہیں۔ میں تو پچھلے دنوں ان تینوں کو اکثر اکٹھے دیکھتا رہا۔ اب روشن تو چیٹا گانگ چلی گئی ہے شاید؟ اور صرف وفا ہی ہوتی ہے طیب کے ساتھ۔"

ریاض بیان کر رہا تھا اور فیاض چُپ بیٹھا ہوا آنکھیں جھپک کر معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تو کیا تم یہ سب کچھ پہلے سے جانتے تھے؟" عتیقہ نے پوچھا۔

"کیا سب کچھ؟"

ریاض نے یوں چونک کر حیرت سے پوچھا جیسے وہ اپنا سابقہ بیان بھول گیا ہو!

"ارے بھیا! یہی جو کچھ بتا رہے ہو ابھی؟" آسیہ بیگم بھی استفسار سے اُس کی طرف دیکھ کر بولی۔

واہ بھابی جان آپ نے مجھے ڈرا ہی دیا! میں حیران ہوا کہ خبر نہیں وہ سب کچھ سے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

ریاض ہنس کر بولا جیسے یہ معاملہ اس کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہو۔

"عجیب آدمی ہو ہم کیا پوچھ رہے ہیں تم کیا کہہ رہے ہو!" عتیقہ نے ریاض کو پھر ڈانٹا۔

"جی ہاں بھابی جان! طیب اور ان دونوں لڑکیوں کی واقفیت کو میں پہلے سے جانتا ہوں مگر آپ لوگوں کے یوں سنجیدگی سے کانفرنس کرنے سے تو میں ڈر گیا کہ خبر نہیں بیچارے طیب سے کیا گناہ سرزد ہو گیا کہ آپ سب اُسے گھیرے ہوئے ہیں!"

"ارے احمق! کیا بکتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک لڑکیوں کو ساتھ لیے پھرنا شریف لڑکوں کے واسطے زیبا ہے؟ کیا تو خود بھی یہی خاک اُچھالتا پھرتا ہے؟"

فیاض یک دم ریاض پر برس پڑا۔

"لیجئے! بھائی جان تو میرے سر ہو گئے! سوچئے تو سہی بھلا میرے ساتھ پھرنا کون پسند کرتا ہے جو میں خاک اُچھالتا پھروں گا؟"

ریاض نے عجیب مضحکہ خیز شکل بنائی کہ سب کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"اور جو کوئی پسند کرے تو گویا تمہیں عذر نہ ہو؟" عائشہ نے پوچھا۔

"آپ اس امکانات کی بحث کو چھوڑیئے واقعات ہی کا ذکر کیجئے۔!"

وہ فیصلہ کُن انداز میں ہاتھ کو جھٹکا دے کر بولا۔

"واقعات ہی کو پوچھ رہے ہیں تم نے خود ہی تو بات کو چکر دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا پوچھنا صرف یہ تھا کہ جب تمہیں معلوم تھا۔ کہ طیب اُن لڑکیوں کے ساتھ پھرتا پھراتا ہے تو تم نے ہمیں اطلاع کیوں نہ کی؟" عتیقہ نے پوچھا۔

"اطلاع کرنے سے آپ بیچارے طیب کی یونہی مزاج پرسی کرتے جیسے کہ اب کر رہے ہیں؟" وہ کہنے لگا۔

"تو اسی لیے تم نے معاملہ کو بڑھنے دیا؟" فیامن نے پوچھا۔

"میں نے ــــــ؟ لیجئے بھلا میرا اس معاملہ کے بڑھنے گھٹنے میں کیا دخل ــــــ؟" وہ پھر ڈرامائی انداز میں دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"ارے نابکار! تو شروع ہی میں بتا دیتا تو کوئی روک تھام کی جاتی۔" فیامن نے پھر غریب ریاض کو پھٹکارا۔

"تو اب کر لیجئے روک تھام ــــــ! اب کیا بگڑ گیا۔ یہ کوئی ایسی ہی سنجیدہ بات نہیں جس پر آپ یوں سہمے ہوئے بیٹھے ہیں طالب علمی کے زمانہ میں کون نہیں چاہتا کہ ــــــ"

وہ کچھ کہتے کہتے یکدم رک گیا۔

"کون نہیں چاہتا کہ لڑکیوں کے ساتھ پھرے ــــــ؟ کیوں یہی نا ــــــ؟" عائشہ نے ہنس کر پوچھا۔

"خیر ہو گا ــــــ! چھوڑیئے اس قضیہ کو!" اور وہ اُٹھ کر طیب کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔

"بے غیرت کہیں کا!" فیامن نے اُسے جاتے ہوئے گھور کر کہا۔

(۱۴)

گھر میں عجیب قسم کی پریشانی برس رہی تھی۔ ماحول میں ایک گھٹن تھی، ذہنوں میں انتشار اور دلوں میں اُلجھن تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ کیا کرے، عامرہ اپنی صائب رائے کے لئے گھر کے سب لوگوں میں مانی ہوئی تھی لیکن اس موقعہ پر وہ بھی تسلی بخش رائے پیش نہ کر سکی۔ آسیہ بیگم کو اپنے عزیز بھائی بشیر کی کمی اس وقت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ وہ انگلستان میں زیرِ علاج تھا۔ ذیابیطس کے موذی مرض نے اس کے دل کو ماؤف کر دیا تھا —— وہ امراضِ قلب کے ماہر ڈاکٹروں کا شہرہ سُن کر انگلینڈ گیا اور متواتر چار سال سے وہیں مقیم تھا۔ صحت کی خرابی کے باعث خط بھی شاذ و نادر ہی لکھتا۔ اسی وجہ سے آسیہ کا یہ بہترین میٹر اور ہمدرد ان دنوں پس منظر میں چلا گیا تھا —— ایسے عزیز رحمتِ خداوندی کی طرح مصیبت کے وقت ہی یاد آتے ہیں۔ اچھے دنوں میں عموماً انہیں فراموش کر دیا جاتا ہے۔

طیّب نے عجیب وطیرہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ ماں سے جیسے چھُپا، چھُپا پھرتا تھا۔ اس کے روبرو دن میں کسی وقت آتا بھی تو ایسے موقعہ پر جب کوئی ایسا شخص موجود ہوتا جس کے سامنے آسیہ بیگم اس سے کچھ کہہ نہ

سکتی۔ اُس شام سے اگلے ہی روز اس کی پھوپھی کی بڑی بہو یعنی عامرہ کی جٹھانی اُسے لینے کے واسطے آگئی۔ اور ایک ہفتہ تک گھر میں مقیم رہی۔ ایسے، مہمان کی موجودگی میں اس قسم کے نازک مسئلہ پر جیسا کہ اس وقت آسیہ بیگم اور اس کے گھر کے افراد کو درپیش تھا کچھ بھی گفت و شنید نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ گھر کے ماحول میں عجیب قسم کی گھٹن کا احساس پایا جانے لگا۔

عامرہ رخصت ہوئی تو آسیہ بیگم جیسے یکسر اکیلی ہو کر رہ گئی، دونوں بڑی لڑکیاں اپنے گھر میں مصروف تھیں کبھی آئیں بھی تو صدیقہ ساتھ ضرور چلی آتی۔ پھوپھی حنیفہ آسیہ کا بہت بڑا سہارا تھی مگر جب سے اس کی سماعت میں فرق آگیا وہ عام بہرے لوگوں کے برعکس نہایت خاموش اور گوشہ گیر سی ہو گئی اور پھر ایسی راز کی بات اس کے کان تک پہنچائی بھی جاتی تو کیونکر؛ چنانچہ آسیہ بیگم خود ہی ادھیڑ بن میں لگی رہتی۔ پریشان خیالوں سے الجھتی رہتی جو کسی صورت سلجھائے نہ سلجھتے طیب کا رنگ اُسے بے ڈھب نظر آرہا تھا اور وہ اپنے دل میں یقین کر چکی تھی۔ کہ وہ اس شادی پر کبھی آمادہ نہ ہوگا۔ یہ شادی منسوخ ہوئی تو یک دم باہمی اختلافات کی وہ طوفان خیز موجیں تلاطم میں آجائیں گی۔ دبی ہوئی دشمنی کا وہ سویا ہوا رنگ از سرِ نو پھر اُٹھائے گا۔ طیب کی ذات پر پھر حملے شروع ہوں گے —— اور وہی پندرہ سال پہلے کے سارے مسائل آسیہ بیگم کو اپنے سامنے پھیلے ہوئے نظر آنے لگے۔ اُس وقت ان کا دل سوچنے والے دو ہمدرد اُس کے ساتھ برابر کے شریک تھے مگر اس وقت وہ اکیلی تھی۔ بشیر دُور تھا اور پھوپھی حنیفہ دُور از کار —— اور اس تنہائی نے آسیہ بیگم کے ضعیف دماغ کو بے طرح اُلجھا دیا۔

طیب دن بھر کی آوارہ گردی کے بعد گھر واپس آیا۔ اور حسبِ دستو

کھانا باہر مردانہ ہی میں منگوایا۔

"شانو! صاحب کے ساتھ اور کون ہے؟" باہر کھانا منگوانے پر آسیہ بیگم نے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں بانو! اکیلے ہی آئے ہیں!" ملازم چھوکرے نے جواب دیا۔

"پھر باہر کیوں کھانا منگوایا انھیں کہو اندر آ کر سب کے ساتھ کھائیں۔" آسیہ بیگم نے کہلوا بھیجا۔ اس وقت تک طیب کو یہ علم نہ تھا کہ عامرہ چلی گئی ہے کھانے پر اُسے صغیر کی بیوی صائمہ اور عامرہ کی موجودگی کی تسلی تھی چنانچہ ماں کے بُلانے پر اندر چلا آیا مگر دسترخوان پر ماں اور دادی حلیمہ کو منتظر پایا اور سلام کر کے گرد و پیش نظر دوڑائی۔

"اپیا اور بھابی کہاں ہیں؟" اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

"وہ تو چلی گئیں۔ تم سے نہ مل سکنے پر دونوں ہی افسوس کر رہی تھیں!"

آسیہ بیگم نے اپنے عام مشفقانہ لہجہ میں کہا۔ طیب کو قدرے حوصلہ ہوا اور وہ ماں کے سامنے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ اگر کوئی تکلف والا مہمان نہ ہو تو ان کے ہاں فرش پر دسترخوان لگا کر کھانے کا معمول تھا۔ کھانے کے دوران آسیہ بیگم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی اور طیب وقتاً فوقتاً ماں کے چہرے کی طرف دیکھ کر اس کے خیالات کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آسیہ بیگم کو اپنے اس آہوئے گم کردہ کو کسی نہ کسی حیلہ سے دام میں پھنسانا مطلوب تھا۔ جو مہربان اور ہمیشہ ایثار کرنے والی محبت شعار ماں کا عتاب دیکھ کر بجائے مرعوب ہونے کے اُلٹا چراغ پا ہو کر اکڑ بیٹھا تھا۔ وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آرام کرنے کے واسطے چلا گیا۔ آسیہ بیگم گھر کے مختلف کام دیکھنے کے دوران اس کے سو کر اُٹھ جانے

کا انتظار کرتی رہی ساتھ ہی شانو کو نگرانی پر مقرر کر دیا۔ کہ صاحب کہیں باہر جانے کو تیار ہوں تو وہ آکر اندر اطلاع کرے مگر شانو کو اپنی خدمات کی بجا آوری کا موقع نہ ملا اور آسیہ بیگم عصر کی نماز کے بعد خود ہی طیّب کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ سو کر اُٹھ گیا تھا اور اب کسی ناول کے مطالعہ میں محو تھا ماں کو دیکھ کر وہ فوراً تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ماں نے اُسے سر تا پا دیکھا سفید ململ کے کرتہ اور کھلے پائنچوں کے سفید پاجامہ میں اس کا بیٹا کتنا وجیہ اور صحت مند نظر آرہا تھا شفاف پیشانی پر اس کے بے ترتیب بھورے بالوں کی لٹیں۔ برقی پنکھے کی ہوا سے لہرا رہی تھیں۔

"آیئے امی جان بیٹھئے ——"

اُس نے دزدیدہ نظروں سے ماں کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے بستر پر بیٹھ گئی جو ایک فراخ پلنگ پر پنکھے کے نیچے کمرے کے عین وسط میں بچھا تھا۔ اس نے اپنے دونوں تکیے اُٹھا کر پلنگ کے سہارے کے ساتھ آسیہ بیگم کی پشت کے پیچھے رکھ دیئے وہ نہایت آرام سے سہارا لے کر بیٹھ گئی تو وہ دوسری طرف سامنے خود بھی بیٹھ گیا۔ اس کا دل کسی مذبوح پرندے کی طرح پھڑک رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا۔ کہ ماں اُس کے ساتھ فیصلہ کُن گفتگو کرنے کے واسطے آئی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو آنے والے صبر آزما لمحوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنے لگا۔

"طیّب!" اُس نے گلوگیر آواز میں پکارا۔

"جی امی!"

اس نے ہاتھ بڑھا کر ماں کے چھوٹے سے خوبصورت پیر کو پیار سے مسلتے ہوئے نرم لہجہ میں جواب دیا۔ وہ اس کی طرف سے دانستہ نگاہ پھیرے ہوئے تھی۔

"میرے بیٹے! اب تو اصل خیر سے اُس عمر کو پہنچ گیا ہے۔ کہ تجھے

اپنے گھر کے گزشتہ حالات اور اپنی ماں کی مشکلات کا علم ہو جانا چاہیئے۔ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے معصوم بچوں کے نرم و نازک دلوں کو دُکھ درد سے آشنا کرتی اور ان کھِلتے پھولوں کو آنچ دینا گوارا کرتی ہیں۔ میرے نورِ نظر! میں وہ ماں ہوں جس نے اپنے دکھوں کو اندر ہی اندر پیئے رکھا لیکن تم بھائی بہنوں کو اُن کی جھلک تک نہ دیکھنے دی۔!"

آسیہ بیگم کو اپنی بیوگی کے ابتدائی دَور کی ساری مشکلات تازہ محسوس ہونے لگیں۔ لیکن طیب جو واقعی اب تک اپنے اور اپنے گھر کے ماضی سے لاعلم تھا اور بچپن ہی سے انتہائی ناز و نعم مال و دولت کی فراوانی بزرگوں کا لاڈ دُلار دیکھے ہوئے تھا ماں کی اس گفتگو سے حیران ہوا۔ کہ وہ کون سی اور کس زمانہ کی مشکلات کا ذکر کر رہی ہیں مگر خاموش رہا اور متوقع نگاہوں میں استفسار لیے ہوئے اس کے متین اور پاکیزہ چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

ماں نے اُسے اُس کے باپ کی موت کا واقعہ بتایا۔ اس کے چچا چچی کے رویّہ کا حال سُنایا۔ جائیداد کی کیفیت اپنے احساسات اور محرومی کے خدشات کا نقشہ کھینچا پھر اس کی پیدائش ـــــ کا اس کی پرورش کے چیدہ چیدہ حالات بیان کیئے مگر اس کے پاکیزہ ضمیر نے برداشت نہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کے دل میں آئندہ شریکِ حیات کے والدین کے متعلق زہر گھول دے اُس نے اُن عملی حقائق کو محض اپنے وہم اور خدشہ کے رنگ میں پیش کیا واقعات کو امکانات کہہ کر ان کے زیرِ اثر اپنی بے کلی اور پیہم اضطراب و خلفشار کا اظہار کیا ـــ اور آخر اُس عذابِ مستقل کا مداوا یہ کیا اُسے چچا کی نوزائیدہ بچی سے منسوب کر کے، اس کی زندگی کو محفوظ اور اپنے ذہن کو مطمئن کر لینے کا تذکرہ کیا۔ طیب اپنے دلکش چہرے پر ایک دُکھ کا احساس لیے ہوئے یہ سب کچھ سُنتا رہا۔

"اب تم ان سارے حالات کو اپنے پیشِ نظر رکھ کر خود ہی بتاؤ طیب،"

کہ اگر تمہارا چچا یہ سُن پائے کہ تم ایسے بدلگام ہو چکے ہو کہ بیگانی لڑکیوں کو سرِ عام لیے پھرتے ہو تو وہ کبھی بھی اپنی بیٹی کا رشتہ تم سے کرنے کو تیار ہو گا ——؟

آخر کار آسیہ بیگم نے اپنی طویل تقریر کو اس سوال پر ختم کیا اور بیٹے کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”امی جان! اس صورت میں کہ یہ رشتہ میری نیک چلنی اور نیک کرداری کی بنا پر طے نہیں ہوا بلکہ محض اقتصادی حکمت عملی کی بنا پر اُستوار کیا گیا تو انہیں ہرگز عذر نہ ہو گا۔ کیونکہ جس وقت یہ رشتہ طے پایا یہ جائیداد اور املاک موجود تھی لیکن یہ سند تو موجود نہ تھی۔ کہ جس کمسن مگر دولت مند بچّے سے وہ یہ اجارہ طے کر رہے ہیں وہ بڑا ہو کر نہایت متقی پرہیز گار اور نیک چلن بھی ہو گا ——!

طیب نے یہ دلیل پیش کرتے ہوئے ماں کے چہرے کی طرف نگاہ اُٹھائی تو اُسے خشونت کے آثار اور بدلے ہوئے تیور نظر آئے۔

”تو گویا تمہیں اپنے منہ سے اعتراف ہے کہ تم بدکردار اور بدچلن ہو چکے ہو؟“ آسیہ بیگم نے غضبناک مگر دھیمی آواز میں پوچھا۔

”خدا نہ کرے امی جان! میرا خدانخواستہ یہ مطلب نہیں کہ میں ایسا واقعی ہو گیا ہوں، میرا مطلب ہے کہ انہیں اس قسم کا اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ جب تک وہ جائیداد موجود ہے جس کے ساتھ انہوں نے اپنی بیٹی کا رشتہ جوڑا انہیں میری ذات پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے ——“ طیب نے بڑے تحمل سے ماں کو اپنا مافی الضمیر سمجھایا۔

”مگر میں نے ابھی ابھی تم سے بیان کیا ہے۔ کہ یہ رشتہ جوڑنے میں پہل میں نے کی۔ میرے سوال کرنے پر اُن میاں بیوی نے منظوری البتہ دی لیکن خود اپنی طرف سے تو اُنہوں نے تمنا نہیں کی۔ اب وہ اس امر کی جواب طلبی

بھی مجھ سے کرنے کا حق رکھتے ہیں اگر میں اپنے بیٹے کے کردار کی حفاظت کرنے کی طاقت نہ رکھتی تھی تو کیوں اُن کی بیٹی کا نصیبہ اس سے پھوڑنے کی جرأت کی ــــ بتاؤ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ یہ الزام تمہاری ماں پر آئے گا۔" وہ مواخذہ کے انداز سے اُسے چہرے پر نگاہ جمائے رہی۔

"آپ کی دعا سے میرے کردار کی معترف ایک دنیا ہے۔ میرے اُستادوں سے دریافت کیجئے۔ میرے ــــ مِلنے جُلنے والوں سے پوچھ دیکھئے انشاء اللہ ہر شخص آپ کے اس خادم کی تعریف ہی کرے گا۔ اس پہلو سے آپ مطمئن رہیئے ــــ مگر ــــ"

اس نے بڑے جوش و خروش سے ماں کو یقین دلایا آسیہ بیگم کا مادرانہ شفقت سے بھرپور ہاتھ اُس کے سر کی طرف اُٹھا اور والہانہ انداز سے اُس کی پیشانی پر لہراتی ہوئی منتشر لٹوں کو سمیٹنے لگا۔

"مگر ــــ! مگر کیا ــــ؟"

اس کے آخری لفظ اور اس کے تذبذب سے آسیہ بیگم کو جیسے اچانک کسی نے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ اور اُس نے تیز نظروں سے طبیب کو گھُورتے ہوئے پوچھا۔

"امی کیا ایسے خود غرض اور حریص لوگوں سے زندگی بھر کا رشتہ گانٹھنا قرین مصلحت ہے؟ مجھے تو کراہیت کا احساس ہونے لگا۔ ایسے لوگ دُنیا کے کُتے ہیں امی! انہیں انسان جیسا اعلے و ارفع خطاب دینا اس لفظ کی توہین ہے۔ آپ کے خدشات کا دَور گزر چکا اب آپ کے بیٹے کے بازو اتنے قوی ہیں کہ وہ ہر مخالف عنصر کی طاقت کو کچل سکیں پہلے میرے دل میں ان لوگوں کے لیے انجانی سی نفرت تھی اب اُن کی اصل اور حقیقت معلوم کر کے تو مجھے ان کے تصوّر سے کراہیت محسوس ہونے

لگی۔ اب یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ میں اس رشتہ کے بہانے انھیں اپنے قریب تر کر لوں۔ اور صحیح معنوں میں مارِ آستین بنا کر پالوں۔"

وہ اُسی جوش سے کہہ رہا تھا لیکن آسیہ بیگم کے تیوُر درست نہ ہوئے۔

"مگر میری زبان کا کیا ہو! جو لفظ میں اپنے منہ سے نکال چکی انہیں واپس کیسے نِگل لوں! ۔ جسے گود میں لیتے ہی میں بہو کہہ چکی اُسے دوسرے گھر کیسے جانے دوں! ٹھیکرے کی مانگ چھوڑ دوں تو ساری برادری تھڑی تھڑی کرے گی اور میرے جنم پر تھوکے گی۔" وہ اُسی غضب ناک لہجہ میں کہتی گئی۔

"تو محض اِن رسمی باتوں کی پابندی میں آپ میری زندگی تباہ کرنے پر تیار ہیں۔ اَن دیکھے بھالے سانپوں کو میرے دامن میں ڈالنا چاہتی ہیں۔ دیکھ لیجئے گا بعد میں خود آپ ہی کو دُکھ ہوگا میری حالت دیکھ کر۔ یہ زبردستی کی شادیاں کبھی کامیاب ثابت نہیں ہوا کرتیں!"

وہ کہہ رہا تھا اور آسیہ بیگم حیرت کے انداز سے ہونٹ پر انگلی رکھے پیشانی پر بل ڈالے بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"زبردستی کی شادی کیا مطلب؟" اس نے درشتی سے پوچھا۔

"اسے زبردستی ہی کی شادی کہتے ہیں جس میں دوسرے کی رضامندی اور خوشی کا لحاظ نہ رکھا جائے۔" وہ کہنے لگا۔

"جہاں تمہاری رضامندی اور خوشی ہوگی وہ لڑکی میرے کام کی نہیں ہو سکتی ——" آسیہ بیگم نے کہا۔

"کیوں ——؟"

وہ جیسے بے اختیار پوچھ بیٹھا لیکن فوراً ہی گھبرا کر جھینپتے ہوئے نگاہیں جھکا لیں۔

"اس لیے کہ باہر کی پھرنے والی چھوکریاں گھریلو شریف بہوئیں نہیں بن

سکتیں۔ انہیں آزاد پرندے کی مانند ڈال ڈال منڈلانے کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ گھر کو قید خانہ سمجھنے لگتی ہیں ــــ لیکن تم نے تو یوں بے اختیار ہو کر، کیوں، کہا جیسے ــــ جیسے کوئی خاص خیال دل میں ہو! اپنا عندیہ تو بتاؤ کیا خیال ہے تمہارے دل میں۔؟"

آسیہ بیگم نے خاصے تلخ لہجہ میں پوچھا۔ تو طیب نے ماں کے خیال کی تردید کرنے کی کوشش نہ کی اور خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ یہ خاموشی اس حقیقت کی غمازی کر رہی تھی کہ ماں کا شبہ بے بنیاد نہ تھا۔

"بولو نا ــــ؟ کیا میرا شبہ درست ہے کیا تم اپنے دل میں واقعی کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھے ہو؟" آسیہ بیگم نے پوچھا۔

"غلط فیصلہ تو نہیں امی ــــ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ نہایت شریف عالی خاندان اور اعلےٰ سوسائٹی کے لوگ ہیں۔ میں آپ سے ان دنوں کہنے ہی والا تھا۔ کہ آپ جا کر بیگم درانی سے اس سلسلہ میں بات کیجئے ــــ کہ اس دن فیاض بھائی نے مفت میں رائی کا پہاڑ بنا کر قضیہ کھڑا کر دیا۔"

موقعہ آ ہی گیا تو طیب نے جی کڑا کر کے ماں کے روبرو اپنا عندیہ ظاہر کر دیا۔

"یہ ــــ یہ نہیں ہو سکتا ــــ! کبھی نہیں ہو سکتا! قیامت تک نہیں ہو سکتا! سن لیا تم نے؟ غضب خدا کا! میری زبان کوئی چیز ہی نہیں۔ میرے لفظ میرا فیصلہ، میرا وعدہ تمہاری نظروں میں اتنا ہی حقیر ایسا ہی بے وزن ہے؟ کوئی لنڈوری مردار چھوکری میری بہو کہلائے؟ یہ کبھی بھی نہ ہو گا!"

وہ وفورِ غضب سے قریب رکھی ہوئی تپائی پر پورے زور سے ہاتھ مار کر بولی۔

"تو امی حضور! یہ بھی نہیں ہو گا کہ میں اپنے جان لیوا دشمنوں اور اور

مخالفوں کی بیٹی کو اپنی رفیقِ حیات بناؤں۔ گویا اپنی زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے اُن کا غلام بے دام بن جاؤں ـــــ آپ ایسا کریں کہ میرا نتیجہ نکلنے پر مجھے ماموں جان کے پاس لندن بھیج دیں میں وہیں رہ کر پڑھوں گا۔ شادی وغیرہ کو جہنم میں ڈالیں۔"

اُس نے یک لخت فیصلہ کن لفظوں میں کہا۔ لیکن ساتھ ہی وفا کی معصوم تصویر اُس کی چشمِ تصور میں گھوم گئی جیسے وہ اُس سے پوچھ رہی ہو کہ کیا وہ واقعی "اپنے اس فیصلہ پر کاربند رہنے کا ارادہ رکھتا ہے ـــــ؟ اس کے دل پر جیسے کسی نے ضرب لگائی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بے وقوف لڑکا۔!"

بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر آسیہ بیگم کا دل پگھل گیا مگر وہ اپنے لفظ واپس لینے پر تیار نہ تھی۔ خطروں کے سیلاب کے سامنے اُس نے سیاست کا جو بند باندھا اُسے مسمار کر دینا دانشمندی سے بعید تھا۔ بزرگوں کی دُور رس نگاہیں جن دُور افتادہ مصلحتوں کو دیکھ سکتی ہیں بچوں کی لا اُبالی اور کوتاہ نظر وہاں تک نہیں جا سکتی۔ اور اس یقین کے ساتھ کہ وہ پیار محبت سے بیٹے کو سمجھا لے گی آسیہ بیگم جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"بچوں کو تو ایسی باتوں میں بولنا ہی نہیں چاہیئے۔ لوگ سنتے ہیں تو نام دھرتے ہیں۔ کہ پڑھ لکھ کر لڑکا کتنا دیدہ دلیر ہو گیا کہ شادی بیاہ کے معاملے میں دخل دیتا ہے۔ پھر نوکروں چاکروں کا کیا اعتبار؟ تمہارے سسرال تک بات پہنچ جائے تو خواہ مخواہ کی قیامت اُٹھ کھڑی ہو!"

وہ اُسے مرعوب کرنے کے لیے سہمے ہوئے لہجہ میں کہہ رہی تھی۔ طیب نے خاموشی سے گردن جھٹک دی۔ آسیہ بیگم نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ وہ لاڈلے بیٹے پر زیادہ سخت گیری نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ رفتہ رفتہ نرمی سے اُسے سمجھانا چاہتی تھی۔

"اب نہ کہیں جانا۔ کبھی آرام سے گھر بیٹھا کرو۔" وہ اس ہدایت کے ساتھ دروازہ کی طرف مڑی۔

"تو امی جان میں کل ہی سے اپنے پاسپورٹ کے واسطے کوشش کرتا ہوں۔ میں بھی ماموں جمیل کی طرح عمر بھر کے واسطے یہ ملک چھوڑ دوں گا جہاں حریص اور خودغرض درندے رہتے ہیں۔ جنہیں دوسروں کی لاشوں پر اپنے قصر تعمیر کرنے کا فن آتا ہے جو احساسات و جذبات کے خون سے اپنی مصلحتوں اور سیاستوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں، اس ملک میں واپس نہ آؤں گا۔" وہ اپنے دل کا جوش اُگلنے لگا۔

"ایسی بدفال باتیں نہیں کیا کرتے۔ بے وقوف لڑکا نہ ہو تو!"

آسیہ بیگم نے واپس آکر اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ طیب کا چہرہ گرم اور تمتمایا ہوا تھا جوشِ گریہ سے آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں مگر وہ ضبط سے کام لے کر آنسو پی گیا۔ آسیہ بیگم اس کی دلجوئی کرتی رہی۔ پس و پیش سمجھاتی رہی۔ ماں کے اس مشفقانہ طرزِ عمل سے طیب کو اُمید بندھی۔ کہ وہ اس کی ضد کے سامنے آخر کار ہتھیار ڈال دے گی اور آسیہ بیگم کو اپنی جگہ تسلی تھی کہ وہ بیٹے کو ڈھب پر لے آئے گی۔

(۱۵)

اُس دن طیّب ، وفا کے ہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ طیّب کے چہرے پر معمول کے مطابق شگفتگی نہ تھی۔ بجھی بجھی سی آنکھیں مکدر جیسی پیشانی ہونٹوں پر آزردہ سی مسکراہٹ ، کسی ذہنی پریشانی کی آئینہ دار تھی —— وفا نے ایک مختصر مگر غائر نظر اس پر ڈالی اور خود بھی پریشان سی ہو گئی۔

„کیا بات ہے طیّب !" وہ اس کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

„کچھ بھی نہیں !"

وہ مسکراہٹ میں کچھ زندگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

„کچھ تو ضرور ہے ! تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم پریشان اور آزردہ ہو ؟"

وہ اُسی طرح اُس کے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی جیسے جلد از جلد اُس کے دل کی کیفیت معلوم کر لینا چاہتی ہو۔

„اچھا ! مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہیں آنکھوں کی زبان سمجھنا بھی آتا ہے !"

طیب نے ہنس کر کہا۔ مگر وفا نے اس کی ہنسی میں بھی زہر خند کی تکلیف دہ سی کھنک محسوس کی اور اُسے یقین ہو گیا۔ کہ طیب کسی نہایت سنجیدہ مسئلہ سے دوچار ہے۔

"کیوں نہیں —— ! کیا تم مجھے آج تک اُلّو ہی سمجھتے رہے؟"

وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ اُس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں اس وقت تجسس کی چمک تھی ہلکی ہلکی سرخی نے اُس کے چہرے کی زیتونی رنگت کو اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔ اس کی حسین پیشانی پر یہ اندازِ تفکر اُسے حسین تر بنائے ہوئے تھا —— طیب نے اُس کی طرف غور سے دیکھا اور چند لمحوں کے لیے تمام ناگوار واقعات اُس کے ذہن سے مٹ گئے۔

"اُلّو کیوں —— ؟ میں تو تمہیں —— بلبلِ خوشنوا سمجھتا رہا طوطیٔ شکرخا سمجھتا رہا!" طیب نے پھر ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"روشن سچ ہی کہتی تھی۔ جب تم اپنے دل کی بات صاف بتانا نہیں چاہتے تو شاعر بننے کی کوشش شروع کر دیتے ہو۔ گویا سچ کو جھوٹ کا نقاب پہنانا چاہتے ہو۔"

وفا کی آواز میں شکایت تھی۔

"روشن خود جو اوّل درجہ کی جھوٹی ثابت ہوئی اسی لیے دوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھتی ہے!"

وہ آج تک روشن کو اس لیے معاف نہ کر سکے تھے کہ وہ اپنے والدین کو کیوں مجبور نہ کر سکی کہ وہ اسے یہیں رہنے دیں۔

"تم خود بھی تو اُس سے کم نہیں ہو۔ خبر نہیں تم لوگوں کو سچ بولنے میں اس قدر تامل کیوں ہوتا ہے!" وفا نے بدستور شکایت بھرے لہجہ میں کہا۔

"تو میں نے کیا جھوٹ بولا؟ یہی نا کہ تمہارا خیال غلط ہے اور میں تمہیں

اُلّو نہیں سمجھتا۔ تمہیں اگر اصرار ہے تو چلو بھئی اُلّو ہی سہی! ہمیں تو تمہاری خوشی منظور ہے ——!"

طیب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ وفا بغور اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور محسوس کر رہی تھی کہ وہ اُسے بہلا کر اصلی موضوع سے دُور لے جانا چاہتا ہے۔

"کتنے چالاک ہو طیّب! بات کو کہیں سے کہیں لے گئے! میں پوچھ رہی تھی۔ کہ تم پریشان کس لیے ہو —— ؟ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں کہ میں کسی اُلجھن میں تمہاری سچّی ہمدرد ثابت ہو سکوں گی، دوستی کا اور مقصد ہی کیا ہوتا ہے۔؟"

وہ نہایت خلوص سے کہہ رہی تھی۔ اس وقت تک ان دونوں کا میل جول سچی دوستی تک محدود تھا۔ وہ گھنٹوں یکجا بیٹھتے۔ اکٹھے سیر کے لیے جاتے لیکن ان کے درمیان گفتگو نے کبھی عام دوستانہ حد سے تجاوز نہ کیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھتے تھے اور مطمئن تھے۔ بیگم درانی کے عندیہ سے بھی دونوں واقف تھے۔ خصوصاً وفا کو طیب کے ساتھ اپنی آئندہ وابستگی کا پورا یقین تھا کیونکہ اُسے روشن کے ذریعے اپنی ماں کے خیالات معلوم ہو چکے تھے۔ بیگم درانی ان کے نتیجہ کی منتظر تھیں اور اُن کا ارادہ تھا کہ وہ عنقریب اس فریضہ سے سبکدوش ہو کر وفا اور طیب کو بیرونِ ملک بھیج دیں گی۔ طیب کو ایک صاحبِ حیثیت اور خود مختار نوجوان سمجھتے ہوئے خود بخود فرض کر چکی تھیں۔ کہ اس کی مرضی اور رضامندی میں اس کے گھر والوں کو عذر نہ ہو گا۔ اشارہ کنایہ سے روشن عموماً طیب کے سامنے بھی اکثر اس موضوع پر بات چھیڑ دیتی۔ چنانچہ وفا تو دل سے اپنے آپ کو طیب سے وابستہ کر چکی تھی۔ طیب کو البتہ اپنے گھر والوں کی طرف سے کھٹکا ضرور تھا مگر نہ اتنا کہ وہ اپنے حصولِ مقصد کو ناممکنات

سے تصوّر کرتا، اُسے وفا سے ابتدا ہی سے محبت تھی اور اب تک وہ محبت اس کے جسم میں زندگی کی محرک رُوحِ رواں بن چکی تھی۔ دونوں کے دل میں محبت جیسے پاکیزہ روحانی تعلق کے اعلےٰ وارفع جذبات موجزن تھے لیکن ان کے وسیع ظرف اور بلند اخلاق نے انہیں اجازت نہ دی کہ اُن کو زبان پر لاکر ان کی وقعت کو عامیانہ حیثیت دیں۔ سچی اور پاکیزہ محبت کا مذہب ہی یہی ہے کہ اس جذبہ کو حریم دل کے معبد میں مستور رکھا جائے حرفِ مدعا بن کر نوکِ زبان پر آتے اور الفاظ کا جامہ پہنتے ہی اس کا وہ لایزانی تقدس زوال پذیر ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ عدم سے وجود میں آنے والی ہر چیز زوال پذیر ہے ——— کیونکہ عدم لافانی ہے اور وجود فانی!

اس مرحلہ پر کہ وفا نے اپنی رفاقت اور ہمدردی کا حوالہ دے کر طیب سے اس کی پریشانی کا سبب پوچھا تو اُسے کچھ نہ کچھ کہنا ناگزیر محسوس ہوا۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ کہ چچا کے ہاں اپنی بچپن کی نسبت کا ذکر حذف کر جائے اس حقیقت کے انکشاف سے۔ نہ صرف یہ کہ وہ وفا کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا بلکہ اُسے خدشہ تھا کہ وفا جیسی بلند نظر اور بلند کردار لڑکی اُسے ماں کے وعدہ اور فیصلہ پر کاربند ہونے کی تلقین کرے گی۔ اور اس صورت میں اس کے واسطے دوہرا عذاب بن جائے گا۔ چنانچہ اُس نے مختصر طور پر بیان کر دیا۔ کہ چچا کے ساتھ جائیداد کے متعلق کچھ دیرینہ تنازعہ چلا آتا ہے جس کا والدہ نے کل اس کے سامنے انکشاف کیا۔

"تو اس وجہ سے تم اس قدر پریشان ہو کہ وہ پریشانی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ؟ میرے خیال میں تم اس قدر حریص تو نہیں ہو کہ محض جائیداد کا خیال تمہیں اتنا متاثر کرے!" وفا نے گویا اس کے بیان پر شبہ کا اظہار کیا۔

"میں جائیداد کی وجہ سے نہیں بلکہ امّی کے خدشات سے متاثر ہوں وہ اس سلسلہ میں بے حد فکر مند ہیں۔ انہیں میری زندگی کا خطرہ لاحق ہے" اس نے کہا۔

"دور کرو ایسی جائیداد کو! انہیں دے ڈالو جو کچھ مانگتے ہیں۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو اس خطرہ سے نکالو!"

وہ یک دم سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ طیب خبر نہیں کس خیال سے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تو جائیداد انہیں دے کر خود قلاش ہو جاؤں؟"

"کیوں قلاش ہو جاؤ گے؟ آخر یہ سب کچھ امّی ___ اُہو!"

وہ وفورِ جوش میں خبر نہیں کیا کہہ دینے والی تھی کہ یک دم سنبھلی اور گھبرا کر منہ پھیر لیا۔

"ہیں ___؟ کیا کہا؟" طیب نے یک دم چونک کر اُس کی بات پر غور کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں میرا مطلب تھا کہ آخر تمہاری امّی کو جائیداد سے زیادہ تمہاری زندگی عزیز ہونی چاہیئے۔"

اُس نے بات بنائی مگر فرطِ حیا اور خجالت سے اُس کی رنگت ابھی تک سُرخ ہو رہی تھی۔ طیب بے ساختہ ہنس دیا۔

"بات کچھ بن نہیں سکی ___!" وہ غور سے اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنس کر کہنے لگا۔

"عجیب باتیں ہیں تمہاری!" وہ کچھ کھسیا کر بولی۔

"مگر عجیب تر بات یہ ہے کہ سچ بولنے کی تبلیغ کرنے والے خود کتنی صفائی سے جھوٹ بول جاتے ہیں!" وہ اُسے چڑاتے ہوئے ہنس کر بولا۔

"میں نے کہا جھوٹ بولا؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کہ جو کچھ کہتے کہتے سنبھل گئیں اُسے گول کرنے کے لیے یکسر نیا مضمون تراش لیا ——!"

طبیب نے کہا۔ وفا نے جواب نہ دیا مگر خاموشی سے کچھ سوچنے لگی۔

"کس سوچ میں کھو گئیں" تھوڑی دیر کے بعد طبیب اکتا کر بولا۔

"بس یہی سوچ رہی ہوں۔ کہ یہ تم نے آج نئی بات سنائی"

اس نے متفکر جیسے لہجہ میں کہا اور اس کی نگاہوں سے خدشات کا اظہار ہونے لگا۔ اس وقت وہ خود طبیب سے زیادہ فکر مند تھی۔

"میں نے کہا تھا۔ کہ اگر میں اپنی جان کو محفوظ کرنے کے واسطے اپنی املاک چچا کو دے ڈالوں تو خود قلاش ہو جاؤں۔ تم نے اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہا تھا —— وہی کہہ دو جو کچھ کہتے کہتے پلٹ گئیں۔؟"

طبیب نے آگے جھک کر وفا کے زیادہ قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔
مگر خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ اُس کے چہرے پر نگاہیں جمائے کچھ سوچتی رہی۔ وہ منتظر اور متوقع نظروں سے متواتر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم خواہ مخواہ بنتے ہو۔ ورنہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔ روشن نے باتوں ہی باتوں میں بارہا تمہیں جتایا ہے۔ اور تم ایسے ہی نادان نہیں ہو کہ سمجھ نہ سکے —— مگر تمہیں میری عادت کا بھی اندازہ ہے کہ جب ایک بات کا اظہار لازم ہو جائے تو میں اس میں بیجا لحاظ کی قائل نہیں ہوں —— یہ حقیقت ہے کہ امی تمہیں بہت چاہتی اور پسند کرتی ہیں۔ چند روز ہوئے انہوں نے صاف لفظوں میں تمہارے متعلق میرا عندیہ دریافت کیا ——"

وہ لاکھ دعویٰ کر رہی تھی کہ بیجا لحاظ کی قائل نہیں مگر اس موقعہ پر شرم وحیا نے اس کی زبان روک لی۔

"پھر ـــــ؟"

اُسے متامل پاکر طیب کو پوچھنا پڑا۔ وفا کے زیتونی رخساروں پر شفق جیسی روشنی جھلملانے لگی۔ اور اُس نے موٹی موٹی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر طیب کی طرف دیکھا۔

"دیکھو طیب! اس موقعہ پر تمہارا تجاہل یا مضحکہ بے محل ہے تمہیں چاہیئے کہ سنجیدگی سے سنو اور مجھے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے میں مدد دو۔"

اس کا اپنا لہجہ نہایت سنجیدہ اور جذبات سے یکسر معرّا تھا۔

"ابھی تو دعوے ہو رہا تھا کہ بیجا لحاظ کی قائل نہیں ہو؟" اس نے بدستور شرارت سے مسکرا کر کہا۔

"خیر امّی نے پوچھا تو میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ اس پر اُنہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ ہمارے نتیجہ کے فوراً ہی بعد وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر ہمیں اعلےٰ تعلیم کے واسطے انگلینڈ بھیج دیں گی۔ چنانچہ کہنا یہ ہے کہ اس کے بعد جو کچھ امّی کے پاس ہے وہ بھی تمہارا ہی ہو گا اُسے تم جیسے چاہو صرف کرو۔ اس صورت میں کیوں ایک خطرے کو اپنے سر پر سوار رکھو۔ فوراً ان لوگوں کا مطالبہ پورا کرو اس سے بحث نہیں کہ وہ حق پر ہیں یا ناحق پر۔"

اور اس نے اُسی سنجیدگی سے طیب کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے سُرخ تھا ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی۔ اور وہ غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے گھریلو حالات کو اس جذبہ سرخوشی میں بھول ہی گیا۔ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر وفا نے فوراً سٹپٹا کر نگاہیں پھیر لیں اور بے ساختہ ایک شرمیلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھل گئی۔ وہ اپنے زیریں ہونٹ کو چباتے ہوئے نازک مرمریں اُنگلیوں کو مسل رہی تھی۔

"ہوں ـــــ تو مجھ سے ابھی تک ذکر ہی نہیں کیا!" طیب نے جوشِ انبساط سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں ـــــ؟ تمہیں میرے اس فیصلہ سے کچھ اختلاف ہے کیا؟"

وفا نے اُسی طرح نظریں چرائے ہوئے، ایسے انداز میں پوچھا جیسے اُسے یقین ہو کہ طیب کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔

"یہ تو تمہیں یقین ہے کہ مجھے اختلاف خدانخواستہ کیوں ہونے لگا۔ میرا مطلب ہے کہ تم نے اتنی خود غرضی سے اس عظیم مسرت کو اپنے تک محدود رکھا اور مجھے خبر نہ کی؛ میری عزیز بہن روشنی یہاں ہوتی تو مجھے اتنے دنوں اس جانفزا خبر سے لاعلم نہ رکھا جاتا۔"

اس نے پہلی مرتبہ وفا کے خوبصورت ہاتھ کو چھونے کی کوشش کی۔ وہ اُسی طرح نیم رُخ بیٹھی ہوئی ہونٹ چباتی اور مسکراتی رہی۔ اُسے اپنی معصوم دنیا میں بہار ہی بہار نظر آنے لگی۔ نغمے ہی نغمے سنائی دینے لگے جیسے طیب کا ہاتھ تھامے ہوئے وہ ایک عجب روحانی کیف میں ڈوبی ہوئی، لاہوتی فضاؤں میں پرواز کر رہی تھی۔ اُن رُوح پرور فضاؤں میں بھرپور زندگی کی لطیف اور غیر مرئی روح حلول کیے ہوئے تھی اُن میں قوسِ قزح کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ عطر بیز ہوائیں اُڑ رہی تھیں، لطیف اور سرور آگیں نغمگی سے معمور تھیں۔

"ہوں ـــــ؟ بتاؤ ـــــ تم نے یہ خود غرضی کب سے سیکھی؟" اس کی طویل خاموشی سے بے صبر ہو کر طیب نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے روشن کو لکھ دیا تھا عنقریب وہ تمہیں خط لکھ کر یہ اطلاع دینے والی ہوگی۔ میں خود بھلا کیسے کہتی ـــــ" وہ زیرِ لب کہہ رہی تھی۔

"چلیے اب کہہ دیا۔ !" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش میں آگے جھک کر کہنے لگا۔

"یہ تو ایک اتفاق پیش آگیا تو کہنا پڑا —— !"

وفا نے ایک غلط انداز سی نگاہ طیب کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا طیب مسکراتا رہا۔

"اب دیر نہ کرو طیب —— ! مجھے بے حد الجھن ہو رہی ہے اُن حریص لوگوں کا مطالبہ پورا کر کے اپنے اس خطرہ کو دُور کرو۔" وہ اب پھر سنجیدہ صورت بنائے کہہ رہی تھی۔

"مگر اتنا تو سوچو — ! کہ امی کیسے رضامند ہوں گی کہ میں لاکھوں کی جائیداد، جس کے وہ مستحق بھی نہیں ہیں ان کے حوالے کر دوں۔ آخر یہ میرے والد کی املاک ہے اور میں اُس کا جائز وارث ہوں — ؟"

طیب نے کہا اور اس مسئلہ پر دونوں کے درمیان کافی بحث ہوئی۔

طیب کو صرف ماں کا خیال تھا ورنہ اس جھنجھٹ سے نکلنے کے لیے اس اقدام سے بھی گریز نہ کرتا۔ وفا کے روبرو اُس نے صرف یہ خدشہ ظاہر کیا تھا۔ کہ جائیداد کی وجہ سے چچا کے کنبہ والے اس کی جان کے درپے ہیں یہ ظاہر نہ کیا تھا کہ اسی سلسلہ میں ماں نے اس کی زندگی خریدنے کے لیے ایک اور اجارہ بھی طے کر چھوڑا ہے جس کی وجہ سے زندگی نہیں تو اب زندگی بھر کی خوشیاں تلف ہونے کو ہیں مگر طیب پیش از وقت اپنی خوشیاں تباہ کرنے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکا اور بیان کرتے ہوئے یہ ایک کڑی چھوڑ گیا، اور اب وفا نے اس کے سامنے ایک اور دلکش تجویز پیش کر دی تو وہ اپنے گھریلو تنازعہ کو یکسر نظر انداز کر کے حسین توقعات کا سہارا لینے لگا۔ اور ممکنات کی آڑ لے کر حقیقت سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔

"تمہاری امی جان اس واقعہ سے آگاہ ہو کر ضرور مان جائیں گی ——

تم امی سے ان کی ملاقات کراؤ نا؟" وفا نے اُس کی طرف کچھ معنی خیز نگاہ سے دیکھ کر کہا۔

"ضرور! میں امی کو خالہ جان سے ملنے کے لیے کہوں گا وہ نہایت شوق سے آئیں گی!"

کہنے کو تو طیب کہہ گیا مگر حقیقت نے اس کے دل پر ضرب لگائی۔ اور ساتھ ہی اس کی دلی خوشی پر غبار سا چھا گیا۔ مگر اس نے تہیہ کر لیا۔ کہ وہ اپنی زندگی کی مسرتیں حاصل کرنے کے لیے آخری دم تک لڑے گا اور اس دلشکن حقیقت کو اپنی وفا پر کبھی ظاہر نہ کرے گا۔ کہ اس کی والدہ اس رشتہ پر رضامند نہیں۔

"امی نے مجھ سے پوچھا تھا۔ کہ کبھی تم نے اس معاملہ پر کچھ خیال ظاہر کیا ہے؟" مسکرا کر کہنے لگی۔

"پھر! تم نے کیا جواب دیا ——؟" طیب نے پوچھا۔

"میں نے یقیناً یہی کہا کہ ہمارے درمیان اس قسم کے موضوع پر کبھی گفتگو نہیں ہوئی —— امی یہ سن کر مسکرانے لگیں اور کہا۔ کہ بہر حال طیب کے خیالات براہِ راست معلوم کرنے چاہئیں۔ ایسے معاملات محض مفروضہ اور قیاس کے ماتحت یک طرفہ طے نہیں ہونے چاہئیں۔"

وہ نگاہ نیچی کیے ہوئے کہہ رہی تھی آخر بات ختم کرتے ہوئے طیب کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

"میں تمہارا نہایت ہی احسان مند ہوں وفا! کہ تم نے میرے ذہن و قلب کو عین اپنے ذہن و قلب کی طرح پڑھا۔ اور اس کی ترجمانی کی۔ البتہ اگر خالہ جان رسمی طور پر یہ ضروری خیال کرتی ہیں تو میں ان کی خدمت میں پہلے خود درخواست پیش کروں گا۔ پھر امی کو بعد ازاں لاؤنگا" وہ نہایت اشتیاق بھری نگاہوں سے وفا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے!" وفا نے تائید کی۔

"مگر میں زبانی کچھ نہ کہہ سکوں گا! لکھ کر عرض کروں گا۔"

طیب نے عجیب لہجہ میں کہا۔ تو وفا ہنسنے لگی۔

"چلو لکھ کر ہی سہی —— یہ زیادہ موزوں ہوگا۔"

اس نے طیب کی تجویز سے اتفاق کیا۔ اتنے ہی میں شیرا چائے لے آیا۔ وفا نے چائے بنائی وہ چائے پی رہے تھے۔ کہ سہ پہر کی ڈاک لیے ہوئے وہی ملازم چھوکرا شیرا کمرے میں آیا۔

"معلوم ہوتا ہے روشی کا خط ہے۔" وفا نے اشتیاق سے خطوط لڑکے کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خط ——!" اس نے ایک لفافہ طیب کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"روشی نے یقیناً وہی جانفزا خبر لکھی ہوگی جو حسنِ اتفاق سے مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکی۔!"

اس نے لفافہ چاک کرتے ہوئے کہا اور خط پر نگاہ مرکوز کر دی۔ پڑھنے کے دوران وہ بے ساختہ ہنس دیتا۔

"بڑی شریر ہے روشی! لکھتی ہے شادی کے بعد فوراً ہی چٹاگانگ پہنچو!" طیب نے خط وفا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"خوب! تو وہ اس موقعہ پر بھی یہاں آنے کا ارادہ نہیں رکھتی؟" وفا ہنسنے کی بجائے بدمزہ ہوگئی۔

"واہ! آئے گی کیسے نہیں پر زور دعوت نامہ لکھوانا اُسے!"

سہ پہر کے قریب طیب وفا سے رخصت ہوا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب متضاد خیالات موجزن تھے۔ جو مدّ و جزر کی لہروں کی طرح اس کے سفینۂ دل کو کبھی ساحلِ مراد کے قریب تر لے

آتے اور کبھی اسے ایک ہی ریلے میں سمیٹ کر تلاطم حوادث کے سُپرد کر دیتے۔

(۱۶)

طیب اُس دن گھر واپس آیا تو خوشی کے مارے کھِلا ہوا تھا۔ جیسے گوہر مراد اس کے دامن میں محفوظ ہو۔ اس نے ماں کی تنبیہہ کو دل سے نکال دیا وہ اس وقت اِس خوشی سے اپنے قلب و روح کو گہرائیوں تک بھر لینا چاہتا تھا۔ ماں کی محبّت نے اُسے سہارا دیا اُمید بڑھائی بھلا جو ماں اس کی آنکھوں کو پُرنم دیکھ کر مضطرب ہو جاتی ہے وہ اس کی زندگی بھر کی خوشیوں کو اس کے دامن سے کیونکر نوچ پھینکتا گوارا کرے گی؟ اور اسی سہارے پر وہ بیگم درانی کو خواستگاری کی درخواست لکھنے بیٹھ گیا۔

ادھر آسیہ بیگم موقعہ کی منتظر تھی۔ کہ اس کا نتیجہ نکلتے ہی وہ اس کی شادی کی تاریخ مقرر کر لے۔ تاکہ لڑکا پابند ہو جائے اور بھٹکنے سے بچ جائے۔ اُسے بیٹے کے دل کی کیفیت کا بھلا کیسے اندازہ ہو سکتا تھا۔ اور اُسے کیا معلوم تھا۔ کہ وہ اپنی دُنیا کہیں اور آباد کر بیٹھا ہے وہ خط لکھنے کے بعد زنانہ مکان میں آیا تو اس کی دونوں بہنیں اور صدیقہ آئی ہوئی تھیں۔ اُسے پہلے سے اطلاع ہوتی تو وہ شاید اندر نہ

آتا مگر اب آ ہی گیا تو ملے بغیر واپس پلٹ نہیں سکتا تھا۔ ناچار آگے بڑھا اور سلام کیا۔

"بسم اللہ! آؤ طیب بیٹا! تم تو کبھی بھولے سے بھی اُدھر کا رُخ نہیں کرتے۔ آخر وہ صرف تمہارے سسرال ہی کا گھر نہیں۔ چچا اور بہنوں کا گھر بھی تو ہے۔ تم ہو کہ بہنوں تک سے ملنے نہیں آتے!"

صدیقہ اُس کے سر کو بازوؤں کے حلقہ میں لیے سینہ سے لگائے کہہ رہی تھی۔ طیب نے آہستگی سے اپنے آپ کو اُن پُرشفقت بازوؤں کی گرفت سے چھڑایا اور قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"لو دیکھو! لڑکیوں کی طرح شرم کے مارے سُرخ ہو رہے ہیں خجالت سے پسینہ تو دیکھو کیسے پھوٹ نکلا ہے ——— ارے میاں آخر یہ تمہاری چچی ہیں ان سے اس قدر کیوں شرماتے ہو؟" ماں نے کہا۔

"بس دیکھ لو! اس نے تو ہمارے ایک ساس سسر کے رشتے کو یاد رکھ چھوڑا ہے پہلا رشتہ بھول گیا ہے" صدیقہ ہنس کر کہنے لگی۔

"جی نہیں! مجھے تو وہی پہلا ہی رشتہ یاد ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے سچے رشتوں پر انسان کے گھڑے ہوئے رشتے کیونکر فوقیت پا سکتے۔ آپ انشاءاللہ ہمیشہ میری چچی ہی رہیں گی۔!"

طیب نے پوری جرأت اور سنجیدگی سے کہہ دیا ماں نے اس کے غصہ اور الجھن کو شرم اور خجالت کا نام دے کر پردہ رکھ لیا تھا مگر ان کے ادا کرنے کے روکھے اور لاتعلق جیسے لہجے کو کونسا رنگ دیتی۔ گھبرا کر صدیقہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جو حیرت سے منہ کھولے ہوئے پہلے ہی استفسار کی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ علیقہ اور عائشہ کی گھورتی ہوئی نگاہوں سے دانستہ چشم پوشی کرتے ہوئے طیب اُٹھ کر باہر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ چاروں

عورتیں چند لمحے حیران سی ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔

"تم نے سنا یہ لڑکا کیا کہہ کر چلا گیا؟"

صدیقہ کہنے لگی۔ اور آسیہ بیگم کے زرد چہرے پر اپنی بدلحاظ جیسی اور غضبناک نگاہیں گاڑ دیں۔ ایسی کیفیت میں اس کی وہ گول گول سیاہ آنکھیں کسی سانپ کی آنکھوں سے مشابہ ہوتی تھیں۔

"اُس نے اپنی طرف سے تمہاری تشفی کرنا چاہی کہ تم اس کی چچی ہو —— بچہ ہے بات کرنی نہیں آئی اُسے۔" آسیہ بیگم اپنے پر قابو پاکر دلجوئی کے انداز سے صدیقہ کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"ایسا بھی کیا بچہ ہے کہ بات ہی کرنی نہیں آتی! اپنی طرف سے خاصی گہری بات کہہ گیا ہے! اگر وہ اس رشتہ سے خوش نہیں تو ہم بھی کیا لڑکی کو ہتھیلی پر لیے بیٹھے ہیں. تم نے خواہش کی تو ہم نے تمہارے اس بے موقعہ سوال ہی کو سرآنکھوں پر لیا۔ کہ چلو ہم نے تمہاری دو لڑکیاں لی ہیں کیا ہے کہ اپنی بچی تمہیں دے دیں. گھر کی لڑکی ہو گی بڑھاپے میں کام آئے گی آج پرائی چھوکریاں کب بات پوچھتی ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی نے تو تمہاری ہمدردی میں ہاں کر لی۔ ورنہ بچپن کی منگنی کے تو میں سراسر خلاف ہوں اُس وقت کسے معلوم تھا لڑکا بڑا ہو کر کیسا اُٹھے گا۔"

صدیقہ اپنی عادت کے موجب بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔

"نہیں چچی جان! امی کا خیال درست ہے طیب اصل میں شرم اور لحاظ کے مارے بات کا جواب ٹھیک سے نہیں دے سکا ورنہ اس کا مقصد خدانخواستہ کچھ ایسا ویسا نہ تھا۔" عتیقہ نے بھی چچی کو تسلی دینے کے لیے کہا۔

"ارے چل لڑکی! تو بھی مجھے ہی جُل دینے لگی۔ ارے وہ صاف

تو کہہ گیا ہے۔ کہ انشاء اللہ ہمیشہ چچی ہی رہو گی۔ گویا ساس کبھی نہ بن سکو گی! اس سے کھُلی اور کیا بات ہو گی۔ ؟" صدیقہ نے حسبِ عادت ہاتھ نچا کر اور گلہ پھاڑ کر کہا۔

"کیوں عائشہ؟ تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا مطلب تھا طیب کا؟"

آسیہ بیگم نے عائشہ سے پوچھا۔

"امی! میری تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا مگر آپ اس سے پوری طرح کھول کر بات پوچھ لیجئے امی! یہ عمر بھر کا معاملہ ہوتا ہے گڑیوں کا کھیل تو ہوتا نہیں کہ بزرگ اپنے چاؤ پورے کرنے کے واسطے بچوں کی زندگیاں تلخ کر دیں۔ لڑکوں کا تو پھر بھی کچھ نہیں بگڑتا وہ باہر اپنا وقت اچھا گزار لیتے ہیں۔ مصیبت بیچاری لڑکیوں کے لیے ہوتی ہے جن کے گلے میں زندگی بھر کا پھندا پڑ جاتا ہے۔"

عائشہ نے واضح لفظوں میں طیب کے طرزِ عمل پر تبصرہ کر دیا۔ تو آسیہ بیگم چُپ رہ گئی۔

"ارے بھئی غضب ہے کہ تم ماں ہو اور ابھی تک تم بیٹے کے عندیہ سے واقف نہیں ہو۔ یا پھر جان بوجھ کر بنتی ہو۔"

صدیقہ نے آسیہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت تلخ لہجہ میں کہا۔

"میرے سامنے تو اس نے آج تک کبھی کوئی ایسا خیال ظاہر نہیں کیا۔ نہ ہی اُس سے کبھی خاص طور پر پوچھنے کی ضرورت ہی پیش آئی، آخر وہ جانتا تو ہے کہ بچپن سے یہ رشتہ ٹھہرایا جا چکا تو شادی ضرور یہیں ہو گی۔ اس سے پُوچھنے کی کیا بات ہے؟"

آخر آسیہ بیگم نے بھی اپنے حواس فراہم کر کے کہا۔ اتنے ہی میں پھپھو حنیفہ آ گئیں۔

"شربت منگواؤں یا چائے پیو گی لڑکیو — ؟"

وہ آتے ہی پوچھنے لگی اور آگے بڑھ کر جواب کے لیے اپنا کان عتیقہ کے منہ کے آگے کر دیا۔

"چائے بنوا لو دادی جان!" عتیقہ نے قدرے بلند آواز سے کہا۔

"صدیقہ بہو! اب اللہ کا نام لے کر عید کے چاند شادی کر دو بچی کی۔ میں بھی اس چل چلاؤ میں اپنے بیٹے کا سہرا دیکھ جاؤں۔ بہو عید کے مہینے کی کوئی اچھی سی تاریخ دیکھ کر مقرر کر لو اب کیا دیر ہے خیر سے بیٹے نے بی اے کر لیا۔ آگے پڑھ کر کرنا بھی کیا ہے اب اپنی زمینداری سنبھالے گا۔"

پوپلے منہ سے حنیفہ پھوپھی جلدی جلدی سب کچھ کہتی گئی۔ اور چائے کا حکم دینے کے لئے دروازہ کی طرف پلٹی۔ دو چار قدم جا کر پھر واپس آئی۔

"اور ہاں ـــــ دیکھنا تین اور تیرہ تاریخ مقرر نہ کرنا۔ ویسے سب دن اللہ کے ہیں! ہاں سچ یہ بھی یاد رکھنا گھٹتے چاند کی تاریخ مقرر نہ کرنا چودہ تاریخ بڑی مبارک ہوتی ہے ـــــ میں تو کہتی ہوں عید کے مہینے کی چودہ تاریخ رکھ لو۔ اللہ پاک راس لائے۔ خدا کرے میری یہ سب بچیاں بوڑھ سہاگنیں ہوں۔"

حنیفہ پھپھو کسی کے جواب کی پروا یا انتظار کیئے بغیر کہتی چلی گئی۔ اور دعائیں دیتی ہوئی واپس گئی۔

"توبہ ہے مغز کھا گئی یہ بڑھیا! لپڑ لپڑ بولتی ہی چلی جاتی ہے۔ چرب زبانی میں شبو میراثن سے بھی دو قدم آگے نکل گئی ہے۔!" صدیقہ نے جل بھن کر اُلٹے ہاتھ سے "دفع" کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دعائیں ہی دے رہی ہیں کیا بُری بات کہہ دی انہوں نے؟" آسیہ بیگم کو صدیقہ کا یہ کہنا ناگوار گزرا وہ اس ضعیفہ کے اخلاص و

محبّت کی بے حد قدر داں تھی اور اس کی بہت عزت کرتی تھی۔

"بیچاری کی مہورت نکالنے چلی ہے۔ یہاں معاملہ ہی تلپٹ ہو گیا۔ یہ بڑے ودوان پروہتوں کی طرح تاریخیں بتا رہی ہے!"

صدیقہ نے آسیہ بیگم کی بات کو ان سنا کر کے پھر حنیفہ پھوپھی کے خلاف زہر اُگلا۔

"خدا نہ کرے کیسی باتیں کرتی ہو دُلہن! دشمنوں کا معاملہ تلپٹ ہو۔ آخر تمہیں میرے جذبات کا تو احترام چاہیئے میں نے کتنے ارمانوں سے پندرہ سولہ برس سے اس دن کا انتظار کیا ہے —— !"

آسیہ بیگم کی آواز بھر آئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پہلے صاحبزادے کو تو رضامند کر لو۔ لڑکی آخر تم سے تو نہیں بیاہی جائے گی۔ کہ میں تمہارے ارمانوں کو دیکھتی پھروں"

صدیقہ کی وہ رفتہ وگزشتہ بے اعتنائی اور بدلحاظی کی عادت ایکا ایکی یوں عود کر آئی جیسے اُس نے اُنس اور رواداری کا مصنوعی لبادہ اُتار کر ایک طرف رکھ دیا ہو۔ اُس نے آسیہ بیگم کے خلوص کی پرواہ کی نہ اُس آنسوؤں کی۔ اُسے تو اور ہی دھڑکا لگ گیا تھا اور وہ اسی مرحلہ پر آسیہ بیگم کو زیادہ سے زیادہ متاثر کر کے دبا لینا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ بیٹے کو اس کی مرضی کے خلاف بھی مجبور کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

"ایسا ہی اُس نے کیا کہہ دیا۔ کہ تمہیں نا رضامندی کا احتمال ہو گیا۔ خواہ مخواہ وہم نہیں کیا کرتے دلہن!"

آسیہ بیگم نے اب بھی نرمی سے کہا۔ صدیقہ کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے مگر آسیہ بیگم اُسے دُولہن ہی کہا کرتی زبان پر چڑھا ہوا یہ لفظ گو مضحکہ خیز ہو گیا مگر اُتر نہ سکا۔

"میں تو ایاز کے ابا سے صاف کہہ دوں گی۔ پھر وہ جانیں اور تم جانو۔ ؟"

اس نے لاتعلقی کی ادا سے منہ پھیرتے ہوئے بات کی۔ اتنے ہی میں شانو چائے کا تشت لیے ہوئے داخل ہوا۔ یہ سب لوگ فرش پر بیٹھے تھے وہیں دستر خوان بچھا کر چائے کا سامان چُن دیا۔ چائے کے ساتھ کئی چیزیں تھیں کچھ گھر کے بنے ہوئے پکوان تھے کچھ لوازمات بازار سے تکلفاً منگوائے گئے تھے کیونکہ صدیقہ جب بھی آتی سمدھن کا رشتہ ہوتے ہوئے بھی حنیفہ اُس کی تواضع و مدارت کا خاص اہتمام کرتی۔

"عائشہ چائے بناؤ ــــــ لو غصہ تھوک دو۔ بچوں کی باتوں کا خیال نہیں کیا کرتے۔"

اُس نے پہلے بیٹی کی طرف اور پھر صدیقہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ صدیقہ اس لحاظ سے اچھی تھی کہ چاہے کیسا ہی غصہ گلہ ہو کھانے پینے سے نہیں روٹھتی تھی ــــــ! اُس نے گو آسیہ بیگم کی بات کا جواب نہ دیا مگر دستر خوان کی طرف متوجہ ہوئی اور ماحضر پر رغبت سے نگاہ ڈالی۔

"شانو! جا کر پان بھی لے آؤ پہلے کے لگے ہوئے نہ اٹھا لانا تازہ لگوا کر لانا!" آسیہ بیگم نے ملازم کو تاکید کی۔

"اے چھوکرے! سن! اُسے کہنا برابر کے پان لگا کر دے گا ــــــ! یہاں آؤ تو پان کے لیے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اُس وقت سے جمائیاں لیتے لیتے منہ پھٹنے کو آ گیا۔" صدیقہ نے عائشہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ہاں کوئی پان نہیں کھاتا اس لیے اگر کوئی پان کا عادی مہمان آجائے تو یاد ہی نہیں رہتا کہ اُس کے واسطے منگوائیں۔ مگر تم تو مہمان نہیں ہو خود کہہ کر منگوا لیا کرو۔" آسیہ بیگم نے کہا۔

"میں ہمیشہ اپنی ڈبیہ ساتھ لے کر چلتی ہوں آج عائشہ سے کہا تھا کہ پان لگا کر ڈبیہ میں رکھ لے مگر یہ بھول ہی گئیں!"

صدیقہ نے عائشہ کے پیش کرنے پر پلیٹ میں سے گلاب جامن اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ قیمہ بھرے سموسے کریمن بڑے خستہ بناتی ہے۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے تو وہ مزہ نہ رہے گا۔ گرم گرم کھاؤ۔"

آسیہ بیگم نے سموسوں کا طشت صدیقہ کے آگے سرکاتے ہوئے کہا تو اُس نے ایک سموسہ اُٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

"طیب کو بھی بلا لیا ہوتا امیّ! سب کے ساتھ چائے پی لیتا وہ بھی۔"
عتیقہ کہنے لگی۔ اتنے ہی میں شانو پان لے کر آگیا۔

"صاحب سے کہیں چائے پئیں آکر۔"

آسیہ بیگم نے ملازم لڑکے سے کہا تو وہ تعمیل کے واسطے مردانہ میں آیا لیکن چند ہی لمحے بعد واپس آکر بتایا۔ کہ صاحب تو باہر چلے گئے۔

"اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ اس کی شادی کر دوں تاکہ گھر میں اس کا دل تو لگے۔ کچھ دلچسپی ہو۔ ورنہ تو اس کا یہی وطیرہ ہے کہ ادھر آیا اُدھر پھر غائب بس باہر کی دوڑ سے نہیں تھکتا۔" آسیہ بیگم نے کہا۔

"اگر شادی کے بعد بھی باہر کی دوڑ ہی کا لپکا رہا تو کیا ہوگا۔؟"

صدیقہ بولی۔ غنیمت تھا کہ اس کے تند لہجہ میں کچھ ٹھہراؤ آگیا تھا۔

"نہیں شادی کے بعد ایسا نہیں ہوتا۔ اب ایاز اور فیاض ہی کو دیکھو۔ سمجھ دار ہوئے پیچھے کب گھر میں بیٹھتے تھے اب ریاض کا یہی حال ہے۔ وہ بھی تو طیب کے ساتھ ہی ہوتا ہے ہر وقت۔ شادی کے بعد یہ بھی بڑے بھائیوں کی طرح گھر میں دلچسپی لینے لگیں گے۔ تمہیں تو یونہی وہم ہو گیا۔"

آسیہ بیگم نے اپنی متواضع اور نرم طبیعت کی بدولت صدیقہ کی تیز تلخ باتوں کو نظر انداز کیا اور متواتر اُس کی دلجوئی کرتی رہی۔ حتےٰ کہ روانگی تک اس کی طبیعت بحال ہو چکی تھی۔ اور گفتگو بھی اعتدال پر آگئی تھی۔

"میں بدھ کے دن تاریخ مقرر کرنے کے واسطے آؤں گی۔ اعجاز کو گھر پر ٹھہرانا۔" آسیہ بیگم روانگی کے وقت صدیقہ سے کہہ رہی تھی۔

"آج جمعہ ہے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"ہاں بس اصل خیر سے آج سے پانچویں روز۔" آسیہ بیگم نے کہا اور بیٹیوں اور سمدھن کو رخصت کرنے ڈیوڑھی تک آئی۔

(١٧)

اگلے روز بی۔ اے کا نتیجہ نکلا۔ طیب اس مرتبہ بھی نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہوا۔ وفا بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی "مبارک سلامت" کا خاصہ ہنگامہ رہا۔ تحفے تحائف ملے خاصی تقریب کا سماں بندھ گیا۔ وفا کے لیے یہ کامیابی اُس کی زندگی کی آنے والی مسرّتوں کا پیغام لے کر آئی۔ اس کی ماں نے وعدہ کیا تھا۔ کہ بی۔ اے کر لینے کے بعد وہ اس کی شادی کر کے اُسے اور اس کے شریکِ زندگی کو اعلےٰ تعلیم کے واسطے بیرونِ مُلک بھیج دے گی اور اب وہ دونوں پاس ہو کر کامگاری اور مرادمندی کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے تھے طیب کی خوشی کا سورج اگرچہ کجلایا ہوا تھا مگر وہ اپنے غیر یقینی حالات کے باوصف دل کو تسلی دیئے ہوئے تھا کہ چاہے کچھ ہی پیش آ جائے۔ وہ سعدیہ سے ہرگز شادی نہ کرے گا۔ ماں کو صاف جواب دے گا کہ وہ جیتے جی اپنی وفا سے جُدا نہیں ہو سکتا ـــــ لیکن وفا! وہ تو اُمیدوں کی دنیا میں چراغاں کیے بیٹھی تھی۔ اور زندگی کی پُربہار راہیں اُسے حدِ نظر تک جگمگاتی نظر آ رہی تھیں۔ ان راہوں پر اُسے طیب کے پہلو بہ پہلو اپنی زندگی کا سفر شروع کرنا تھا ـــــ وہ خوشگوار تصوروں میں

کھوئی ہوئی طیّب کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی امی نے صبح ٹیلیفون کر کے طیّب کو مبارکباد دی تھی اور دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ طیّب پہنچا تو وفا کی چند سہیلیوں کے علاوہ بیگم درانی کی چند ملنے والی خواتین بھی مدعو تھیں۔ ان خواتین کا تعارف بیگم درانی نے طیّب سے بھی کرایا۔ کھانے کے بعد اور سب تو رخصت ہو گئے طیّب ٹھہرا رہا۔

”میں نے وہ درخواست لکھ لی ہے وفی۔! کیا خالہ جان کو بھیج دوں۔؟“ طیّب نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے امی آرام کر رہی ہوں گی۔ اُٹھ جائیں تو بھیجنا —— دیکھوں بھلا کیا لکھا ہے؟“ وہ ہنس کر پوچھنے لگی۔

”نہیں —— تمہیں میں نہیں دکھاؤں گا یہ خط۔ یہ میرا اور خالہ جان کا معاملہ ہے۔“

وہ ملفوف خط کو اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کرسی پر جا بیٹھا۔ وفا ہنسنے لگی۔ اور آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”آج تو تمہارے ہاں بہت ہنگامہ ہو گا۔ اگر امی نہ بلاتیں تو تم شاید نہ آتے۔“ وفا کہنے لگی۔

”تمہارا خیال غلط ہے۔ ساری ہنگامہ آرائی کے باوجود میں یہاں آنے کے واسطے صبح سے تیار بیٹھا تھا۔“ طیّب کہنے لگا۔

”تیار صبح سے بیٹھے تھے مگر آئے ایک بجے؟“ وفا نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بس لوگوں کی آمد و رفت میں رکا رہا جیسے ہی موقعہ پایا۔ بھاگ کھڑا ہوا۔“ وہ ہنس کر کہنے لگا۔

”روشنی کو بھی مبارکباد کا تار دے دیا ہوتا۔“ وفا کو یک دم اپنی سہیلی یاد آ گئی۔

"دے دیا ——!" طیب نے یک دم جواب دیا۔

"میری طرف سے بھی دے دیتے" وہ کہنے لگی۔

"کیا ایک ہی تار ہم دونوں کی طرف سے کافی نہ ہوگا؟" طیب پوچھنے لگا۔

"بالکل کافی ہوگا ——! تم کتنے —— اچھے ہو طیب! میرے دل کی باتیں بلا کہے سمجھ لیتے ہو ——!"

وہ اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ طیب چند لمحے اُس نگاہ کے کیف میں کھویا رہا۔ پھر آہستہ سے اُس کا مرمریں ہاتھ تھام کر مسکرا دیا۔

"اس کے باوجود تمہیں کسی خیال نے وہ کہنے سے روک دیا جو تم نے کہنا چاہا ——! آخر کس خیال نے؟"

وہ اس کے کندھے پر جھکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وفا نے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر منہ پھیر لیا فرطِ حیا سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔

"بتاؤ نا کیا کہنا چاہا تم نے؟" طیب بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔

"جب ایک بات بغیر کہے سمجھی جا سکے تو کہہ کر اُس کے حُسن کو ضائع کیوں کیا جائے؟"

اُس نے حیا کے بوجھ سے جھکی جانے والی نگاہوں کو بمشکل اُٹھا کر ایک نظر طیب کی طرف دیکھا۔

"نہیں —— مجھے شوق ہے تمہارے منہ سے اپنے لیے "اچھے" سے بڑھ کر کوئی لفظ سننے کا ——!"

طیب نے پھر اصرار کیا۔ وفا زیادہ شرما گئی۔

"دل ایسے لفظوں کا بہتر امین ہوتا ہے۔ زبان تک آ کر وہ اپنی صحیح

خوبصورتی کھو بیٹھتے ہیں —— اور پھر تم جان تو گئے اب کیا فرق پڑتا ہے میں کہوں یا نہ کہوں؟"

وفا نے انتہائی کوشش سے غلبۂ حیا پر قابو پایا اور اب وہ حسب عادت سنجیدگی سے طیب کی طرف مخاطب تھی اور طیب اُس کی عادت سے واقف تھا کہ اسے زیادہ مجبور کیا جائے تو وہ چڑ کر فنا ہو جایا کرتی ہے۔

"ہاں یہ بھی خوب ہے۔ تم نے دل ہی دل میں کہا تو میرے دل نے سُن لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے کہ باہمی تعلقِ خاطر اس قدر گہرا ہو!" طیب کہنے لگا۔

"ہاں! بس اب تمہاری سمجھ میں میری بات آئی ——!" وفا ہنس کر کہنے لگی اور اب وہ اپنی خفت پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔ اس کے بعد وہ کبھی روشن کی باتیں کرنے اور گزشتہ واقعات کو دوہرانے لگتے۔ کبھی آئیندہ کے پروگرام مرتب کرنے لگتے۔ باتوں ہی باتوں میں اُنہیں وقت کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ اور ریشم چائے لے کر داخل ہوئی۔

"امی ہمارے ساتھ چائے پئیں گی ریشم؟" وفا نے پوچھا۔

"جی نہیں صاحب! اُن کی چائے کمرے میں جائے گی ——" ملازمہ لڑکی نے ادب سے نگاہیں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"جاگ گئی ہیں ——؟" وفا نے پوچھا۔

"جی ہاں صاحب! نماز پڑھ رہی ہیں۔ پوچھ رہی تھیں۔ کہ آپ نماز سے فارغ ہو گئیں یا نہیں؟" ریشم کہنے لگی۔

"پھر تم نے کیا کہا؟" وفا ہنس کر پوچھنے لگی۔

"میں نے عرض کر دیا کہ صاحبزادی عصر کی نماز ذرا دیر ہی سے پڑھا

کرتی ہیں۔" وہ چائے کا سامان ان کے سامنے میز پر لگاتے ہوئے بولی۔

"خاصی سمجھدار ہوگئی ہو اب تو!" وفا نے تحسین کے لہجہ میں کہا۔

"جی ہاں صاحب!" ریشم لجا کر ہنستے ہوئے بولی۔ طیب اور وفا بھی ہنس دیئے۔

"اچھی مزاج شناس لڑکی ہے۔" طیب کہنے لگا۔

"چائے بناؤں صاحب؟" اُس نے مالکہ کی طرف دیکھ کر اجازت چاہی۔

"ہاں فوراً بناؤ۔ مزاج شناسی کا ثبوت بھی تم نے دے دیا۔ بس چائے پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ کہ تم آئیں۔"

ریشم نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور چائے بنانے لگی۔ پھر نہایت نفاست سے پہلے طیب کو اور پھر وفا کو چائے پیش کی۔ چھوٹی تپائی اُن کی کرسیوں کے درمیان رکھ کر شیرینی اور فواکہات کے پلیٹ ان کے قریب رکھ دیئے اور جانے لگی۔

"سنو ——؟"

طیب نے اپنی جیب سے وہی خط نکالتے ہوئے ریشم کو پکار کر ٹھہرایا وہ قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

"یہ ہمارا عریضہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں لے جاؤ —— یہ تم ہماری طرف سے مٹھائی کے لئے رکھو اور کل ہم آئیں تو اس خط کا پیارا سا جواب ہمیں بیگم صاحبہ سے لے کر دینا۔ ہوں؟"

اُس نے خط اور اس کے دس روپے کا نوٹ لڑکی کی طرف بڑھایا اس نے خط تو لے لیا مگر نوٹ لینے سے تامل کرتے ہوئے مالکہ کی طرف دیکھا۔

” ارے لے لو! صاحب بی۔ اسے میں پاس ہوئے ہیں تمہیں مٹھائی کے لیے دے رہے ہیں!“

مالکہ سے حکم پاکر ریشم نے روپے لے لیے اور جھک کر سلام کیا۔

” یہ صاحبزادی کے پاس ہونے کی مٹھائی ہے ـــــ ہم تو کل مٹھائی کھلائیں گے اپنے پاس ہونے کی!“

” جی ـــــ بہت بہتر صاحب!“ ریشم منہ چھپا کر ہنستے ہوئے بولی اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

طیب اور وفا کے لیے یہ مبارک دن نئی مرادیں اور نئی امنگیں لے کر آیا تھا۔ انہیں اپنی قسمت پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

(۱۸)

یکایک طیب کی آرزوؤں کی بساط دستِ تقدیر نے کچھ اس طرح پلٹ دی۔ کہ اب زندگی کی بازی جیتنے کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ اتنے دنوں سے وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ اپنے دل کو آپ ہی فریب دے رہا تھا جیسے کوئی کسی مچلتے ہوئے بچے کو دور ہی سے چاند تارے دکھا دکھا کر بہلا رہا ہو۔ کچھ ایسی ہی کیفیت طیّب کی تھی۔ ماں کی طرف سے اُسے پوری پوری مخالفت کا خدشہ تھا اس کے باوجود خبر نہیں کونسی موہوم تسلی پر اس نے وفا کو صحیح واقعات سے بے خبر رکھا۔ اور بیگم درّانی کو خواشگاری کے لیے عرضداشت لکھی۔ پھر سارے خطرات سے آنکھیں بند کر کے وہ اپنی خیالی جنت کی طرف بڑھا۔ ساری رکاوٹوں سے قطع نظر وہ اُس روز جلد ہی تیار ہو کر وفا کے ہاں پہنچا۔ تاکہ واپس آکر ماں کے ساتھ آج فیصلہ کن گفتگو کرے اور اُسے اپنے عزم سے آگاہ کر دے۔ محبت کی کامگاری نے اس کے اندر ایسی وارفتگی بھر دی تھی کہ وہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہنے کے واسطے دنیا کی ہر قوت سے ٹکر لے سکتا تھا۔ آج اس کے حوصلے آسمانوں کی بلندیوں سے چھو رہے تھے۔ کامیابی کی سرشاری سے اُس کے قدم زمین پر نہ پڑ

رہے تھے۔ اور اسی سرور و مستی کی کیفیت میں وہ وفا کے پاس پہنچا مگر۔ وہاں دنیا ہی بدل چکی تھی۔ وفا اُسے ناکام محبت کے مرقد پر روتی ہوئی ملی۔

وہ دُنیا جس کی دیواریں کل ہی شام اُن دونوں نے مسرت کی بنیادوں پر استوار کی تھیں، اُجڑ چکی تھیں۔ اس کی ماں نے ایک ہی ضرب میں اسے مسمار کر دیا تھا۔ بیگم درانی نے جو کل تک ان دونوں کی دائمی وابستگی کی تجویزیں سوچ رہی تھی۔ بلکہ اس سلسلہ میں بیٹی کے روبرو اپنی رضامندی ظاہر کر چکی تھی ـــــ یکایک اپنے فیصلہ کو بدل دیا۔ اور یک دم اس قدر کٹھور اور بے مروّت بن گئی کہ وجہ تک بتانے سے انکار کر دیا۔ اور بیٹی کو سختی سے منع کر دیا۔ کہ وہ طیّب کے ساتھ یک قلم دوستانہ تعلقات کو ختم کر دے۔ طیّب سے بھی کہہ دیا۔ کہ وہ اس کا اپنی بیٹی کے ساتھ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں اور یہ قیامت تک ممکن نہیں کہ وہ انہیں شادی کی اجازت دے وفا کے بیان کے مطابق اس فوری تبدیلی کی وجہ طیّب کے باپ کا نام تھا۔ جسے پڑھتے ہی بیگم درانی نے اپنا فیصلہ فوری طور پر بدل دیا۔ اور اب وہ اس انکار پر چٹان کی طرح قائم تھیں۔ انہوں نے طیّب تو کجا اپنی ناز پروردہ بیٹی کی خوشیوں کی پرواہ کی نہ اُس کا دل ٹوٹنے کی۔ اور اپنے دل کو پتھر کی مانند بے حس کر لیا۔ اور طیّب مایوسیوں کے اتھاہ سمندر میں غوطے کھاتا ہوا واپس چلا آیا۔ اُسے حکم ملا تھا کہ وہ وفا کو یکسر بھول جائے اور اس طرف کا کبھی رُخ نہ کرے۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا۔ کہ آسیہ بیگم نے اُسے اندر بلا بھیجا اُس کے حواس بجا نہ تھے اُس نے قدرے تامل کیا۔ اور اپنے ہوش و حواس فراہم کرنے کی کوشش میں منہ ہاتھ دھویا لباس تبدیل کیا اور ماں کے پاس آیا۔

"صبح ہی صبح کہاں چلے گئے تھے طیّب ؟ ایسا ہی کیا ضروری کام تھا۔ کہ

ناشتہ کیے بغیر ہی نکل کھڑے ہوتے؟"

ماں نے اس کے پریشان بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ اور اس کے دُکھتے ہوئے دل پر جیسے ایک اور ضرب لگی ـــــ ناشتہ تو اُسے آج وفا کے ساتھ کرنا تھا۔ اُس نے کل شام آتے ہوئے طیب کو خصوصاً مدعو کیا تھا۔ شاید وہ اُسے صبح ہی صبح خوشخبری سُنانے کی آرزومند تھی۔ مگر ناشتے کی کسے ہوش تھی اس کی وفا روتے روتے بے حال تھی ـــــ یہ سب کچھ سوچتے سوچتے طیب نے بے اختیار لمبا سانس لیا۔

"ہیں ـــــ ؟ کیا بات ہے بیٹے؟ یہ ایسی آہ تو نے کیوں بھری میرے لعل؟" آسیہ بیگم بے قرار ہو گئی۔

"کچھ نہیں امی! کوئی بات نہیں امی! آپ فرمایئے آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا؟" وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں میں نے تمہیں ایک ضروری مشورہ کے لیے بلایا تھا مگر تم پہلے ناشتہ کر لو تو بات کروں!" آسیہ بیگم نے اُسی پُر شفقت لہجہ میں کہا۔

"آپ بات کیجئے۔ ناشتہ میں نہیں کروں گا۔" وہ کہنے لگا۔

"کیوں؟"

ماں نے پوچھا اس کے لہجہ میں تعجب اور فکرمندی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ کہ صحت مند اشتہا رکھنے والا طیب ناشتہ کے لیے سب بچوں سے زیادہ بے صبر تھا اور تاخیر برداشت نہیں کیا کرتا۔

"بس ضرورت نہیں اس وقت!" وہ ماں کی طرف دیکھ کر پھر آزردگی سے مسکرایا۔

"بات کیا ہے؟ کیا کھا آئے کچھ کہیں سے؟" آسیہ بیگم پوچھنے لگی۔

"بہت کچھ!"

اُس نے منہ پھیر کر زہر خند کرتے ہوئے کہا اور بے قراری سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"کہاں سے؟"

آسیہ بیگم اُسی ایک بات پر مصر تھی۔

"ایک دوست کے ہاں گیا تھا امّی! خیر آپ کہیے تو سہی کیا بات ہے؟" وہ ٹالنے کی غرض سے کہنے لگا۔

"بات یہ ہے کہ میں خیر سے تمہاری شادی کی تاریخ مقرر کرتے تمہارے چچا کے ہاں جا رہی ہوں۔"

یہ سُنتے ہی طیب ٹہلتے ٹہلتے یک دم رُک گیا اور استفسار سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی پیشانی کے شکن اور گہرے ہو گئے۔ رنگ کی زردی کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

"کل تمہاری چچی سے میں نے بدھ کے روز آنے کے واسطے کہا مگر اعجاز کسی کام کے سلسلہ میں کراچی جا رہا ہے۔ اسی لیے اُس نے کہلا بھیجا ہے کہ بدھ کی بجائے آج ہی آ جاؤں ——— چنانچہ ساتھ لے جانے کے واسطے کچھ شیرینی چاہیئے ہو گی میں چاہتی ہوں۔ کہ تم خود ملازم کے ساتھ جا کر اپنی نگرانی میں عمدہ قسم کی قلاقند بنوا کر لے آؤ۔ ایسے کام ملازموں پر نہیں چھوڑنے چاہییں۔ برادری میں تقسیم ہونے والی چیز میں ذرا خامی رہ جائے تو لوگ نام دھرتے اور باتیں بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ بات یہ تھی کہ پھپھو نے عید کے چاند کی چودہ تاریخ صدیقہ سے کہی ہے۔ یہی تاریخ وہ بھی پسند کریں گے تمہارا کیا خیال ہے؟"

آسیہ بیگم نے محض طیب کے کان تک پہنچانے کی غرض سے بات بنائی۔

"امّی! آپ ایک طرف تو خود بخود تاریخیں مقرر کر رہی ہیں، اور

دوسری طرف۔ میرا خیال پوچھتی ہیں میں نے آپ کو اپنے خیال سے اُس دن آگاہ نہ کر دیا تھا؟ پھر آپ نے اس معاملہ کو اتنا طول کیوں دیا۔ کہ تاریخ مقرر ہونے کی نوبت آئی؟ کیا آپ چاہتی ہیں کہ چچا اعجاز کے روبرو میں خود انکار کروں؟“

طیب نے بے صبر ہو کر خلافِ عادت بلند آواز سے جواب دیا۔ خشونت سے اس کا چہرہ یک دم تمتما اُٹھا۔

„تو اتنی جرأت کر سکے گا۔ کہ اُس کے روبرو انکار کرے؟“

ماں نے بھی غصہ بھری آواز میں پوچھا۔

„کیوں نہیں؟ کیا آپ ایک شخص کو پکڑ کر سولی پر چڑھانے لگیں تو وہ اپنے چھٹکارے کے واسطے ہاتھ پاؤں نہیں مارے گا؟“ طیب نے ماں سے سوال کیا۔

„تو اس شادی کو تو سولی کے برابر سمجھتا ہے۔“ آسیہ بیگم نے بجائے خود سوال کر دیا۔

„اُس سے بھی بدتر اور عقوبت ناک!“ وہ کہنے لگا۔

„خیر! میں نے بھی اُس دن تجھے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔ کہ میرے جیتے جی تیری شادی اس کے علاوہ اور کہیں نہیں ہو سکتی۔“ آسیہ بیگم نے مارے غم و غصہ کے گلوگیر آواز میں کہا۔

„اور یہ سودے بازی کی شادی ہے آخری دم تک منظور نہ کروں گا۔“ وہ کہنے لگا۔

„اور عشق بازی کی شادی کا ہمارے شریف گھرانوں میں دستور نہیں۔ وہ قیامت تک نہ ہو گی۔ کان کھول کر سُن لو۔!“

„نہ ہو—! میں کب کہتا ہوں۔ میں نے تو اُس دن بھی آپ سے کہا تھا کہ میں اپنا پاسپورٹ بنوا رہا ہوں۔ عنقریب بن جائے گا میں

انگلینڈ چلا جاؤں گا، آپ مجھے خواہ مخواہ پریشان نہ کیجئے ۔ جو بات میرے بس کی نہیں اُس پر مجھے مجبور نہ کیجئے ورنہ خرابی پیدا ہوگی ۔ میں آئندہ تعلیم کے واسطے باہر جاؤں گا! میرے اس فیصلہ کو سوائے میری موت کے اور کوئی نہیں بدل سکتا ۔"

وہ خاصی بلند آواز میں کہتا ہوا باہر چل دیا ۔ تیز آوازوں نے پھوپھی حنیفہ تک کو متوجہ کر لیا ۔ وہ جلدی جلدی برآمدہ سے نکل کر اس طرف آئی ۔

"کیا بات ہے بہو؟ یہ طیب کیوں چیخ رہا تھا ۔ میرے کانوں تک میں اس کے غصہ سے بولنے کی آواز آئی؟"

ضعیفہ حیران ہو کر پوچھ رہی تھی کیوں کہ آج تک ماں تو درکنار، گھر میں کسی سے بھی تلخی کے ساتھ کبھی نہیں بولا تھا ۔

"بد بخت کم ذات چھوکرا اپنی اصل پر آگیا ہے! سچ ہے ہر شے اپنی اصل کی طرف آتی ہے ۔!"

آسیہ بیگم نے فرطِ غضب سے یہ الفاظ خاصی بلند آواز میں کہے کہ طیب اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے ٹھٹک گیا ——— یہ اس کی ماں کیا کہہ رہی تھی؟! اگرچہ وہ دیکھ نہ سکا ۔ کہ پھوپھی حنیفہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر بہو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مزید کچھ کہنے سے اُسے روک لیا ۔ مگر جو لفظ اُس کے کانوں میں پڑ چکے تھے ۔ وہ کافی سے زیادہ تھے اور اُس کے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگے تھے ———

"تو اس کا یہ مطلب ہے ۔ کہ ——— واقعی میرے باپ کے نام کے ساتھ کوئی قابلِ اعتراض راز وابستہ ہے؟ وفا کی امی کے لیے بھی میرے باپ کا نام اجتناب کا موجب بنا ورنہ جب تک انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ میں کس کا بیٹا ہوں ۔ جب تک صرف میری اپنی ذات ان کے پیشِ نظر تھی ۔ میں ان کے واسطے قابلِ قبول رہا ۔ اور جب انہوں نے میری درخواست میں راؤ نیاز احمد

کا نام پڑھا — ؟ وفا کہہ رہی تھی۔ کہ وہ بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس کے بعد میرا پیغام منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا —"

یہ خیالات بجلی کے تیز اور اذیت ناک جھٹکوں کی طرح طیب کے ذہن و قلب کے ہر تار کو جھنجوڑنے لگے۔ وہ اُلٹے قدموں پھر ماں کے کمرے میں پہنچا۔

"امی — ؟ کیا میرے باپ کے نام پر کوئی ایسا داغ ہے جس نے میرے مستقبل کو گہنا رکھا ہے — ؟"

اس نے آتے ہی ماں سے مخاطب ہو کر اچانک سوال کیا تو وہ ایک لمحہ کے لیے کچھ سٹپٹائی مگر فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا کر غضبناک نگاہوں سے طیب کو سرتا پا گھورنے لگی۔ خبر نہیں یہ قلب ماہیت کیونکر ہو گئی کہ اُن شفیق اور پُر محبت آنکھوں سے مامتا کا سوز و گداز بھرا پیار یک دم کافور ہو گیا اور غیظ و غضب کے پردہ کے پیچھے بیٹھی ہوئی کٹھورتا اور بیگانگی سی جھانکنے لگی — ! وہ دونوں چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے گھورتے رہے۔ نہ آسیہ بیگم کی نگاہوں میں بیٹے کے پریشان زدہ اور متغیر چہرے کو دیکھ کر غصہ کی تب وتاب میں فرق آیا نہ ہی اُن پُر جلال نگاہوں کے سامنے طیب کی آنکھیں پاسِ ادب سے جھک سکیں۔ بلکہ اُن میں استفسار اور اجتناب اور گہرا ہو گیا۔ کیا یہ اس کی اُسی شفیق ماں کا چہرہ تھا ؟ وہ حیران ہو کر دیکھتا رہ گیا۔ آسیہ بیگم اس کے اس مواخذہ کے انداز سے اور بھی بھڑک اٹھی۔

"کس کا ذکر کرتا ہے ؟ میں کیا جانوں ؟ مگر جس شخص کا تو بیٹا کہلاتا ہے اس کے نام کو تو آج تک لوگ تعظیم دیتے ہیں۔ اس کے بے داغ نام کو تو تیرے جیسے ناہنجار نے گہن لگایا ہے ؟"

وہ حقارت اور غصہ کی بھرپور نگاہ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی جا رہی تھی۔ راجپوتنی کی غضبناک آواز نے آج تو پھپھو حلیفہ تک کے کان کھول دیئے تھے۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں کا رعشہ اور بھی شدید ہو گیا تھا۔ مگر وہ تیزی سے ڈولتی ڈگمگاتی آسیہ بیگم کے قریب پہنچی اور اس کا کندھا جھنجھوڑ کر غصہ سے بولی۔

"دیوانی ہوئی ہے بہو؛ یوں کوئی جوان بیٹے کے منہ لگتا ہے؛ کچھ ہوش کی خبر لو کیا ہو گیا تمہیں؟"

"پھر آپ نے ابھی ابھی مجھے بداصل کیوں کہا؛ پھر یہ کیا ہوا کہ راؤ نیاز احمد کا بیٹا ہونے کی پاداش میں میری بسی بسائی جنت اُجڑ گئی۔ وفا کی امی نے میری درخواست محض یہ کہہ کر رد کر دی۔ کہ وہ رلؤ نیاز احمد کے بیٹے سے اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں کر سکتی ——!"

طیب اس حالتِ اضطراب میں وہ کچھ کہہ گیا جس کے اظہار کے واسطے عام حالت میں اُسے لفظ تک نہ ملتے۔

"کیا —— ؛ درخواست کیسی؟"

آسیہ بیگم حیرت زدہ سی ہو کر پوچھنے لگی۔ مگر طیب پہلے ہی بہت کچھ بلکہ سب کچھ کہہ چکا تھا مزید وضاحت کی چنداں ضرورت ہی نہیں تھی اور آسیہ بیگم خود ہی سمجھ کر بولی۔

"اچھا؛ تو یہ بات ہے؛ صاحبزادے نے اپنے طور پر ہی رشتے ناطے جوڑنے شروع کر رکھے ہیں؛ اُس کمبختی کو اب راؤ نیاز کے بیٹے سے زیادہ دولت مند کوئی اور مل گیا ہو گا اپنی بیٹی کا خریدار ——! اس وجہ سے اُس نے انکار کر دیا ورنہ راؤ نیاز احمد جیسے فرشتہ خصلت شخص کے نام میں اُسے کونسا اوگن نظر آیا! مجھے لے چلو تو اس کے پاس! میں ذرا چل کر پوچھ تو لوں اُس حرافہ سے؟"

وہ انتہائی غصے سے طیب کو گھورتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کس کی بات کر رہی ہو ــــ؟ کس نے کچھ کہا ــــ؟ ارے کچھ مجھے بھی تو سمجھاؤ بہو؟“

پھپھو خلیفہ نے کیونکہ طیب کی گفتگو نہ سنی تھی اس لیے وہ آسیہ بیگم کی بات پر حیران سی کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”یہ تمہارے لاڈلے کہیں اپنی مرضی سے شادی رچانے والے تھے لونڈیا کی ماں نے اس لیے انکار کر دیا کہ راؤ نیاز احمد کے بیٹے کیوں ہیں؟“

آسیہ بیگم نے خونخوار نظروں سے طیب کی طرف دیکھتے ہوئے خلیفہ پھپھی کو بتایا۔

”تو اس میں لڑکے کا کیا قصور بہو؟ تمہیں کیا معلوم باہر دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ تم گھر میں بیٹھنے والی کیا جانو ان بے مہار پھرنے والی چھوکریوں کے ہتھکنڈے ــــ؟ سنتی ہوں کہ مالدار لڑکوں کی تاک میں پھرتی ہیں۔ بھولا بھالا اور پیسے والا دیکھ کر اسے بھی ہاتھوں پر ڈال لیا ہوگا ــــ یہ تم نے ٹھیک کہا اب کوئی زیادہ امیر آدمی مل گیا تو اسے جواب دے دیا ــــ!“

پھپھو خلیفہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔ اور پھر طیب کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں صدقے گئی میرے بچے کو خواہ مخواہ حیران کیا بدبختوں نے! چلو اچھا ہوا ”خس کم جہاں پاک!“ شکر کرو ایسی حرافہ سے خدا نے جلدی چھٹکارا دلوا دیا۔ بھلا بیٹے ایسی چھوکریاں کہیں شریف گھروں میں پچتی ہیں۔ جو بے حیائی سے دیدے پھاڑے سر عام غیر مردوں کے منہ جھانکتی پھری ہوں؟ کل کو زیادہ پریشانی اٹھانا پڑتی بدنامی الگ ہوتی۔ یہ تو خدا نے تمہیں اچھے وقت میں بچا لیا!“

محبت شعار بزرگ عورت، طیب کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھے ہوئے سمجھا رہی تھی۔ اپنی وفا کے لیے ایسے نازیبا کلمات ان لوگوں کے منہ سے سُن کر اس کا دل خون ہو رہا تھا مگر وہ اس خیال سے چُپ تھا۔ کہ وہ نادانستہ اور پھر مخالفت کی وجہ سے یہ سب کچھ کہنے پر مجبور ہیں۔ علاوہ ازیں اس کے ذہن میں اس وقت ہر وہ بات جس کا تعلق اس کے باپ سے نہیں تھا۔ محض ثانوی حیثیت کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں تو صرف یہ ایک سوال تھا۔ کہ وہ کیا راز ہے جس نے بیگم درانی کو انکار پر مجبُور کیا؟ وہ کیا احساس ہے جس نے آسیہ بیگم کے منہ سے الفاظ نکلوائے اور اس کا دل ایک دم پھر تڑپ اُٹھا۔

" دادی جان! مجھے امی سے پوچھ کر بتائیے کہ اُنھوں نے مجھے کس بنا پر کم ذات اور بداصل کہا؟" وہ روہانسی آواز میں بڑھیا کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہنے لگا۔

" پہلے مجھے چل کر اس حرافہ عورت سے پوچھنے دے کہ اُسے راؤنیاز کے نام میں کونسی قابلِ اعتراض بات نظر آئی ___؟" آسیہ بیگم نے اب بھی اُسی جوشِ غضب کے ماتحت پوچھا۔

" اس کی وجہ بھی یقیناً وہی ہے جس کے ماتحت ابھی ابھی آپ نے مجھے چند نئے ناموں سے پکارا ___ کوئی ایسی بات ہے جو انہیں بھی معلوم ہے اور آپ کو بھی۔ مگر میں اس سے لاعلم ہوں۔

لیکن میں اُس بات کو جاننا چاہتا ہوں اور معلوم کر کے رہوں گا کیونکہ اس کا میری ذات سے گہرا تعلق ہے ___؟ آپ کو مجھے بتانا ہو گا۔ کہ وہ کیا بات ہے؟"

وہ خاصی بلند آواز سے بولا جسے پھوپھی حنیفہ نے بھی سُنا۔

" پاگل پن کی باتیں نہیں کیا کرتے ___! غصہ میں تو مائی خبر نہیں کیسے

کیسے کوسنے اور گالیاں دیا کرتی ہیں۔ تمہیں ماں کا اتنا کہنا اس لیے ناگوار گزرا کہ اس نے آج تک تمہیں کبھی نہیں پھٹکارا۔ ہمیشہ تمہارے چاؤ چونچلے کرتی رہی۔ اور تمہیں اللہ پاک ہزاری عمر دے نہ ہی تم نے کبھی اس کا کوئی حکم ٹالا۔ اب زندگی کے بڑے نازک مسئلے پر اگر وہ تمہاری مرضی کرنے سے مجبور ہے کہ سعدیہ کو اُس نے پہلے روز گود میں لیتے ہی مانگ لیا اور انگوٹھی پہنا دی ـــ ادھر تم اس کی بات ماننے سے یوں مجبور تھے کہ تمہارا دل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔

اب وہ کانٹا خود بخود نکل گیا تو سعادت مند بیٹے کی طرح ماں کی بات مان لو ابھی سارے گلے شکوے مٹ جائیں گے ـــ!

دادی اس کی بلائیں لے لے کر کہہ رہی تھی۔ اُدھر آنکھوں ہی آنکھوں میں آسیہ بیگم کو ڈانٹ رہی اور خاموش رہنے کی فہمائش کر رہی تھی۔ آسیہ بیگم دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگی کہ طیب پر دادی کی باتوں کا کیا اثر ہو رہا ہے بات معقول تھی۔ لڑکے کا جوش کچھ دھیما ہو چلا وہ سر جھکائے ہوئے سنتا رہا اور کچھ نہ بولا۔

"چلو ماں کے گلے سے لگ جاؤ! کل وہ تمہاری کامیابی پر عید سے بڑھ کر خوشی منا رہی تھی اور آج تم نے اُس کی دلی خوشی پر اوس ڈال دی۔"

وہ طیب کو پکڑ کر آسیہ بیگم کے روبرو لے آئی اور اُسے بھی اشارہ سے کچھ سمجھایا تو اُس نے بیٹے کے لیے آغوش کھول دی۔ وہ ماں کے سینے سے لگ کر پکے ہوئے پھوڑے کی طرح پھوٹ پڑا اور دردناک سسکیاں بھرنے لگا۔ دونوں عورتیں اُسے پیار کرتی اور تسلی دیتی رہیں۔ جب وہ اپنے دل کا بخار آنسوؤں کی صورت میں نکال چکا تو نہایت شکستہ اور سرنگوں بیٹھ گیا۔ اس کی حالت پر آسیہ بیگم کا دل دُکھنے سا لگا۔ لیکن دُکھن کے اس احساس کے پیچھے اپنی مقصد براری کی تسکین اُسے سہارا دیئے ہوئے تھی۔ اُسے اُمید بندھ گئی کہ دوسری طرف سے مایوس ہو کر اب وہ رضامند

ہو جائے گا۔ اسی خیال سے اُس نے بیٹے کو نہایت فراخ دلی سے معاف کر دیا۔

"اچھا جاؤ اب جا کر منہ ہاتھ دھو ڈالو اور کھانا کھا کر آرام کرو۔ دھوپ تیز ہو گئی اب باہر نکلنے کا وقت نہیں رہا میں چوکیدار سے کہہ کر منگوا لوں گی شیرینی۔"

آسیہ بیگم نے کن انکھیوں سے اس کے چہرے پر تاثرات کا مشاہدہ کرنا چاہا۔ وہ بدستور سر جھکائے اپنی ہی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جیسے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔ اور آسیہ بیگم کے لیے یہ اُمید افزا صورت تھی۔ اتنے میں رحمن بُوا نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ حنیفہ پھوپھی نے اُسے خود ہی کھانا نکال کر دسترخوان پر لانے کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ اس موقعہ پر اپنی موجودگی ضروری خیال کرتی تھی۔ اُسے خدشہ تھا کہ کہیں پھر کوئی اختلاف رونما نہ ہو جائے۔

"تجھے کیا خبر کیسی چاند سی دولہن پسند کی ہے تیری ماں نے؟ تجھے یاد تو ہوگا آخر ایسی چھوٹی تو نہیں تھی وہ جب تجھ سے اس کا پردہ ہو گیا۔ سارے خاندان میں اس شکل کی کوئی لڑکی نہیں۔" پھوپھی حنیفہ نے ایک اور پانسہ پھینکا۔

"ریاض کی سی صورت ہے اپنی سعدیہ کی ——! ریاض کے نین نقش مردانہ ہیں۔ اُس کے خدوخال میں زنانہ حُسن کی نزاکت اور بھولا پن ہے۔" آسیہ بیگم کہہ رہی تھی۔

"خوبصورت۔ سلیقے والی، پڑھی لکھی، غریب مزاج لڑکی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور ہمیں کیا چاہیئے ——؟"

حنیفہ اس کے جھکے ہوئے سر پر زور شور سے دستِ شفقت پھیر پھیر کر کہہ رہی تھی۔

"بڑوں کا کہنا ہے۔ کہ بیوی ہو تو ایسی کہ جس کے چہرے پر کسی نامحرم کی نگاہ تک نہ پڑی ہو۔ جس کی پاکدامنی کی قسم کھائی جا سکے۔ اور میری سعدیہ خدا کے فضل سے ایسی ہی نیک، شریف، پاک دامن اور خلیق ہے۔ تمہاری بہنیں اس کی تعریف کرتے کرتے نہیں تھکتی۔ انہوں نے اُسے ہاتھوں کی چھاؤں کر کر کے خود اس طرح پروان چڑھایا ہے جیسے کسی نازک پودے کی نگہداشت کر کے کوئی ہنرمند مالی پالتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اُسے ان کے بھائی کے چمن میں بہار لے کر آنا ہے۔"

آسیہ بیگم اپنے سابقہ سلوک کی تلافی کرنے کے لیے مسلسل اُس کی پشت پر محبت سے ہاتھ پھیر پھیر کر کہتی جا رہی تھی۔ اور طیب پر اُس کے لفظوں کا اور کوئی اثر ہو یا نہ ہو، سر دست وہ اسی کو غنیمت سمجھ رہا تھا۔ کہ بارے اس کا وہ بے پناہ غیظ و غضب تو فرو ہوا۔ جس کا اُس نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ مشاہدہ کیا تھا اور اُس کے دل میں ایک دہشت سی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ خاموش تھا اور اپنا مافی الضمیر زبان پر لاتے لاتے رک جاتا تھا۔ کیونکہ ماں کی مرضی کے مخالف کہہ کر اور ٹھہرے پانی میں پھر سے پتھر پھینک کر اُسے متلاطم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اور اُس کے موافق اور حسبِ منشاء کہنے کے واسطے اس کے پاس کوئی لفظ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ خاموش رہا۔ مگر اس کی خاموشی کو دونوں عورتوں نے حسبِ دستور "نیم رضا" پر محمول کیا۔

اتنے ہی میں رحیمن بوا نے دسترخوان لگایا۔ گھر کے تینوں افراد دسترخوان پر آ بیٹھے۔ آج کی چیزیں طیب کی پسندیدہ پکوائی گئی تھیں۔ مگر وہ تو محض آسیہ بیگم کے پاسِ خاطر سے کھانے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔ ورنہ اُسے اشتہا مطلق نہ تھی۔ حلق میں کانٹے سے پڑے تھے نوالہ گلے میں اٹک اٹک جاتا تو وہ پانی پی پی کر نگلتا۔ آخر وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں

چلا آیا۔ اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اُس کی حالت اُس وقت سزائے موت کے اُس مجرم سے مختلف نہ تھی جس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالا جا چکا ہو اور وہ اس کی گرفت کے تنگ ہونے کے لمحہ کا منتظر ہو۔ اور وہ اس مرگِ ناگہاں سے بچنے کے لیے جد و جہد کرنے کے طریقے سوچنے لگا۔ ماں سے وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اُس کا یہ زعم کہ وہ ضد کر کے حسبِ معمول اُسے منا لے گا، سراسر باطل ثابت ہو چکا تھا۔ آج اور اس سے ایک مرتبہ پیشتر اُس نے آسیہ بیگم کے جوشِ غضب کا مظاہرہ دیکھا اُس سے یہ بہت خائف ہو چکا تھا۔ اور کسی قیمت پر بھی دوبارہ وہ آفت مول لینے کو تیار نہ تھا۔ مسلسل کئی گھنٹے کے غور و فکر کے بعد اس نے یہ تدبیر سوچی کہ اعجاز چچا کو لکھ کر اس وقت تک کے واسطے مہلت طلب کرے کہ وہ بیرونِ ملک جا کر قانون کی سند لے آئے۔ اس مجوزہ تقریب کو اُس کی واپسی پر ملتوی رکھا جائے۔ اور اس سے پیشتر کہ آسیہ بیگم وہاں پہنچے، اُس نے ملازم لڑکے شانو کو رقعہ دے کر روانہ کر دیا، آسیہ بیگم اعجاز کے ہاں پہنچی تو وہاں بھی بڑے کرّ و فر کے ساتھ اس کے خیر مقدم کی تیاریاں تھیں۔ بڑے لگاؤ کے ساتھ صدیقہ نے سمدھن کو گلے لگایا دونوں بیٹیوں کی تقریبوں پر وہ اتنی نہال نظر نہ آئی تھی جس قدر کہ اس وقت تھی۔ آسیہ بیگم نے آبی رنگ کے قیمتی مگر ہلکے ریشم کا لباس پہن رکھا تھا۔ اور جوشِ مسرت سے گلنار ہو رہی تھی۔ پھوپھی حلیفہ کی خوشی کا بھی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ سفید، ریشمین جوڑا پہنے صدر میں سمدھن بنی بیٹھی تھی اور پھولی نہیں سما رہی تھی۔

”اے لڑکیو! عتیقہ! عائشہ! تم لڑکے والوں کی طرف سے ہو یا لڑکی والوں میں سے؟“ وہ پوپلے منہ سے ہنس کر از راہ مذاق پوچھنے لگی۔

"دادی اماں! اگر آپ نے ہمیں لڑکے والوں میں سے شامل کرنا ہوتا تو یقیناً ہمیں بلوا کر اپنے ساتھ لائی ہوتیں اب تو ہم لڑکی والوں ہی میں ہیں۔" عائشہ نے ہنس کر کہا۔

"نہیں بھئی ہم دونوں طرف سے ہیں!"
عتیقہ بولی جو اس موقعہ پر مارے خوشی کے کھلی جا رہی تھی۔

"جی ہاں! یہ چمگادڑ کی طرح دونوں طرف ہیں —— پرندوں میں بھی اور چوپائیوں میں بھی!"
ریاض نے قہقہہ لگا کر کہا۔ تو سب ہنسنے لگے۔

"یوں تو پھر تمہارا باپ بھی دونوں طرف ہے۔ کیا وہ بھی چمگادڑ ہی ہے!"
آسیہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا تو مکرر قہقہہ پڑا۔ اتنے ہی میں خادمائیں صندل اور کیوڑا ملا ہوا دودھ چاندی کے نقشی کٹوروں میں بھر بھر کے پیش کرنے لگیں۔

"اعجاز کو تو آنے دیا ہوتا۔" آسیہ بیگم کہنے لگیں۔

"انہیں چند آڑھتی ملنے کے لیے آ گئے وہ منڈی والے دفتر میں اُن کے ساتھ گئے ہیں کیونکہ اُن لوگوں کو کچھ کاروباری معاملات طے کر کے جلد ہی واپس جانا تھا۔ بس آتے ہی ہوں گے مگر اب اُن کے آنے تک سب کو پیاسا تو نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ گرمی کی شدت ہے۔ آتے آتے پیاس لگ آئی ہو گی۔"

صدیقہ اس وقت کمال محبت کا مظاہرہ کر رہی تھی اس کی رواداری اور توجہ قابلِ تعریف تھی! مشروب نوش کیا جا چکا تو عتیقہ عطر اور پان عزیز مہمانوں کی خدمت میں پیش کرنے لگی۔ اور اتنے ہی میں اعجاز داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دونوں بڑے بیٹے بھی تھے۔ کمرہ خوشبو سے معطر

تھا۔ اور قہقہوں کی گونج سے فضا میں ارتعاش تھا۔ مگر ان تینوں کے چہرے کچھ ایسے سنجیدہ تھے کہ ایک ہی لمحہ میں سب پر مکمل سکوت چھا گیا اور سب ایک دوسرے کی طرف حیران کن نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اس خوشی کی چھوٹی سی محفل کو بے لطف کرتے ہوئے اعجاز جیسے بے جگر اور بے حس شخص کے دل پر بھی صدمہ سا گزرا۔ اور اپنی ذاتی مفاد سے قطع نظر بھی وہ اس موقعہ پر شاید صرف اپنی غمزدہ بھاوج کے لیے رنجیدہ ہوا۔ کیونکہ اس کا ذاتی مفاد تو واقعی اس میں تھا۔ کہ اس کا داماد بیرونِ ملک جاکر اعلےٰ تعلیم حاصل کر کے آئے اور ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہو۔

"کیا بات ہے اعجاز؟ خیریت تو ہے؟" آسیہ بیگم نے پوچھا۔

"سب خیریت ہے بھابی جان! آپ فرمائیے مزاج کیسے ہیں؟ میں نے تو اپنے گرد خواہ مخواہ جنجال ڈال رکھے ہیں۔ اتنی فرصت نہیں ملتی کہ خیریت تک پوچھنے آپ تک چلا آؤں۔" وہ جیسے بات ٹالنے کو کہہ رہا تھا۔

"اس وقت کیا پریشانی ہے؟"

آسیہ بیگم کے دل میں جیسے وسوسہ جاگ اٹھا۔ اور حقیقت کا شائبہ سا نظر آنے لگا۔

"میں —— درحقیقت پریشان نہیں، محض آپ سب کی موجودہ خوشی میں کچھ برہمی پیدا ہونے کے خیال نے مجھے البتہ کچھ متردد کر دیا —— اور یہ طیّب کی سستی سے ہوا۔ وہ اگر مجھے کم از کم صبح اپنے عندیہ سے آگاہ کر دیتا تو آپ کو خود آکر ساری بات سمجھا دیتا ——؟"

وہ ابھی پوری بات ختم نہ کرنے پایا تھا کہ صدیقہ نے بے صبر ہو کر بات کاٹی۔

"اصل بات کہو جلدی سے ——! یہ لمبی چوڑی تمہید کیا لے بیٹھے

کس بات سے تمہیں طیب آگاہ کرتا؟

وہ شوہر کی طرف بدلتے ہوئے تیوروں سے دیکھ کر چیخی۔

"میں بتا ہی تو رہا تھا تم بے صبر ہو جاتی ہو ـــــ طیب نے مجھے رقعہ لکھ کر اپنا عندیہ سمجھایا ہے وہ فی الحال اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا ہے اُس نے مجھ سے درخواست کی ہے۔ کہ میں اس کی امّی اور چچی کے شوق پر اس کے مستقبل کو خطرے میں نہ ڈالوں کیونکہ شادی کے بعد کوئی لڑکا تعلیم مکمل نہیں کر سکتا۔ وہ اس وقت تک خانہ داری کے سلسلہ میں نہیں پڑنا چاہتا جب تک کہ خود اپنی ذات سے کسی قابل نہ بن جائے وغیرہ ـــــ"

اعجاز بیان کر رہا تھا اور آسیہ بیگم کے رُخ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

صدیقہ کی حالت متغیر ہو گئی وہ فرطِ غضب سے انگارہ بن گئی۔

"تو یوں کہو کہ اُس نے شادی سے انکار کر دیا ـــــ! سیدھی بات کو اُلٹ پھیر کر چیستان بنانے سے کیا فائدہ؟" وہ تو آسیہ بیگم کی طرف بھی شبہ کی نگاہ پھینک کر بولی۔

"ہر بات کا اُلٹا مطلب نہ سمجھا کرو۔ خدانخواستہ انکار کس نے کیا؟ اُس نے تو محض یہ التجا کی ہے۔ کہ چند سال ملتوی کر دیں۔ وہ انگلینڈ جا کر قانون کی سند لینا چاہتا ہے اور میرا تو خیال ہے وہ ٹھیک کہتا ہے کیوں ایاز تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے بڑے بیٹے سے پوچھا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ طیب نے نہایت سمجھداری کا ثبوت دیا ہے ورنہ اس کی بجائے کوئی اور نوجوان ہوتا تو باپ کی املاک پر تصرف کرتے ہوئے اپنی قوتِ بازو کو کام میں لانے سے گریز کرتا اور تن آسان بن جاتا پڑھنا پڑھانا تو درکنار۔ غنیمت ہے کہ وہ اسقدر شوق رکھتا ہے اور اعلےٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ علاوہ ازیں سعدیہ کی عمر ابھی بہت چھوٹی ہے

پندرہ سال کی بھی نہیں ہوئی ابھی تو۔ اُسے بھی پڑھنے دیں تو اچھا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ خود طیب اعلےٰ تعلیم کا شائق ہے۔"

ایاز نے تو نہایت دیانتداری سے اپنا خیال ظاہر کر دیا۔

"شادی کے بعد بھی تو جا سکتا تھا۔ کیا شادی شدہ آدمیوں کو انگلینڈ جانا منع ہے؟" فیاض نے کہا۔

"ہاں پوچھو بھلا —— ؟ کیا شادی کے بعد نہیں جا سکتا وہ؟ میں تو سوچتی ہوں وہ ٹالنا چاہتا ہے۔ میں اس دن اس لڑکے کی باتیں سن چکی ہوں۔ اس کے تیور دیکھ چکی ہوں۔ میں تمہاری طرح اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔" صدیقہ نے شوہر کو مخاطب کر کے تلخ لہجہ میں کہا۔

"اگر وہ نہ چاہتا ہو تو صاف انکار کر سکتا ہے۔ آخر اُسے لگی لپٹی رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ ایک خود مختار آدمی ہے اور پھر بھابی کو اس کا عندیہ معلوم ہوگا۔ کیوں بھابی جان؟" اعجاز نے اب روئے سخن آسیہ بیگم کی طرف پھیرا۔

"مجھ سے بھی اس نے یہی کہا تھا کہ وہ انگلینڈ جا کر اعلےٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شادی کو اس کی واپسی تک ملتوی کر دیا جائے مگر میں نے اُسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا کہ آخر ہم لوگ کس لیے بیٹھے ہیں کہ بچے شادی بیاہ کے معاملوں میں خود دخل دیں۔ جب میں نے نہ سُنی تو اُس نے چچا کو لکھ بھیجا لیکن اُسے جانا ہی ہو تو بھی جیسے ابھی فیاض نے کہا ایک یہ بھی تو صورت ہو سکتی ہے۔ کہ شادی کے بعد چلا جائے۔" آسیہ بیگم نے کہا۔

"نہیں —— میں یہ مناسب نہیں سمجھتا۔ شادی کے بعد جانا تو اس صورت ہی میں موزوں ہے کہ بیوی کو بھی ساتھ جانا ہو۔ اور یہ بات ہمارے ہاں رائج نہیں۔ کہ لڑکیاں ولایت جاتی پھریں۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ اس کی واپسی پر ہی ملتوی رکھیں۔ ابھی دونوں کمسن ہیں، تین سال کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں

اس وقت ان کی عمر بھی شادی کے لیے عین مناسب ہوگی میں چاہتا ہوں سعدیہ کو بھی بی۔ اے تک ضرور پڑھاؤں تاکہ وہ طیب کی نگاہوں میں جاہل قرار نہ پائے۔"

اعجاز کہہ رہا تھا۔ اور طیب کے اس اقدام کو عین مستحسن قرار دے رہا تھا۔

"آپ لوگ یوں آزردہ کیوں ہو گئے؟ شادی بیاہ کوئی اپنی دل لگی اور تفریح کا سامان تو نہیں ہوتا۔ آخر یہ بچوں کا زندگی بھر کا معاملہ ہوتا ہے اس میں سب پس و پیش سوچنا لازم ہے۔ میں یہی مناسب خیال کرتا ہوں۔ کہ طیب کی واپسی تک اس تقریب کو ملتوی کر دیا جائے۔ سر دست اس کا اعلیٰ تعلیم کے واسطے بیرون ملک جانا شادی سے زیادہ ضروری ہے اور اس دُوراندیشی میں وہ لڑکا ہم سب پر سبقت لے گیا۔!"

اعجاز کہہ رہا تھا۔ اس کے لیے طیب کی یہ بات نہ صرف قابلِ قبول ہی تھی بلکہ نہایت پسندیدہ تھی۔ اس نے آسیہ بیگم کو تسلی دے کر واپس بھیجا اور صدیقہ کو بھی سمجھا بجھا کر اس کی دلجمعی کر دی۔

◆

(۱۹)

گو آسیہ بیگم کے لئے اتنا ہی غنیمت تھا۔ کہ اعجاز اور صدیقہ کے سامنے اُس کی بات رہ گئی اور جھوٹا نہ ہونا پڑا۔ مگر اُس کے دل پر ایک بوجھ سا آپڑا اور اس کی تسکین قلب جاتی رہی۔ اگر واقعات کی مدتوں کی سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق بالترتیب انجام پا جاتے تو زندگی کے یہ آخری دن بھی عافیت سے کٹ جاتے مگر طیّب کی ناعاقبت اندیشی اور خود سری کے نتیجہ پر اس کے مرتب کئے ہوئے لائحہ عمل میں رخنہ پڑ گیا۔ اور اس کے نتیجہ پر اس کے ذہنی سکون میں بھی خلل واقع ہوا۔ اگر یہ شادی بخیر و خوبی انجام پا جاتی تو نہ صرف ایک اہم فرض ادا ہو جاتا ہے بلکہ آسیہ بیگم کی ایک دیرینہ حکمتِ عملی پوری ہو جاتی اور سب خطرے مٹ جاتے۔ اب التوا کے اس زمانہ میں خبر نہیں کیسے واقعات رونما ہوں اور ان کے زیر اثر خبر نہیں کیا حالات پیدا ہو جائیں۔ آسیہ بیگم واپس گھر آئی تو انہی خیالوں غوطے کھا رہی تھی۔ اِس کے علاوہ ایک اور خیال بھی پریشان کن تھا۔ وہ غصہ کے عالم میں بے سوچے سمجھے چند ایسے الفاظ زبان پر لا چکی تھی۔ جو سراسر خلاف مصلحت تھے۔ ان سے طیّب کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہو چکا تھا۔ اور شبہ چاہے کتنا ہی خفیف ہو بے حد خطرناک

ہوتا ہے۔ پھر وفا کی ماں نے بھی طیّب کے پیغام کو راؤ نیاز احمد کے حوالے رد کر دیا تھا۔ یہ دونوں اِس لڑکے کے دل پر اثر انداز ہوئی تھیں ممکن ہے وہ اس مایوسی کے ماتحت اِن باتوں کو اپنے ذہن میں بٹھا لے اور پھر اپنے اِن شبہات کو حقائق میں تلاش کرنے کی کوشش ہی میں اپنا اور اپنے ساتھ کئی اور ہستیوں کا مستقبل تباہ کر ڈالے! آسیہ بیگم اُس رات ایک لمحہ کے واسطے بھی نہ سو سکی۔ اور تمام رات اُس نے بستر پر کروٹیں بدلتے یا بے چینی سے صحن میں ٹہلتے ہوئے گذاری۔

اُس نے طیّب سے کچھ کہا۔ وہ رات کافی دیر سے گھر آیا تو چپ چاپ دبے پاؤں اندر کے صحن میں چلا گیا جہاں اُس کا بستر بچھا ہوتا تھا۔ ذرا ہٹ کر شانو کی پلنگڑی بچھی تھی جو اُسے کھانا دینے کے انتظار میں کرسی پر پڑا سو رہا تھا۔ طیّب نے اُس کا کندھا جھنجھوڑ کر جگایا اور اشارہ کیا کہ جا کر سو رہے۔

"کھانا گرم کروں صاحب؟" شانو بڑبڑا کر اُٹھتے ہی بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

"آہستہ بول مردود! جا سو جا کھانا نہیں چاہیے ——!"

طیّب نے اُسے ذبی آواز میں ڈانٹ کر کہا۔ اُسے ڈر تھا۔ کہ ماں جاگ نہ جائے۔ مگر آسیہ بیگم اپنے بستر پر نڈھال سی پڑی ہوئی جاگ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر اِس قدر بوجھ تھا۔ ذہن میں منتشر اور اور پریشان کن خیالات کا ایسا ہجوم تھا۔ کہ اُس میں طیّب سے اس کے اِس جرأت مندانہ طرزِ عمل کا مواخذہ تک کرنے کی ہمت نہ ہوئی طیّب نے درمیان کا دروازہ بند کر دیا اور اپنے سرہانے رکھا ہوا لیمپ جلایا۔ اُسے سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ پڑھنے کی عادت تھی وہ عموماً پڑھتے پڑھتے سو جاتا اور اکثر آسیہ بیگم یا حنیفہ کو اُٹھ کر لیمپ بجھانا پڑتا۔ مگر اس رات

جب بھی شیشوں میں سے جھانک کر آسیہ بیگم نے دیکھا اُسے پڑھتے ہوئے پایا۔ یا پھر خود اپنی طرح اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے۔ آخر صبح کے قریب جس وقت آسیہ بیگم وضو کر رہی تھی وہ روشنی بجھا کر بستر پر پڑا رہا۔

صبح ناشتہ سے پہلے ہی وہ باہر چلا گیا اور شانو کے ہاتھ ماں کو رقعہ بھیجا۔ جس میں لکھا تھا کہ وُہ عنقریب اپنا پاسپورٹ مکمل کروا لے گا اور اسی ہفتے روانہ ہو جائے گا۔ سردست اسے دس ہزار روپیہ فوری اخراجات کے واسطے درکار ہو گا اور ماں سے التجا کی تھی۔ کہ اس کے باہر جانے میں عذر نہ کرے کیونکہ موجودہ حالات میں اس کا یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے ——— آسیہ بیگم کے لئے یہ موقعہ بے حد صبر آزما تھا۔ کوئی اُسے مشورہ دینے والا نہیں تھا۔ پھوپی حنیفہ سے بات کرنا تو اب ایسے ہو گیا۔ کہ جیسے محلہ بھر میں ڈھنڈورا دینا۔ جب تک چیخ چیخ کر سب کو نہ سنا لو وہ بات نہیں سمجھ پاتی تھی۔ چنانچہ اَب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ آسیہ بیگم خود ہی سوچ بچار کر کے کسی نتیجہ پر پہنچے اور اُسے اس مرحلہ پر واقعی اس کے سوا کوئی اور کارگر تجویز نہ سُوجھی کہ طیّب سردست بیرون ملک چلا جائے۔ اِس عرصہ میں یہ ناگوار سا جھگڑا اس کے ذہن سے نکل جائے گا تو سعدیہ سے شادی کرنے میں اُسے عذر نہ ہو گا۔

طیّب نے اپنا پاسپورٹ بنوانے کے واسطے کسی بھی رائج الوقت حربہ کو استعمال کرنے سے گریز نہ کیا۔ اپنے اور باپ کے دوستوں کے اثر و رسوخ کی سفارش کے طور پر اس دولت کو رشوت اور نذرانہ کے لئے دریا دلی سے صرف کیا۔ اور وہ کام جو مہینوں کی کوشش سے بر نہیں آتا صرف ایک ہفتہ میں مکمل کر لیا۔

اس عرصہ میں وفا تک پہنچنے کی ہر کوشش ناکام رہی۔ ٹیلیفون کرتا تو گھنٹی کئی کئی منٹ دوسری طرف گونجتی سنائی دیتی مگر کوئی ٹیلیفون نہ اُٹھاتا۔ خط

لکھتا تو کوئی نہ آتا۔ چند مرتبہ وہ اِس کے بنگلہ پر جا پہنچا۔ مگر مالی نے اُسے باہر ہی روک کر بتایا۔ کہ صاحبزادی گھر میں نہیں ہیں وہ۔ بیگم صاحبہ کے ہمراہ کہیں گئی ہیں۔ حتیٰ کہ ریشم تک سے وہ بات نہیں کر سکتا۔ کہ بیگم صاحبہ نے حکم بند کر رکھا تھا۔ وہی گھر جس کے دروازے اُس کے لیئے آغوشِ مادر کی طرح کھلے رہتے تھے اب یک دم چشمِ رفتگاں کی مانند ہمیشہ کے لیئے بند ہو گئے۔ ایسی دل شکن اور مایوس کن جدائی کا تصور تو اُس نے خوابِ پریشاں میں بھی نہیں دیکھا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ کہ کس ناشکری کی پاداش میں قدرت نے اُسے فردوسِ حیات سے محروم کر دیا —— اور اس موقعہ پر اپنے باپ کا نام اُس کے دل و دماغ کے ویرانوں میں صدائے جرس کی طرح گونجنے لگتا۔ جو اس کی خوشیوں اور مسرّتوں کے قافلے کے ہر لمحہ اُس سے دُور، دُور اور دُور نکلے چلے جانے کا اعلان کر رہی تھی۔ اِس کے بعد سناٹا چھا جاتا۔ ایک مہیب سناٹا! جس میں شکوک و شبہات کے ڈراؤنے ہیولے اُٹھا اُٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے۔ اُس کو منہ چڑاتے اور ان کی بے پناہ یورش سے سے اِس کا سکون تباہ ہو جاتا۔ اپنی ہستی اُسے یوں محسوس ہونے لگتی جیسے کسی اسرار میں ملفوف ہو اور اس کا دم گھٹ گھٹ کر رہ جاتا۔

اور آخر وہ انگلستان کے لیئے پرواز کر گیا —— آسیہ بیگم دل گرفتہ سی ہو کر رہ گئی۔ گھر ویران ویران نظر آتا۔ یوں لگتا جیسے کام ختم ہو کر رہ گئے دونوں عورتیں چپ چاپ بیٹھی ہوئی ایک دوسری کو گھورتی رہتی کوئی بات ہی کہنے سُننے کو باقی نہ تھی اور یوں ہی اُداس دن گزرنے لگے۔

ایک دن دوپہر کے سناٹے میں ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز گونجی۔ اور آسیہ بیگم نے ریسور اُٹھایا۔

"کون ہے؟"

وہ پوچھنے لگی۔ دوسری طرف سے کوئی زنانہ آواز سنائی دے

رہی تھی۔

"طیّب؟ وہ تو باہر چلا گیا —— تم کون ہو کیا کام ہے؟"

آسیہ بیگم کی پیشانی پر بے اختیار شکن پڑ گئے آواز میں تلخی پیدا ہو گئی۔

"وفا —؟ میں سمجھی! تو کیا کام ہے طیّب سے تمہیں؟"

اس مرتبہ آسیہ بیگم کی آواز میں غصّہ کی تیزی بھی شامل ہو گئی۔

"اسی سے کہنا ہے؟ اچھی شریف زادی ہو کہ غیر لڑکوں کے ساتھ تمہارے کام اٹکے پڑے ہیں! وہ یہاں نہیں ہے انگلستان چلا گیا ہے۔ وہ شاید تم سے ہی جان چھڑانے کے واسطے اس نے وطن چھوڑ دیا ہے!"

دوسری طرف سے شاید کوئی آواز نہ آئی کہ آسیہ بیگم نے رسیور۔ رکھ دیا اور غصّہ میں بھری ہوئی واپس آ گئی۔

آسیہ بیگم کو اس واقعہ سے طیّب کے بتائے ہوئے وہ لفظ یاد آ گئے جو اس نے وفا کی امّی کی زبانی سنے تھے۔ اور اسے خیال آیا کہ کسی طرح معلوم کرنا چاہیئے کہ اس نے کس بنا پر ایسا کیا۔ راؤ نیاز احمد کا بیٹا ہونا۔ طیّب کے واسطے عیب کا موجب کیوں بن گیا؟ وہ اس خیال سے خاصی فکر مند نظر آنے لگی۔ تجسّس نے رفتہ رفتہ بے چینی کی صورت اختیار کر لی اور بیگم درّانی سے ملاقات کا طریقہ سوچنے لگی —— ریاض کو یقیناً اس کا پتہ معلوم ہو گا، وہ سوچنے لگی مگر ریاض کے علم میں یہ بات ہی نہیں آنی چاہیئے کہ آسیہ بیگم وفا کی امّی سے ملنے گئیں کیونکہ اس سے کئی قسم کی بدگمانیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے شالو کو بھیج کر ڈرائیور کو ڈیوڑھی میں بلوایا اور اس سے پوچھا۔

"نور محمد! ایک بات بتاؤ؟" آسیہ بیگم نے آواز کو رازدارانہ انداز

میں دھیما کر کے پوچھا۔

"جی صاحب؟" مؤدب ملازم نے جواب دیا۔

"صاحب زادہ طیّب کو تم یقیناً اُن کی ہم جماعت لڑکی کے بنگلہ پر لے جاتے ہو گے ——— شاید وفا اُس کا نام ہے!" آسیہ بیگم نے کہا۔

"جی ہاں صاحب! بریگیڈیر دُرّانی کی لڑکی ہیں وہ ——— ! بارہا صاحب کو چھوڑنے گیا ہوں اُن کے ہاں تو!" نور محمد کہنے لگا۔

"اچھا آج سہ پہر کو پانچ بجے ہمیں بیگم دُرّانی سے ملنے جانا ہے۔ گاڑی نکال کر درست کرو!" آسیہ بیگم نے کہا۔

"جی بہت بہتر صاحب! گاڑی تو ہر وقت تیار ملے گی حضور!" نور محمد کی آواز میں تعجب کی کھنک تھی۔

"کسی سے بھی اس کا ذکر نہ آئے۔ سُنا؟"

"جی بہت بہتر صاحب!" اس نے پھر وہی الفاظ مختلف لہجہ میں دوہرائے۔

"بس جاؤ آرام کرو!"

آسیہ بیگم ڈیوڑھی سے ہٹ آئی۔ اور نور محمد واپس چلا گیا۔ جب یہ سارا سارا دن ڈیوڑھی پر بیٹھا اونگھتا رہتا۔ بیکاری نے اُسے مضمحل اور بیمار سا کر دیا تھا۔ صرف اتنی سی مصروفیت رہ گئی تھی کہ گاڑی کو گیراج سے نکالتا جھاڑتا پونچھتا اور پھر بند کر کے بیٹھ رہتا۔ یا جاسوسی ناول پڑھتے پڑھتے اُونگھ جاتا۔

سہ پہر کو پانچ بجے آسیہ بیگم نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ ہلکے بادامی رنگ کی قیمتی کریپ کی شلوار پر پھولدار وائل کی ہم رنگ قمیض اور اسی رنگ کا جالی دار دوپٹہ اوڑھے وہ تیار ہو کر نکلی ہی تھی۔ کہ ڈیوڑھی پر آ کر نور محمد

نے رحیمن بُوا کو پکارا اور گاڑی تیار ہونے کی اطلاع دی۔

"کہہ دو ـــــ انتظار کرے!" آسیہ بیگم نے جائے نماز پر کھڑے ہوئے حکم دیا۔

"بھیا! نماز پڑھ کر آتی ہیں۔ انتظار کرو۔" رحیمن بُوا نے ڈیوڑھی پر جا کر کہا۔

(۲۰)

وفا کی عجیب حالت تھی۔ اس نے اپنے کمرے سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ کئی کئی دن نہ غسل کرتی نہ لباس تبدیل کرتی۔ بستر پر پڑے پڑے خبر نہیں کیا سوچتی رہتی۔ ماں جس نے اُسے مکمل آزادی دے رکھی تھی یک بیک ایسی سخت گیر ہو گئی۔ کہ اُس نے بیٹی کے ہر فعل پر قدغن لگا دیا۔ اس کی حرکات و سکنات کی نگرانی شروع کر دی۔ اس کی ڈاک سینسر ہونے لگی۔ ٹیلیفون بند کر دیا گیا۔ اور اُس شام کے بعد جب سے طیب اس گھر سے آخری مرتبہ نکلا تھا۔ وفا کی باہر کی آمد و رفت موقوف کر دی گئی۔ اس کی سہیلیوں میں سے کوئی ملنے آتی تو بیگم درانی خود تمام وقت ان کے پاس موجود رہتی کہ کہیں ایسا نہ ہو وفا کسی کے ذریعے طیب سے خط و کتابت یا، پیام رسانی کا سلسلہ قائم کرے۔

"تمہارا تو ذکر ہی کیا خود میں نے بہت بڑا دھوکہ کھایا۔ اس سے میں نے سبق سیکھا ہے کہ دُنیا میں رہنے کے لیے احتیاط لازم ہے۔ اس کے بعد ہمیں انتہائی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ تاکہ تمہاری شادی کا فریضہ ادا ہو جائے۔"

اُس شام طیّب کے جانے کے بعد بیگم درانی بیٹی سے کہہ رہی تھی ۔

"مگر امّی بات کیا ہے ___ ؟ آخر مجھے معلوم تو ہو کہ طیّب سے کیا خطا سرزد ہو گئی ؟ یا تو آپ اُسے اس قدر پسند کرتی تھیں کہ ___" اور وفا کی گلوگیر آواز میں رقت کا پھندا پڑ گیا۔

"جہاں تک طیّب کی ذات کا تعلق ہے میں اُسے پسند کرتی ہوں۔ اب بھی بہت پسند کرتی ہوں۔ مگر بعض ایسے واقعات کا انکشاف ہوا جن کا تعلق ___ اُس کے خاندان سے ہے اور تم جانتی ہو کہ شادی بیاہ کے رشتوں میں حسب و نسب دونوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ چنانچہ میں صاف صاف کہہ دوں کہ طیّب سے تمہاری شادی ہرگز طے نہیں کی جا سکتی۔"

بیگم درانی ایسے سخت اور فیصلہ کن لہجہ میں کہہ رہی تھی کہ وفا کے جسم میں سنسنی جیسی دوڑ گئی کس قدر سرد مہری سے یہ سب کچھ کہہ رہی تھی اُس کی ماں جیسے اُسے ذرا احساس نہ ہو کہ یہ اُس کی عزیز بیٹی کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔

"مگر کیوں امی ___ ؟"

وہ دوڑ کر ماں کے روبرو دوزانو ہو گئی اور اس کی آغوش میں مُنہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ بیگم درانی سے بڑھ کر شفیق ماں شاید ہی کوئی ہو گی لیکن اس وقت معاملہ ہی کچھ ایسا درپیش تھا کہ سخت گیر اور درشت ہونے پر مجبور تھی۔ وہ بیٹی کو دُنیا کی ہر چیز مہیا کر سکتی تھی مگر اس کی یہ ضد پوری کرنے سے یکسر معذور تھی۔

"دیکھو ننھی ! میں اس معاملہ کی وضاحت اس لیے نہیں کر سکتی کہ وہ ہمارا اپنا نہیں دُوسروں کا معاملہ ہے اور ممکن ہے اس کے انکشاف سے کسی کا نق ہو ___ بہرحال تمہیں وضاحت طلب کرنے پر اصرار نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ تمہا تجربہ میرے تجربہ سے تمہارا فیصلہ میرے فیصلہ سے افضل اور فائق نہیں ہو

سکتا۔ بچے ان نازک اور پیچیدہ مسائل کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا کرتے! میں نے پہلے ہی بہت غلطی کی کہ تمہیں انتخاب کے ابتدائی مراحل سونپ دیئے — بہر کیف ننھی تمہیں مجھ پر اعتماد ہونا چاہیئے اور یقین رکھنا چاہیئے کہ کسی ایسی ہی مجبوری سے میں نے اس معاملہ کو یہاں تک پہنچنے کے بعد رد کر دیا ہے۔ ورنہ کیا مجھے تمہاری خوشی منظور نہیں؟ لو اُٹھو! اور یک دم بھول جاؤ اس قصہ کو! آج کے بعد میں تمہارے منہ سے طیّب کا نام تک نہ سنوں! بس یہ میرا آخری فیصلہ اور آخری حکم ہے۔!

ماں نے جو اس وقت واقعی کسی پتھر کے مجسمہ کی مانند بے حس ہو رہی تھی سخت لہجہ میں حکم دیا اور اس کے بعد ایسا انتظام کیا کہ وفا اور طیّب کے مابین سارے راستے مسدود کر دیئے — بیٹی کے احتجاج کے کسی پہلو کو بھی اس نے قابلِ اعتناء نہ سمجھا۔ اور نہایت سخت گیری سے اس کا مقابلہ کیا۔

"بے وقوف لڑکی! کیا تجھے ماں پر اعتماد نہیں؟ کیا تو خیال کرتی ہے کہ ماں تجھ پر ظلم کر رہی ہے۔؟"

جب وفا نے کئی وقت مسلسل کھانے سے انکار کیا تو آخر ماں خود اس کے کمرے کے دروازہ میں کھڑی ہوئی کہتی گئی۔ وفا اپنے بستر پر تکیوں میں سر دیئے روتی رہی اور سُنتی رہی —

"اگر ایسا ہی ہے۔ اور تو مصر ہے کہ ماں تجھے گندی نالی میں پھینک دے تو جا میں تجھے انتخاب کا اختیار دیتی ہوں — ماں یا طیّب! دونوں میں سے ایک کو چُن لے —! میں اپنے کمرے میں آدھا گھنٹہ انتظار کروں گی۔ اگر تجھے طیّب درکار ہے تو اُسے ٹیلیفون کر کے بلا اور اس وقفہ کے اندر اندر میرے گھر سے چلی جا۔ اور اگر تجھے ماں چاہیئے تو جلدی سے اُٹھ غسل کر لباس بدل کر میرے کمرے میں چلی آ تا کہ مل کر کھانا کھائیں۔ مجھ میں اب بھوک سہنے کی

تاب نہیں آخر میں کمزور اور بوڑھی عورت ہوں۔ کب تک تیرے ساتھ بھوکی رہوں گی — آج مجھے کھانا چاہیئے! تیرے ساتھ یا تنہا۔ مگر جب تو اس چھت کے نیچے بھوکی پڑی ہے میں اکیلی نہیں کھاؤں گی!“

اور اس سے پیشتر کہ وفا کا ماؤف دماغ ماں کے ان الفاظ کو حقیقی معنی پہنا سکے وہ قدم برداشتہ واپس جا چکی تھی۔ وفا اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

— یہ سب کچھ اُس کی ماں نے کیا کہا تھا؟ کیا وہ بھی اتنے دنوں سے اس کے ساتھ ہی فاقہ کشی کر رہی ہے؟ اور وہ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی ریشم دروازہ سے لگی کھڑی تھی۔

”صاحبزادی! خدا کے لیے آج تو میز پر چلی آئیے بڑی بیگم نے کئی وقت سے کچھ نہیں کھایا۔!“

وہ رونے کے قریب ہو رہی تھی۔ اور یہ سُن کر وفا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ ماں کے واسطے کتنی تکلیف کا باعث بنی رہی کیا خدا اسے معاف کرے گا —؟ اور وفا نے عہد کیا کہ وہ اپنے اُوپر ہر اذیت برداشت کرے گی مگر ماں کے حکم سے روگردانی نہیں کرے گی۔ اس نے جلدی جلدی غسل کر کے کپڑے تبدیل کیئے اور ماں کے کمرے میں پہنچتے ہی اس کے قدموں میں جا گری —

”امی —!

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی مگر یہی سب کچھ تھا!

”بس ٹھیک ہے! تو میرے پاس واپس آگئی۔ اچھا ہوا!“

اور وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے کھانے کے کمرے میں چلی آئیں۔ خبر نہیں کتنے وقتوں کے بعد دونوں نے کھانا کھایا۔

اگلی صبح بیگم درانی وفا کو ساتھ لے کر مری چلی گئیں۔ اور ایک مہینہ وہاں گزار کر واپس آئیں۔ وفا نے اس عرصہ میں ماں کو رضا مند کر لیا تھا۔ کہ وہ اُسے

اعلیٰ سند کے واسطے بیرونِ مُلک بھیج دے کیونکہ وہ سرِدست شادی کرنا نہیں چاہتی۔

وفا اور بیگم درانی واپس گھر پہنچی ہی تھیں۔ کہ موقعہ پاکر وفا نے طیب کو صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہا۔ وہ اُسے تسلّی دینا چاہتی تھی۔ اور فہمائش کرنا چاہتی تھی کہ وہ اسے بھول جائے اور اپنی زندگی کا الگ لائحہ عمل بنائے کیونکہ گھر واپس آتے ہی ریشم نے اُسے بتایا تھا۔ کہ صاحب کئی مرتبہ آتے رہے۔ ٹیلیفون پر اگرچہ کوئی خاتون اُس سے بے حد ترشروئی اور بداخلاقی سے پیش آئی مگر اسے معلوم تو ہو گیا۔ کہ طیب اپنی محبت کی ناکامی سے کچھ ایسا زیادہ متاثر نہیں ہوا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جا چکا ہے۔ اب وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی اس ادھیڑ بُن میں مصروف تھی کہ اُسے خود کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے؛ بیرون ملک جائے یا ملتوی کر دے۔

اتنے میں ریشم کمرے میں داخل ہوئی اور وفا کو لیٹے ہوئے دیکھ کر اندازہ کرنے لگی کہ وہ سو رہی ہے یا جاگتی ہے۔

"ریشم!" وفا نے قدموں کی آہٹ پاکر پکارا۔

"جی صاحب!" اس نے اپنی عادت کے موجب میٹھی سی آواز میں جواب دیا۔

"امی کے پاس کون آیا ہے؟" وفا نے سُست جیسی آواز میں پوچھا۔

"خبر نہیں صاحب! کار تو — اپنے صاحب کی ہے۔ ڈرائیور بھی وہی ہے میں اُسے اچھی طرح پہچانتی ہوں باہر مالی بابا کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا جب میں بیگم صاحب کی ڈاک لینے باہر گئی۔" ریشم کی باتیں سُن کر وفا جلدی سے اُٹھ بیٹھی۔

"تو امی کے پاس کون آیا ہے؛ تم نے دیکھا نہیں؟"

"جی ہاں صاحب! کوئی خاتون آئی ہیں میں خود ہی تو اطلاع کرنے گئی۔ بیگم صاحب نے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا حکم دیا تو میں خود ہی انہیں اندر لے کر آئی۔ شاید صاحب کی امی ہوں گی ـــــ میں تو کہتی ہوں کچھ کہنے آئی ہوں گی صاحب ـــــ، خدا کرے بیگم صاحب مان جائیں۔!"

ریشم کی آنکھیں کسی خیال سے چمک رہی تھیں مگر وفا کے لیے کسی خوش فہمی کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ وہ چند گھنٹے ہوئے ٹیلیفون پر طیب کی والدہ کے خیالات کا اندازہ لگا چکی تھی۔ مگر اس صورت میں ان کا آنا اور بھی تعجب خیز تھا۔

"امی آئی ہیں ان کے پاس؟" وفا پوچھنے لگی۔

"عصر کی نماز قضا ہوئی جاتی تھی کہنے لگیں انہیں بٹھاؤ میں ابھی آئی۔" ریشم نے جواب دیا۔ اور اتنے ہی میں راہداری میں بیگم درانی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"جاؤ تم پینے کے لیے پوچھو۔ کوئی ٹھنڈی چیز پئیں گی ورنہ چائے تیار کرو۔"

وفا نے ریشم کو تاکید کی۔ طیب کی ماں اس کے گھر آئی تھیں۔ ان کی خاطر مدارت لازمی تھی۔ اس کا جی بے اختیار چاہنے لگا۔ کہ وہ اپنے طیب کی ماں کو دیکھے۔ اور وہ اٹھ کر ڈرائینگ روم کے ملحقہ کمرے میں پہنچی اور پردے کے عقب سے اندر جھانکنے لگی۔ صوفہ پر ایک بارعب سی معمّر خاتون بیٹھی تھی۔ جس کے سرخ و سفید چہرے پر تقدس کی جھلک تھی۔ موٹی موٹی آنکھیں پاکیزگی کے نور سے منور تھیں۔ وہ صحت مند اور خوش پوش خاتون کمرے میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے خاتون خانہ کا انتظار کر رہی تھی۔ کہ اتنے ہی میں کمرے کا پردہ اٹھا اور بیگم درانی داخل ہوئیں۔

”السلامُ علیکم!“ انہوں نے مہمان خاتون کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“ آسیہ بیگم اپنی نشست سے اُٹھتے ہوئے بولی خوش آمدید! تشریف رکھیئے!“

بیگم درانی قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئیں اور استفسار کی نظروں سے اپنی مہمان خاتون کو دیکھنے لگیں۔

”میں —— طیب کی والدہ ہوں —— یقیناً آپ طیب کو جانتی ہوں گی!“

آسیہ بیگم نے اپنا تعارف کروانا چاہا۔

”جی ہاں! بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت اچھا اور پیارا بچہ ہے۔ آپ جیسی خاتون کی گود میں پرورش پانے والا لڑکا یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اور آپ ایسے فرزند کی ماں کہلانے کے لیے مبارکباد کی مستحق ہیں“

بیگم درانی کہہ رہی تھی اور آسیہ بیگم کو اگرچہ اس کے لہجہ سے صداقت کی بو آئی تاہم وہ اندازہ کرنے کے واسطے بغور اس کی طرف دیکھنے لگی کہ اسکا عندیہ کیا واقعی ان الفاظ کے مطابق ہے۔؟

”آپ —— اس کی اس قدر معترف بھی ہیں اور اس کے باوجود آپ نے اس کی خواستگاری کو رد کر دیا؟ اس نے آپ کو پیغام دیا تھا نا؟

آسیہ بیگم نے کچھ ایسے انداز سے کہا۔ کہ بیگم درانی کو محسوس ہوا۔ کہ اس کی مہمان خاتون بیٹے کی وکالت اور سفارش کی غرض سے اس کے پاس آئی ہے۔ اور خود وفا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی۔

”جی ہاں —— اس نے مجھے پیغام دیا تھا۔ اور —— اس کے پیغام دینے سے پیشتر میں ایسے لڑکے کو اپنی فرزندی میں لیۓ دا رو

جان سے خواہاں تھی۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو بعض اوقات ہیں بے صبری سی ہو جاتی۔ کہ کیوں وہ اپنے ہاں سے کسی کو اس معاملہ سلسلہ جنبانی کے واسطے نہیں بھیجتا۔ اور کیوں التوا کر رہا ہے ——! بیگم درّانی جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"تو آپ نے اس لیے انکار کر دیا۔ کہ اس نے بذاتِ خود کیوں دیا —— ؟ کیوں نہ گھر سے کسی کو بھیجا؟"

آسیہ بیگم نے نہایت دھیمے اور شیریں لہجہ میں پوچھا۔ وفا حیران ہو رہی تھی۔ کہ کیا یہ خلیق اور حلیم الطبع خاتون وہی ہے جس نے ٹیلیفون پر اسے اس قدر حقارت سے ڈانٹا تھا؟"

"جی نہیں ——! میرے انکار کی وجہ خود طیبؔ کے خط سے ظہور میں آ گئی۔ ورنہ وہ تو اس نے خود ہی لکھ دیا تھا۔ کہ میری منظوری کے بعد وہ رسماً آپ کو ملاقات کے واسطے بھیجے گا۔ بیگم درّانی نے اپنے لہجہ میں بدستور وہی حلاوت قائم رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں۔ کہ وہ کیا وجہ تھی؟"

آسیہ بیگم نے اپنی میزبان سے پوچھا اور اتنے ہی میں ریشم کمرے میں داخل ہوئی۔

"صاحب! پینے کے لیے کوئی ٹھنڈی چیز حاضر کروں یا چائے پیجیے گا۔؟"

مؤدّب خادمہ نے مہمان خاتون اور اپنی ملکہ کو بیک وقت مخاطب کر کے کہا۔

"فرمائیے! کیا پئیں گی؟" مہمان کے تأمل پر خود بیگم درّانی نے پوچھا۔

"کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں چائے پی کر ہی چلی آ رہی ہوں!" آسیہ بیگم

بے رسمی سا جواب دیا۔

"تو یوں کرو کوئی ٹھنڈی چیز لے آؤ ـــــ پیاس تو ہر دس منٹ کے بعد لگتی ہے پانی پینے میں تو کوئی مضائقہ نہیں!"

بیگم درانی نے پہلے ریشم کو حکم دیا اور پھر آسیہ بیگم کی طرف مخاطب ہو کر لجاجت سے کہا۔ تو وہ خاموش ہو گئی، ریشم کے جانے کے بعد آسیہ بیگم نے استفسار سے اپنی میزبان کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں تو وہ ـــــ؟"

اُس نے غور سے بیگم درانی کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"میں عرض کرتی ہوں ـــــ، یہ بات آپ کے اور میرے درمیان تو کوئی راز نہیں اسی لئے آپ سے عرض کرنے میں مجھے کیا تامل ہو سکتا ہے ـــــ؟"

اور یہ کہتے کہتے بیگم درانی نے اپنے گرد و پیش احتیاطاً نگاہ ڈالی اور اپنی نشست سے اُٹھ کر آسیہ بیگم کے پہلو میں صوفہ پر آ بیٹھی۔ آسیہ بیگم کا رنگ اُڑ گیا اور وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھنے لگی جیسے وہ ابھی موت کا حکم سُنانے والی ہو۔

"طیب نے اپنے خاندان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ وہ میرے والد راؤ نیاز احمد تھے ـــــ" بس یہی [illegible] ہے انکار موجب بن گیا ـــــ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ [illegible]

بیگم درانی نے دبی زبان میں کہا اور تیز نظروں سے اپنی خاتون کی طرف دیکھا جس کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔

"یہ بھی فرما دیجئے کہ کیوں ـــــ میں جاننا چاہتی ہوں۔ کہ۔

اِن واقعات سے کہاں تک اور کیسے واقفیت رکھی ہیں ؟ " آسیہ بیگم پوچھنے لگی۔

اُس نے خشک اور گلوگیر آواز میں استفسار کیا۔ تو بیگم درّانی کو اس پر ترس آگیا۔

"ڈاکٹر ناز کو آپ جانتی ہوں گی —— ؟ میں اُن دنوں اُنہیں کے ہسپتال میں داخل تھی۔ اور اُن کے زیرِ علاج تھی۔ میرے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اور میں دنیا کے اِس کڑوے پھل کے لئے ترس رہی تھی جسے کھانے والا بھی پچھتاتا ہے اور نہ کھانے والا بھی ! خیر ناز میرا علاج بھی کر رہی بھی اور مجھے دوستانہ تسلیاں بھی دے رہی تھی۔ کہ میرے ہاں ضرور بچہ ہوگا۔ انھیں دنوں وہاں ایک اور مریضہ بھی داخل تھی جس کے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ وہ کئی ماہ سے ڈاکٹر ناز کے ہاں مقیم تھی اور قریبی دنوں میں ہسپتال میں آگئی تھی۔ ناز مجھ سے کہنے لگی۔ کہ اگر میں چاہوں تو کہ اُس کے بچے کو پیدا ہوتے ہی گود لے سکتی ہوں میں نے اِس عورت اور اس کے شوہر کے متعلق سوالات کیے تو ناز نے متعلقہ حالات بتانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ کسی عزت دار گھرانے کا راز ہے اسے ظاہر کرنے کی وہ کسی صورت بھی مجاز نہیں۔ میں اِس عورت کے بچے کو اس وقت تک لینے کے لئے تیار نہ تھی جب تک کہ مجھے پوری طرح یقین نہ ہو جائے کہ وہ جائز بچہ ہے اور اچھے خاندان سے ہے۔ اگرچہ ناز کا بیان تھا۔ کہ عورت نے درپردہ کسی شخص سے نکاح کیا جو اُسے چھوڑ کر روپوش ہو گیا۔ اِس کی شادی کے متعلق کسی کو علم نہیں نہ ہی وہ اُسے ثابت کر سکتی ہے بنا بریں بچے کی پیدائش کو راز میں رکھنا لازمی ہے لیکن میں اس بچے کو اپنانے پر رضامند نہ ہوئی جس کی پیدائش پُراسرار حالات میں ہوئی تھی۔ وُہ ناز کی نہایت عزیز سہیلی تھی اور وہ اِس سلسلہ

میں اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ ایک دن ناز خوشی خوشی میرے پاس آئی اور بتایا۔ کہ اس کی سہیلی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تھا جسے فوراً ہی ایک ضرورت مند نے لے لیا۔ میرے کریدنے پر اس نے بتایا کہ "راؤ نیاز احمد ایک متمول زمیندار تھے جو اچانک کسی حادثہ میں فوت ہو گئے، ان کے ہاں نرینہ اولاد نہ تھی اس صورت میں ان کی تمام جائیداد چھوٹے بھائی کے قبضے میں چلی جاتی۔ چنانچہ مشہور کر دیا گیا کہ ان کی بیگم اُمید سے ہے۔ اور اُسے اَب میرے ہسپتال میں لایا گیا ہے سمجھو یہ بچّہ انہیں کے ہاں پیدا ہوا اور ایک دولتمند زمیندار کا وارث بنے گا"۔ اس واقعہ کے ایک ہی سال بعد میرے ہاں بچّی پیدا ہوئی۔ اَب تک وہ واقعہ میرے ذہن سے اُتر چکا تھا۔ کہ اُس دن اچانک اِس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ کہ طیّب وہی لڑکا ہے۔ — جس بچّے کو اُس کے نا تسلّی بخش نسب کی وجہ سے میں نے گود لینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ ہی کہیے کہ اب اُسی کو داماد کی حیثیت سے کیسے قبول کر سکتی ہوں؟ خبر نہیں اُس کا باپ کون اور کس خاندان سے تھا اُس کی ماں سے اُس شخص نے باقاعدہ نکاح بھی کیا یا نہیں؟ کیا آپ نے اس سلسلہ میں تسلّی بخش کوائف معلوم کیے تھے؟"

اپنا بیان ختم کرتے ہوئے بیگم درّانی نے بجائے خود سوال کر دیا۔

"ڈاکٹر ناز نے ہمیں یقین تو بہی دلایا تھا مگر اُس کی صداقت کا کوئی ثبوت مہیا نہ کیا جا سکا۔ نہ بچّے کے والدین کا صحیح نام بتایا گیا نہ اُن کے نکاح کا جواز علم میں آیا۔ آپ کو معلوم ہے حاجت مند دیوانہ ہوتا ہے اُس وقت ہم نے یہی غنیمت سمجھا کہ ہماری بیراشد ضرورت پوری ہو گئی۔"

آسیہ بیگم نے کہا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا اور زرد تھا۔ آنکھوں سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

„ویسے آپ نے اس لڑکے کی تربیت اور پرورش قابل تعریف انداز سے کی ہے۔ طیّب کے اخلاق و اطوار کا کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلکش نہ ہو۔ اِس کی عادات و خصائل انتہائی دلپذیر ہیں۔ بخدا لاکھوں میں سے ایک لڑکا ہے۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ چاند میں بھی داغ ہے۔ اور بے عیب خدا کی ذات کے سوا کوئی نہیں ——— طیّب میں اور نہیں تو یہی داغ نکل آیا۔ کہ اُس کی پیدائش سے کوئی راز وابستہ ہے ——— ! مجھے ایک مدت اِس ناگوار واقعہ کا احساس رہے گا!“

بیگم نے لمبا سانس بھر کر حسرت ناک لہجہ میں کہا صاف ظاہر تھا کہ انہیں طیّب کو کھو کر کچھ کم صدمہ نہیں ہوا۔

„کیا آپ نے لڑکی سے بھی اِس واقعہ کا ذکر کیا کہ آپ نے کِس وجہ سے طیّب کو اپنی فرزندی میں لینے سے انکار کیا ہے؟“ آسیہ بیگم نے پوچھا۔

„ہرگز نہیں ——— ! یہ کسی دوسرے کا راز تھا اس کے الم نشرح کرنے کا مجھے کیا حق حاصل ہے؟ آپ سے تو اس صورت میں بیان کر دیا کہ اس کا تعلق خود آپ کی ذات سے ہے اور آپ خود سب حالات سے واقف ہیں۔؟“

بیگم درّانی کہنے لگیں اور آسیہ بیگم کو اُن کی صداقت کا یقین ہو گیا۔

„اور یقیناً مجھے یہ درخواست کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں کہ اِس راز کا کسی وقت بھی ظاہر ہونا میرے اور طیّب کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے ———“

آسیہ بیگم ابھی اپنا فقرہ پورا کرنے پائی تھی۔ کہ بیگم درّانی بول اُٹھیں۔

”آپ بے فکر رہیئے۔ انشاء اللہ یہ راز ہمیشہ کے لئے میرے سینہ میں دفن ہوگیا۔ آج کے بعد کسی موقع پر بھی زبان تک نہ آئے گا——!“ ان کی نگاہوں میں بے پایاں ہمدردی اُمنڈ آئی۔

”میں آپ کے اخلاق مروّت کی کس زبان سے تعریف کروں۔“ آسیہ بیگم کہنے لگی۔

”تعریف کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے——؟ یہ تو آپ کا اپنا حُسنِ نظر ہے ورنہ میں کسی قابل ہوں۔“

بیگم درّانی شفقت سے آسیہ بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے ہنس کر بولی اور اتنے ہی میں ریشم شیشے کے خوش وضع جگ میں خوش رنگ مشروب طشت میں رکھے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

”اُہو! ریشم! ہم تو بھول ہی چکے تھے کہ تم پانی لینے گئی ہو——؟ اتنی مدّت کیا سوتی رہیں تم؟“

بیگم درانی نے بدستور ہنستے ہوئے ملازمہ لڑکی کو مخاطب کیا۔ تو وہ نادم ہوکر سرنگوں ہوگئی اور گلاسوں میں مشروب ڈال کر پیش کرنے لگی۔ چند منٹ کے بعد جب مہمان خاتون رخصت ہونے لگی تو وفا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جارہی تھی——

③

کاوش کا دل کرے ہے تقاضہ کہ ہے ہنو۔
ناخن پہ قرض۔ اس گرہِ نیم باز کا

ہے فضا میں سنگ باری کی گرج
آئینوں کو دیکھ اے آئینہ ساز

(جوشؔ)

(۲۱)

”مریم! اس قدر دانا اور صائب عقل کی مالک ہوتے ہوئے بعض اوقات تو تم فاش غلطی کرنے پر بضد ہو جاتی ہو۔ ہم سب ہر بات میں تم سے رائے لیتے ہیں اور تمہاری قوّتِ فیصلہ پر بھروسہ رکھتے ہیں لیکن اپنے معاملات پر تمہاری عقل خدا جانے کند کیوں ہو جاتی ہے“۔؟

مسز اخلاق، بیگم درانی کو مخاطب کیئے تلخی سے کسی مسئلہ پر تبادلۂ خیالات کر رہی تھی۔ بیگم درانی اپنی اس مخلص اور دیرینہ دوست کی باتیں بڑے غور سے سُن رہی تھی اُن کے چہرے پر سنجیدگی نے کرختگی کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ مگر وہ خاموش تھیں۔

”اس وقت تمہاری ناقابلِ تلافی غلطی تھی۔ کہ تم نے طیبّ جیسے ہمہ صفت موصوف لڑکے کو نظر انداز کر دیا۔ میں کہتی ہوں اُس لڑکے کو دیکھ کر تمہاری بہترین دوستوں کو رشک آ رہا تھا تمہاری اور تمہاری بچّی کی خوش قسمتی پر!“

مسز اخلاق حسبِ عادت آنکھیں پھاڑے اپنے گداز چہرے پر حیرت کے انداز پیدا کیئے کہتی جا رہی تھی بیگم درانی نے نگاہ اُٹھا کر اسکی طرف دیکھا اور اُن کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھوٹ نکلی۔

"تمہیں بھی رشک آیا یا نہیں؟" وہ ازراہ تمسخر پوچھنے لگی۔

"ضرور آتا اگر میرے بھی کوئی لڑکی ہوتی۔ خیر تم تو ہر بات کو تمسخر میں اڑا دیتی ہو۔ کہ مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے ——— کہنا یہ تھا کہ اب ایک دفعہ پھر تم اپنی وہی حماقت دہرانے والی ہو۔ نادر جیسا لڑکا فی زمانہ ملنا محال ہے دولت مند آدمی کا بیٹا ہوتے ہوئے اس کی عادات نہایت سلجھی ہوئی ہیں پینے پلانے کا تو ذکر ہی کیا صوم وصلوٰۃ کا پابند اور دیندار نوجوان ہے چھوٹی سی عمر میں لفٹیننٹ ہو گیا ہے ترقی کے روشن امکانات موجود ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ خاندان بہت اچھا ہے۔ جس کی تمہیں سب سے بڑی کرید رہا کرتی ہے۔ تمہیں ہم قوم یوسف زئی پٹھان ہیں۔ اس کے والد کرنل حیدر، درانی بھیا کے دوست تھے۔ اسی رعایت سے وہ تمنّا کر رہے ہیں کہ بیٹے کا رشتہ درانی کی لڑکی سے ہو جائے۔ ہر روز بیچارے دونوں میاں بیوی میری منّتیں کرنے آتے ہیں۔"

مسز اخلاق اسی طرح حیرت زدہ سی آنکھیں اپنی بے تکلف سہیلی کے چہرے پر مرکوز کیے ہوئے کہتی جا رہی تھی۔ اُس کا باتیں کرنے کا انداز اس خاتون کی سب سے بڑی کشش تھی ——— !

"خیر بہرکیف تمہیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے تمہیں مشاطگی کی اچھی خاصی تربیت دے دی!" بیگم درانی ہنس کر کہنے لگیں۔

"دیکھو مریم! اس بے محل تمسخر سے میرا جی نہ جلاؤ! میری بات پر سنجیدگی سے غور کرو۔ لڑکی کے مستقبل کا معاملہ ہے اور تم اُسے ہنسی میں اڑا دیتی ہو؟"

مسز اخلاق کا چہرہ اور بھی سنجیدہ اور متغیر سا ہو گیا۔ بیگم درانی کے ہونٹوں پر سے بھی وہ عارضی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگیں۔

"تم میری نہایت عزیز اور مخلص بہن ہو خورشید! اور مجھے معلوم ہے کہ تمہیں وفا سے بے حد محبت ہے تم اس کی بہتری کے خواہاں ہو۔ اسی لئے

اس رشتے کے واسطے اصرار کر رہی ہو۔ مگر میرے سامنے لڑکی کے میلان طبع کا سوال ہے۔ وہ کوئی عام سمجھ بوجھ کی معمولی لڑکی ہوتی تو بے شک میں صرف اپنی یا تمہاری پسند پہ بھروسہ کر کے کہیں بھی اس کی شادی طے کر دیتی، لیکن وفا نہایت ہی نازک مزاج اور حساس لڑکی ہے۔ پھر روشن دماغ اور تعلیمیافتہ ہے۔ زندگی کے اس مسئلہ کو جہاں ہم نے کلیتہً اس کے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیا تھا اسی طرح مجھے یہ بھی منظور نہیں کہ اُسے پوری۔ اپنے ہاتھ میں لے لوں ـــــــ۔"

وہ کہہ رہی تھی کہ مسز اخلاق بے صبر ہو کر درمیان ہی بول اٹھی ـــــــ

"تو آخر کہتی کیا ہو۔ میری تو عقل ماری گئی یہ چیستان سنتے سنتے! نہ لڑکی کی پسند پر بھروسہ کرتی ہو۔ نہ معاملے کو اپنے ہی ہاتھ میں لینے کو تیار ہو تو آخر کرنا کیا ہے؟" مسز اخلاق نے جیسے عاجز آ کر سر تھام لیا۔

"گھبراؤ نہیں خورشید! میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو میری عزیزہ!" بیگم درانی نے نرم لہجہ میں کہا۔

"سمجھاؤ ـــــــ!"

مسز اخلاق دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم لجبہ اُلجھاتے اور صوفے کی پشت سے لگتے ہوئے اُس کی طرف دیکھنے لگی گویا سمجھنے کے واسطے تیار ہو کر بیٹھ گئی۔

"اپنے شریکِ زندگی کی شکل وصورت۔ عادات وخصائل اس کے رجحانات پسند ناپسند کا تجزیہ کر کے اس سے متفق ہونا لڑکی کا کام ہے ہمیں اُسے اس حد تک آزادی دینی چاہیئے۔ کہ وہ اپنے مشاہدہ سے مطمئن ہو کر اظہار خیال کرے۔ اس کے بعد لڑکے کے خاندانی کوائف اُس کے وسائلِ معاش وغیرہ کی دیکھ بھال اور پڑتال ہمارے ذمہ ہے اگر کوئی شخص ہر پہلو سے تسلی بخش ہو تو میرے نزدیک وہ رشتہ قابل قبول ہے ـــــــ طیب کے معاملہ

میں جہاں تک لڑکی کے دیکھنے کی باتیں تھیں۔ مگر وہ خاندانی الجھنیں نکل آئیں تو مجھے انکار کر دینا پڑا ——“

”وہ کیا الجھنیں تھیں ذرا میں بھی تو سنوں؟“ مسز خلیق حسب عادت درمیان میں بول اُٹھی۔

”وہ بحث اب دُور از کار ہے۔ میں اُس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتی۔ خیر کہنا یہ تھا۔ کہ اب نادر کے معاملہ میں، میں اپنے نقطۂ نظر سے مطمئن ہوں تو وفا اس طرف توجہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتی اور اس کی میں قائل نہیں کہ لڑکی کو مجبور کروں۔“ بیگم درّانی کہہ رہی تھیں۔

”مجبور نہ کرو پس وپیش سمجھاؤ۔ نادر کو اپنے ہاں آنے جانے کی اجازت دے دو اور وفا کو اِس سے بات چیت کر کے اس کا مزاج پرکھنے کا موقع مہیّا کرو۔“ مسز اخلاق نے مشورہ دیا۔

”وفا رضامند نہیں ہوتی۔ دو مرتبہ نادر مجھے ملنے کے واسطے آیا۔ مگر وہ کچھ نہ کچھ عذر کر کے ٹل جاتی۔ پھر میرا عندیہ سمجھ کر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہ وہ سرِ دست شادی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔ اِس کے ذہن پر طیّب کا خیال نقش ہو چکا ہے۔ اور وہ اس ذکر سے بہت رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اُسے فی الحال اُس کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ میں اس کی سہیلی روشن کے ذریعے بھی کوشش کر چکی ہوں مگر وہ اِس موضوع پر کسی کی بھی سُننے کو تیار نہیں ہوتی۔“

بیگم درّانی نے فیصلہ کن لہجہ میں کہہ کر اس گفتگو کو ختم کر دینا چاہا مگر مسز اخلاق کو قائل کر کے خاموش کرنا مشکل تھا۔

”تین سال تو ہو گئے اَب ختم ہونے دو اس قصہ کو!“ وہ خشونت کے شکن پیشانی پر پیدا کر کے بولی۔

”لو بھلا میں نہیں ختم ہونے دیتی —— ؟“ بیگم درّانی اُس کی بات پر مسکرا کر بولیں۔

”اللہ پاک کوئی بہتر صورت پیدا کر دے ــــــ بہر کیف اُمید تو یہی کرنی چاہیئے۔ نوکری کیا ہے وقت گزارنے کا ایک مشغلہ ہے میں نے کہا اب ایم۔ اے کر کے گھر میں بیکار پڑی پڑی پہلے کی طرح بیمار ہی نہ ہو جائے۔ اتفاق سے کوئی پروفیسر چھٹی پر جا رہی تھی مسز قاسم نے خود کہہ کر اسے جگہ دی تو میں نے مناسب نہ سمجھا کہ منع کروں۔“ بیگم درانی کہنے لگی۔

”وہ مسز قاسم کون ہیں؟“ مسز اخلاق نے پوچھا۔

”زمانہ گورنمنٹ ڈگری کالج کی پرنسپل ہیں۔ کسی زمانہ میں میرے ساتھ پڑھتی تھیں۔“ بیگم دُرّانی نے بتایا۔

”ہوں ــــ۔“

مسز اخلاق نے لاتعلق سے انداز میں کہا اور چند لمحے کسی گہری سوچ میں کھو گئی۔

”اُس وقت سے آئی ہوئی یونہی بیٹھی ہو کچھ بتایا نہیں کیا پیو گی؟“ بیگم دُرّانی نے گھنٹی دباتے ہوئے پوچھا۔

”خاک پیوں گی! تم نے تو میرا دل جلا رکھا ہے!“

وہ اُسی موضوع پر سوچتے سوچتے پھر بیگم دُرّانی سے شاکی ہو گئی تھی۔

”اوہو! اس صورت میں تو ضرور کسی ٹھنڈی چیز کی خواہش ہو گی!“

وہ ہنس کر کہنے لگیں اور اتنے ہی میں ریشم حاضر ہوئی۔

”کوئی نہایت خوشبودار اور مفرح جیسا ٹھنڈا مشروب بنا کر لاؤ ریشم!“ مالکہ نے حکم دیا۔

”بہت بہتر صاحب!“

ریشم نے اپنا مقررہ فقرہ دہرا دیا۔ جو دن بھر میں اُسے سینکڑوں بار کہنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے عمدہ لباس اور ظاہری حیثیت سے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی تھی لیکن بیگم درّانی جو شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی شاہانہ ذہن کی خاتون تھی۔ اپنے ہاں کے ملازموں کو کھانے اور پہننے میں برابر کا درجہ دیتی تھی مگر آداب و قواعد کی پُر ستارانہ حدود سے آگے بڑھنے کی انہیں اجازت نہیں تھی۔ اِس مرحلہ پر آکر انہیں اپنے اور آقاؤں کے درمیان ادب آمیز فاصلہ ملحوظ رکھنا ہوتا تھا۔

"دیکھا نا؟ تم نے پھر تمسخر کی اڑا لی؟ میں حیران ہوں۔ بلکہ تمہارے اس رویہ سے پریشان ہوں۔ کہ تم نے بچی کے مستقبل سے آنکھیں موند رکھی ہیں، تم اُسے بچپن کے ایک رجحان سے چسپاں رہنے کی اجازت دے رہی ہو اور اس کا خیال ہٹانے کی کوشش نہیں کرتیں ———"

مسز اخلاق پھر اُسی موضوع پر آگئی جیسے اس کے متعلق ابھی ابھی واضح گفتگو سے قطع نظر، اُسے پھر زیرِ بحث لانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

"خورشید ڈیئر! سوچو تو سہی آخر میں اس کی ماں ہوں ———؟"

"اور وہ تمہاری ایک ہی بچّی ہے ———؟"

مسز اخلاق نے اپنی سہیلی کو بات ختم کرنے کی مہلت دیئے بغیر، جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد دلائی۔

"ہاں ——— اور اس صورت میں وہ میری توجہ کا واحد مرکز ہے۔ اس کے سوا دنیا میں ہے کون جس کے متعلق میں سوچ سکوں۔ میں نے اپنے طور پر پوری پوری کوشش کی ہے کہ اس کی توجہ کو کسی اور طرف مبذول کر سکوں۔ مگر اس کے معصوم ذہن میں جو عکس ایک دفعہ نقش ہو چکا ہے وہ ابھی تک مٹا نہیں سکی۔ اگرچہ اُس نے اپنی طرف سے میری خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ اور اس کا ہر قدم [illegible] کی خاندانی روایات

کے شایانِ شان رہا ہے۔ یہاں تک کہ جب اسے معلوم ہوا۔ کہ طیّب انگلینڈ گیا ہے تو اُس نے خود جاتے جاتے روانگی ملتوی کر دی۔ کہ مبادا وہاں اُس سے سامنا ہونے کے امکانات پیدا ہو جائیں اور یہاں ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا ـــــ مگر اس کے باوصف وہ اُسے ابھی تک بھلا نہیں سکی۔ مگر خیر وقت ہر نقش کو مٹا دیتا ہے۔ اُمید کرنی چاہیئے کہ اللہ تبارک تعالےٰ بہتر ہی کریں گے ـــــ"

اس کے بعد دونوں کافی دیر تک تبادلہ خیالات کرتی رہیں۔ مگر مسز اخلاق، بیگم درّانی جیسی پختہ عزم و ارادہ کی خاتون کو کسی طرح قائل نہ کر سکی کہ کہ وہ وفا پر اس سلسلہ میں جبر کرے۔ اور اُسے زبردستی شادی پر مجبور کرے

(۲۲)

اُس شام کھانے کی میز پر بیگم درّانی اور وفا کے علاوہ روشن بھی موجود تھی۔ روشن نے تولیہ سے ہاتھ پونچھتے ہوئے میز پر ایک غائر نگاہ ڈالی اور معاً پکار اُٹھی۔

”یا اللہ خیر —— ! کہیں انٹی خورشید تو نہیں آ رہیں آج بھی کھانے پر؟“

”نہیں تو —— ! تمہیں کیونکر یہ —— خیال ہوا؟“ بیگم درّانی ہنس کر پوچھنے لگیں۔

”خیال نہیں خالہ جان! بلکہ مجھے تو احتمال ہے کہ اگر آپ نے مدعو نہیں کیا تو اپنے ان پسندیدہ کھانوں کی کشش سے انٹی خورشید بھی پہنچیں گی —— آج میز پر تین چیزیں اُن کی پسند کی ہیں۔ چانپ کے گوشت میں پکے ہوئے بینگن ٹماٹر۔ مسور کا پلاؤ اور روغن جوش! بھلا کیسے نہیں پہنچیں گی وہ؟“

روشن کہہ رہی تھی۔ بیگم درّانی ہنسنے لگیں۔

”تمہاری وہی باتیں رہیں —— انٹی خورشید کوئی بلّی تو نہیں کہ کھانوں

کی خوشبو پر آ پہنچے گی؟"

"یا خدا بلّی سے بھی بدتر —— ! اُف توبہ! میرا مطلب ہے یعنی بلّی سے بھی بڑھ کر ہیں وہ اس معاملہ میں! امّی کہا کرتی ہیں کھانوں کی خوشبو کے معاملہ میں وہ قوّتِ سامعہ کے علاوہ ایک چھٹی حس رکھتی ہیں!" روشن نے اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا؟ وہ کیسے؟" بیگم درّانی نے ہنس کر پوچھا۔

"مثلاً بیٹھے بیٹھے کہیں گی —— "ارے! یہ بلا گھی کی ماش کی دال کون ابال رہا ہے؟ یا کہیں گی —— "کہیں پھیکے آلو تلے جا رہے ہیں!" ایک دن ہمارے ہاں آئیں تو آتے ہی بولیں —— "یہ سالم کریلے تیل میں تلوا رہی ہو ارشی؟" اور واقعی کریلے تیل میں تلے جا رہے تھے۔ امّی نے انہیں کھانے پر روک لیا تھوڑی دیر کے بعد بیٹھے بیٹھے چلائیں "اے کیا تمہارے خانساماں نے بھنگ پی رکھی ہے ارشی؟ پڈنگ لگ رہی ہے اور اُسے خبر ہی نہیں؟ لگی ہوئی پڈنگ کیا خاک مزہ دے گی کڑواہٹ آ جائے گی ذائقہ میں!"

جب دسترخوان پر بیٹھے تو کھانا شروع کرنے سے پہلے ہی بولیں —— "مٹر قیمے میں نمک پھیکا ہے! نمک منگواؤ" امّی نے چکھا تو واقعی نمک پھیکا تھا۔ اُن کی باتیں سنا سنا کر امّی بہت ہنسایا کرتی ہیں ہمارے ہاں دسترخوان پر تو اکثر آنٹی خورشید کا ذکر رہتا ہے۔ روشن ہنس ہنس کر سُنا رہی تھی۔

"ذکر سے پہلے فاتحہ پڑھ لیا کرو تاکہ اُن کھانوں کا کچھ تو حصّہ اس کی روح کو پہنچ جایا کرے!"

بیگم درّانی ہنس کر کہنے لگیں۔ دفا بدستور خاموشی سے کھانے میں مصروف تھی۔ کیونکہ آنٹی خورشید کے ذکر پر ہی چڑ گئی تھی۔ نادر والے رشتہ پر اصرار

کرنے کی وجہ سے وفا کو ماں کی اس عزیز سہیلی سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اور اب ذرا روشن نے ذرا مہلت دی تو بیگم درّانی کو محسوس ہوا کہ وفا اس وقت سے خاموش اور سنجیدہ ہے۔ اور ہنسی میں ان کا ساتھ نہیں دے رہی۔

„تم بھی تو کچھ بولو وفی؟” انھوں نے بیٹی کے چہرے کی طرف محبّت سے دیکھ کر کہا۔

„کیا بولوں امّی! اس روشنی کو آپ دیکھتی ہیں ایک لمحہ جو چپ ہوئی ہو! لگاتار بے ربط باتیں کیے جاتی ہے ——!” وفا نے شکایت کی نظروں سے روشن کو گھورا۔

„ارے کونسی بے ربط باتیں کیں ہیں میں نے؟ مسلسل ہی تو خورشید انٹی کا ذکر ہے!” وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔

„بس چٹاگانگ کی منظر کشی کا ذکر کرتے ہیں —— کیا نام ہے اس کا؟” روشن نے چشمک کرتے ہوئے کہا۔

„سہیلی تم سے کس نے کہا —— شاگرد کہنا چاہیے!” وفا کہنے لگی۔

„اچھا محترمہ اُستانی صاحبہ، شاگرد ہی سہی! مگر عمر میں تمہارے برابر ہے اس رعایت سے اور تمہیں وہ بہت پیاری ہے اس وضاحت سے سہیلی کہہ دیا تو کچھ بے جا نہ کیا؟” روشن نے جواب دیا۔

„بھائی لڑائی موقوف کرو اور ہمیں اس لڑکی کے متعلق بتاؤ کون ہے وہ؟ جس کا ذکر ہے؟” بیگم درّانی پوچھنے لگیں۔

„خود وفا ہی بتائے گی آپ کو مجھے تو اس کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔”

„جی ہاں! یہ بیچاری تو آج کل بس خورشید انٹی کی ہسٹری اور چٹاگانگ

کا جغرافیہ ہی رٹنے میں مصروف ہیں۔ اور انہیں کچھ خبر نہیں۔" وفا نے روشن کو گھورتے ہوئے کہا۔

اس وقفہ میں میز پر سے برتن ہٹا کر ریشم نے آئس کریم اور برف میں لگے ہوئے آم میز پر رکھ دیئے تھے ایک ایک پلیٹ اور سبک جیسی چھریاں ہر ایک کے سامنے رکھ دیں۔ بیگم درانی نے ایک آم منتخب کیا اور اسے تراش کر کھاتے ہوئے پھر وہی ذکر چھیڑا۔

"اچھا تو کون ہے وہ لڑکی؟ جس کا ابھی ذکر ہو رہا تھا"

"امی! بی اے کی ایک طالبہ ہے اس کا نام سعدیہ ہے۔ بے حد ذہین لڑکی ہے۔ مباحثہ میں ایسے پیارے انداز میں بولتی ہے کہ جی چاہتا ہے سنتے ہی جائیے۔ جماعت میں اُس سے بڑھ کر کوئی لڑکی لائق نہیں۔ صورت بھی قدرت نے اُسے ایسی دی ہے کہ میں نے آج تک ایسی حسین لڑکی نہیں دیکھی ——" وفا نے ماں کے اشتیاق پر مختصراً بیان کیا۔

"کیا آئینہ میں بھی نہیں دیکھا تم نے ویسی بلکہ اُس سے بڑھ کر حسین ترین لڑکی؟" روشن نے یک دم نہایت سنجیدہ صورت بنا کر وفا سے پوچھا۔

"آئینہ میں —— ؟ اُہو! روشی عجب فضول باتیں ہیں تمہاری!" وفا نے پہلے تو کچھ نہ سمجھتے ہوئے استفسار کیا پھر خود ہی اس کا مطلب سمجھ کر شرمندہ سی ہو گئی۔ بیگم درانی ہنسنے لگیں۔

"ہاں بھائی کیوں نہیں میری بھی ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہے اور روشی بھی حسنِ صورت میں کسی سے کم نہیں۔ مگر ہمیں اشتیاق ہو گیا اُس لڑکی کو دیکھنے کا جس کی وفا نے اس قدر تعریف کی ہے۔" بیگم درانی ہنسنے اور ساتھ ساتھ آم کھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اور مجھے —— ؟ رشک، حسد اور نفرت ہو گئی ہے اس لڑکی سے جس کی وفا نے اس قدر تعریف کی۔ اس نے تعریف کر کے خواہ مخواہ مجھے اس کی دُشمن بنا دیا —— !"

روشن کہنے لگی۔ تو وفا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"لو بھلا اس میں اُس غریب کا کیا قصور ؟ تم مفت میں اُس کی دُشمن بنا کر سارا گناہ اپنے سَر لیا۔" روشن منہ پھیلائے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"واہ ! یہ بھی یکطرفہ تماشہ ہے کہ کسی بے قصور سے دُشمنی تم کرو اور گناہ میرے سر ہو ؟"

وفا اور بیگم درّانی ہنستی ہوئی میز کے سامنے سے اُٹھیں۔

"بھئی ٹھہر جاؤ وفی ! میرا آم تو ختم ہو لینے دو —— !" روشن جلدی پکار اُٹھی۔

"ارے ! تو تم اطمینان سے ختم کرتی رہو، میں نے تمہیں مجبور کیا کہ میرے ساتھ ہی تم بھی میز سے اُٹھ جاؤ۔" وفا کہنے لگی۔

"خالہ جان ! دیکھئے آپ تو بھلا بزرگ ہیں۔ مگر اس وفی کا یہ بھی کوئی اصول ہے کہ مہمان کو میز پر چھوڑ کر خود اُٹھ گئی ہے ؟" روشن نے گٹھلی چُوستے چُوستے چھوڑ کر وفا کی شکایت کی۔

"وفا ! اپنی سہیلی کا ساتھ دو بھئی !" بیگم درّانی ہنس کر سفارش کرنے لگیں۔

"امی جان ! یہ گٹھلی بھی نگل کر اُٹھے گی۔ اُسے چھوڑنے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا اس کا۔"

وفا کہنے لگی۔ اور بیگم درّانی کھانے کے کمرے سے ہنستی ہوئی نکلیں۔

"بڑی پیاری بچّی ہے میری روشی ! جب بھی آ جائے گھر باغ و بہار

بن جاتا ہے!" وہ کہتی ہوئی نکلیں۔

"دیکھی میری خالہ جان کی قدر دانی؟ اور ایک تم ہو کہ ——" وہ متواتر گٹھلی چوستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"روشی! خدا کے لئے چھوڑ دو یہ گٹھلی بھو اور اٹھو!"

وفا اس کا بازو کھینچتے ہوئے کہہ رہی تھی آخر روشن بڑی مشکل سے اُٹھنے پر آمادہ ہوئی اور دونوں وفا کے کمرے میں آئیں۔ روشن خلاف عادت بہت دیر تک خاموش رہی۔ وہ اُس کی طرف دزدیدہ نگاہ سے دیکھتی رہی وہ خبر نہیں کیا سوچ رہی تھی۔ آخر اُس نے ایک طویل سانس کھینچا۔

"کیا ہوا ——؟ کیا سوچ رہی تھیں اُس وقت سے؟" وفا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس یہی سوچ رہی تھی۔ کہ بعض نام کتنے غلط رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اب تمہارا نام وفا کیسا بے محل ہے۔ اور یک دم برعکس!" وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"وہ کیسے برعکس ہے میرا نام ——؟" وفا مسکرا کر پوچھنے لگی۔

"بالکل ایسے ہی جیسے مشہور ہے کہ ؎

برعکس نہند نام زنگی کافور!"

یعنی حبشیوں کے ہاں جو ایک کالا کلوٹا لونڈا ہوا تو انہوں نے اس کا نام کافور رکھ دیا اب کافور کی رنگت سفید براق ہوتی ہے۔ کالے بھجنگے حبشی کو اگر سفید کہیں تو برعکس نہ ہوگا۔؟

روشن یوں سنجیدگی سے تشریح کر رہی تھی جیسے کسی نہایت مسئلہ

"تو اس کا اطلاق مجھ پر کیسے ہوا؟" وفا مسکرا کر پوچھنے لگی۔

"وہ ایسے کہ تم یک دم بیوفا ہو اور نام کی وفا ہو صرف!"

روشن نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور نہایت ڈرامائی انداز سے سر ہلا کر کہا۔

"کیا بے وفائی کی میں نے تمہارے ساتھ؟ جس کا بے محل شکوہ لے کر بیٹھی ہو؟"

وفا کو اس کی ایک حرکت پر ہنسی آ گئی۔

"میرے ساتھ بھی کب تک وفا کرو گی ——— مگر فی الحال میں دوسروں کے ساتھ تمہارے سلوک کو دیکھ کر متاثر ہوئی ہوں۔ آج صبح سے مجھے تین سال پہلے کے خوشگوار حالات یاد آ رہے ہیں اور رہ رہ کر دل جیسے مسلا جا رہا ہے ———"

روشن اس وقت صحیح معنوں میں سنجیدہ بھی تھی اور رنجیدہ بھی۔ جس سے وفا بھی خاصی متاثر ہوئی اور غور سے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرنے لگی۔

"کیوں آج صبح کوئی خاص واقعہ پیش آیا؟" وہ روشن سے پوچھنے لگی۔

"تم نے آج کا "ڈیلی ہیرلڈ" دیکھا!" روشن نے بذاتِ خود وفا سے پوچھا۔

"نہیں تو ——— کیا کچھ خاص خبر ہے؟" وفا نے پوچھا۔

"جی ہاں! خاص الخاص کہو! آکسفورڈ یونیورسٹی کے قانون کے طلبار میں ایک پاکستانی طالب علم پوری یونیورسٹی میں اوّل آیا۔ ابھی تمہارے آنے سے بیشتر خالہ جان اور میں یہی ذکر کر رہے تھے ——— !"

روشن اپنی پوری پوری آنکھیں کھولے وفا کے چہرے کو گھور رہی تھی۔ وفا کے مسکراتے ہوئے گلابی چہرے پر سے جیسے یک دم رنگ اور

تبسم سلب ہو گیا۔ آنکھوں کی چمک اُداسی کی گہرائیوں میں ڈوب کر دھندلی ہو گئی۔ اُس کے متلاطم سینے سے ایک دل سوز آہ اُٹھی جسے ہونٹوں تک آنے کی اجازت نہ ملی اور اِس کے سینے ہی کے اندر دم توڑ دینے کا جگر خراش منظر روشن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

”تو ــــــ امّی نے تمہیں منع نہ کیا۔ کہ یہ ذکر مجھ سے نہ کرنا؟“

وہ شکستہ سی گھٹی ہوئی آواز میں روشن سے پوچھنے لگی۔ اِس کے لہجہ میں شکایت اور ملامت کا شائبہ بھی جھلکتا تھا۔

”کیا تو سہی!“ روشن نے جواب دیا۔

”پھر ــــــ؟“ ”پھر تم نے کیوں میرے سامنے یہ ذکر چھیڑا“ روشن نے جواب دیا۔

”تمہیں امّی کے حکم کا احترام لازم تھا۔“ وفا نے بدستور اپنی سہیلی سے شکایت کے لہجہ میں کہا۔

”انہوں نے تو خیر منع کرنا ہی تھا۔ مگر مجھے تو تم پر حیرت ہے کہ تم کیونکر ایسی کٹھور اور سنگدل ہو گئیں کہ اب بیچارے طیّب بھیّا کا نام بھی سننا اُن کا ذکر تک کرنا تمہیں گوارا نہیں؟ میں نے غلط تو نہیں کہا۔ کہ تم نام کی تو وفا ہو مگر درحقیقت پرلے درجے کی بے وفا ہو!“

روشن کے اِن لفظوں نے وفا کے دل پر جیسے گہرا زخم لگایا۔ اور وہ شکایت بھری نظروں سے اِس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اگر کوئی اور یہ کہتا تو مجھے اُس سے شکایت نہ ہوتی مگر تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ــــــ یہ طعنہ دے کر مجھے روحانی صدمہ پہنچاتی ہو روشی!“ اِس نے روشن سے شکایت کی۔

”میں ایسی مجبوریوں اور بے زبان سعادت مندیوں کی قائل نہیں ہوں۔

مجھے معلوم ہے کہ خالہ جان تمہاری کسی ضد کو چند دن سے زیادہ برداشت نہیں کیا کرتیں اور آخر پوری کر دیا کرتی ہیں۔ یہ تو نہ صرف تمہارا اپنا بلکہ ایک دوسرے شخص کی زندگی کا سوال تھا۔ تم نے کیوں بے جا شرم و لحاظ میں اپنا اور اِس کا مستقبل تاریک کر لیا ——؟"

روشن کے دل میں آج طیّب اور اِس کے ساتھ گذارے ہوئے دِنوں کی یاد نے بے طرح مچلنا شروع کیا۔ وفا آزردہ اور خاموش تھی۔

اِس عظیم کامیابی کے موقعہ پر اتاری ہوئی تصویر میں بھی اُس کے چہرے پر خوشی کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ آنکھوں سے جیسے ویرانیاں جھانک رہی ہیں۔ ہونٹوں پر عجیب قسم کی تلخی دکھائی دیتی ہے —— اس تصویر کو دیکھ کر میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ کہ وہ تمہیں ابھی تک بھلا نہیں سکا۔ اور ایک تم ہو کہ اسے ملنے کے امکانات تک کو خود مسدود کرتی رہی ہو۔ خالہ جان کو معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ انگلینڈ گیا ہوا ہے۔ اور تم نے خود وہاں جانے سے محض اس خیال سے انکار کر دیا۔ کہ وہاں طیّب سے سامنا نہ ہو جائے؟" روشن آنکھوں میں ملامت بھرتے ہوئے وفا کو گھور کر کہہ رہی تھی۔

"تو کیا میں امی کو دھوکا دیتی؟ جب معلوم ہو گیا۔ کہ اُس کی اور میری یکجائی ناممکن ہے تو میں کیوں اُسے بے سود امیدیں باندھنے کا ایک اور موقعہ مہیا کرتی۔ امی نے کہہ دیا۔ کہ قیامت تک بھی یہ امر ممکن نہیں کہ وہ اُس کی خواستگاری منظور کریں۔" وفا کہنے لگی۔

"مگر ایسی ہی کیا رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ خالہ جان صریحاً طیب کو بیحد پسند کرتی تھیں خود مجھ سے انہوں نے تمہارا عندیہ معلوم کیا اور طیب کی طرف سے سلسلہ جنبانی کی صاف منتظر رہتی تھیں ——؟"

روشن نے آج نئے سرے سے اُس پرانے قصہ کو یوں دہرانا اور اس پر بحث کرنا شروع کیا جیسے وہ کوئی حال کا مسئلہ ہو۔ طیّب کی تصویر اور اس کی شاندار کامیابی نے گذشتہ یادوں کو تازہ کر دیا تھا۔ اُسے وفا کے خیالات کا بھی علم تھا وہ بھی طیّب کو فراموش نہ کر سکی تھی اور اسی بنا پر تہیہ کر چکی تھی۔ کہ عمر بھر شادی نہ کرے گی۔

"کچھ تمہیں معلوم ہوا کہ آخر خالہ جان کے اس طرح یک دم بدل جانے کی وجہ کیا تھی؟" وفا کو خاموش پا کر روشن نے پھر پوچھا۔

"یہ تم کس خیال سے الجھنے لگیں؟ چھوڑو ان رفت و گذشت باتوں کو" وفا نے آزردہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں اور خوب جانتی ہوں۔ کہ یہ رفت و گذشت باتیں نہیں ہیں۔ کیا تم قسم کھاتی ہو کہ تم اُسے دل سے بھلا چکی ہو؟ ہرگز نہیں! اور اس کی آج کی تصویر پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔ کہ اپنی اس شاندار کامیابی کے باوجود، وہ کسی ناکام و ناشاد شخص کی صورت ہے۔ کسی شکستہ دل آدمی کی شبیہہ ہے۔ جس کی روح مر چکی ہے۔ جو اپنی زندگی کی مسرتوں کو مایوسیوں کی قبر میں دفن کر چکا ہے — اور سچ کہتی ہوں وفا! اُس وقت سے میرا جی چاہ رہا ہے کہ تم سے خوب لڑوں بیچارے طیّب کے ساتھ مقابلہ کرتیں تو ضرور کامیاب ہو جاتیں" وہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے ہر ممکن کوشش کی —— !" وفا نے زیر لب کہا اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔

"ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ کہ کچھ تمہیں وجہ بھی معلوم ہوئی؟ تم نے اصرار کر کے پوچھا ہو نا اُن سے؟" روشن بغور اُس کے چہرے پہ نگاہ جماتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"جو کچھ بھی ہو گی کوئی معقول وجہ ہو گی۔ آخر ایک ماں بلا کسی معقول وجہ

کے تو اپنی اولاد کی مسرتوں کا گلا نہیں گھونٹ دیا کرتی !"

وفا نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا ۔ اُسے روشن سے شکایت تھی کہ اُس نے دبے ہوئے زخموں کو کرید کر از سرِ نو خونچکاں کر دیا ۔

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ؟"

روشن نے پوچھا مگر وفا نے جواب نہ دیا جیسے سنا ہی نہ ہو ۔

"میں خالہ جان سے پوچھوں گی !"

"کیوں ایک بیکار بات کے پیچھے ہو روشی ؟" وفا کی آواز سے دل شکستگی کا احساس ظاہر تھا ۔

"بیکار کیوں ؟" روشن نے تعجب سے پوچھا ۔

"اور تمہیں تو کیا فائدہ ہوگا وجہ معلوم کرنے سے ؟" وفا کہنے لگی ۔

"انسان کوئی تدبیر کر سکتا ہے ۔ کوئی راہ نکال سکتا ہے" روشن نے جواب دیا ۔

"امی ہرگز نہیں بتائیں گی" وفا نے کہا ۔

"صبح میں نے اُن کے چہرے پر جو کیفیت دیکھی اُس سے ظاہر تھا کہ وہ بھی ابھی تک طیب کو ہاتھ سے دے بیٹھنے پر متاسف ہیں" وفا کہنے لگی ۔

"وہ تو ہیں ہی ——— طیب کی وہ ابھی تک ہر لحاظ سے تعریفیں کرتی ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اُسے جو مقام دینے سے انکار کر دیا وہ کبھی نہ دیں گی اور وجہ کبھی نہ بتائیں گی" وفا نے پورے وثوق سے کہا ۔

"کیوں مگر ——— ؟ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا ۔

روشن نے حیرت سے کہا اُسے یقین تھا کہ اس کے اصرار پر وہ ضرور وجہ بتادیں گی مگر وفا نے اُسے منع کیا ۔

„اُن کے بیان کے موجب وہ کسی عزت دار گھرانے کا ایسا راز ہے جس کے اظہار سے گئی افراد کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔” وفا نے کہا۔

„تم نے تو مجھے اور بھی مشتاق بنا دیا۔ میں یہ راز معلوم کر کے رہوں گی!” روشن نے کہا۔

„کچھ نہ کر سکو گی معلوم کر کے بھی!”

وفا نے انجانے میں کچھ اِس قسم کے انداز سے کہہ دیا جس سے ظاہر تھا گویا اُسے معلوم ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکی۔

„میں سمجھی! تم جانتی ہو اور مجھے بتا نہیں رہیں ——! بڑے افسوس کی بات ہے وفّی کیا تم مجھے اپنے سے الگ خیال کرتی ہو ——؟ اگر ایک بات تمہیں معلوم ہے اور تم نے اُسے کسی غیر متعلقہ شخص پر ظاہر نہیں کیا تو میں کیونکر ایسا کر سکتی ہوں ——؟ مجھے بتا دو! میں اِس معمّہ کو حل کر کے کوئی راہ نکالنا چاہتی ہوں۔ کہ طیّب جیسے شخص کے درد کا مداوا کر سکوں!”

روشن تمام عمر میں کبھی اِس قدر سنجیدہ نہیں ہوئی تھی جس قدر کہ اس وقت نظر آ رہی تھی۔ اور وفا اِس سے کافی متاثر ہوئی۔

„کوئی راہ نہیں نکال سکو گی روشی! قدرت نے روزِ ازل ہی سے ہمارے لئے تمام دروازے بند کر دیئے تھے —— آہ روشی! میری اپنی روشی!”

ایک مدت کے بعد وفا کے دل نے صبر و تحمّل کے سارے بند توڑ ڈالے اور وہ اپنی دلی رفیقہ کی گود میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ جب اس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا تو روشی نے پھر پوچھا۔ آخر اس کے اصرار پر وفا کو وہ سارا واقعہ بیان کرنا پڑا۔ کہ کیونکر طیّب کی امّی آئیں اور وفا نے پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر اُن کی گفتگو سنی۔ یہ سارے واقعات سننے کے بعد

روشن چند لمحے پیشانی پر ہاتھ رکھے کچھ سوچتی رہی۔

"عین ممکن ہے کہ طیب کی حقیقی ماں نے شرعی طور پر نکاح کیا ہو اور وہ شخص نکاح کے باوجود کسی اختلاف پر اُس سے الگ ہو کر روپوش ہو گیا ہو ——؟" وہ تفکر کی نگاہ سے وفا کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔

"ممکن ہے —— اور اس کے بر عکس ہونا بھی عین قرینِ قیاس ہے۔" وفا نے شبہ کے لہجہ میں کہا۔

"بہر حال کسی نہ کسی طرح اس معاملہ کی تحقیق کر کے درست نتیجہ پر ضرور پہنچنا چاہیئے —— حالانکہ اگر خالہ جان کی جگہ میں ہوتی تو کسی بھی حالت میں قصور واروں کی غلطیوں کی سزا بیچارے بے گناہوں کو نہ دیتی! طیب اگر اپنی ذات سے ہر طرح اور صحیح معنوں میں ایک مکمل انسان ہے تو کس قدر قابلِ رحم بات ہے۔ کہ اُس کی پیدائش کے کسی چکر کو اس کی زندگی کے راستہ میں سدِّ راہ بنا دیا جائے۔ اور پھر تمہیں ناکردہ گناہ کا دُکھ اٹھانا پڑے۔" روشن کہنے لگی۔

"سب تمہارے زاویہ نظر سے نہیں دیکھتے روشن!" اِس نے مسکرا کر کہا۔

خیر دیکھا جائے گا   ممکن ہے میں اُن کے زاویہ نظر کے مطابق ہی حقائق کو اُنکے سامنے پیش نظر کر سکوں۔"

روشن کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ وفا اگرچہ مایوس تھی مگر چپ رہی۔

"یہ ڈاکٹر ناز اِس راز پر روشنی ڈالنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اُسے بتانا ہو گا۔ کہ طیب کی حقیقی ماں کون ہے یا تھی۔ اور یہاں سے معلومات کی راہ پیدا ہو گی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

"واہ ڈاکٹر ناز تمہیں کیوں بتانے لگی؟ جس راز کو اس نے امی سے چھپایا اور اتنی مدت چھپایا وہ تم جیسی ناتجربہ کار لڑکی سے کس بنا پر کہہ دے گی؟" وفا نے مایوسی سے کہا۔

"خیر کوشش فرض ہے۔"

روشن نے جیسے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے جواب دیا۔ صریحاً وہ کسی اہم مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔

◆

(۲۳)

تازہ سنبل جیسے نرم اور سفید بال، اُن میں ہلکی ہلکی لہریں۔ کشادہ پیشانی موٹی موٹی روشن اور زیرک آنکھیں چوڑا طباقی چہرہ بھرے بھرے رخسار موٹے مگر خوش قطع ہونٹ۔ صحت مند جسم۔ اتنی عمر کے باوصف چہرے پر جوانی کی تازگی اور اعضا میں شباب کی چُستی! یہ تھی ڈاکٹر ناز! وہ اپنے گداز رخسار کو ہتھیلی تھامے کہنی کو میز کے کنارے پر ٹکائے ہوئے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی نوجواں لڑکی کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی سیاہ نیم آستین بلاؤز میں سے سفید سفید بازو اور گردن کی گولائی خوشنما نظر آتی تھی گہری سبز ریشمین ساڑھی اگرچہ عمر کے لحاظ سے کچھ موزوں نہ تھی —————— لیکن اس کے جسم پر غیر موزوں معلوم نہ ہوتی تھی۔ وہ بڑے تحمل سے اُس لڑکی کا بیان سُن رہی تھی اور چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس قسم کی باتیں سُنتے رہنے کی عادی ہے!

"تو کہاں ہے وہ لڑکی؟"

اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی سے اُس نے پوچھا۔ آواز میں کوئی غیر معمولی استعجاب نہ تھا۔

"نہیں ہے ـــــــ مگر ڈاکٹر! پہلے آپ وعدہ کریں کہ یہ معاملہ اخفا میں رہے گا ـــــــ!"

نوجوان لڑکی نے کہا جو سیاہ برقعے کے نقاب کو اس طرح اوڑھے ہوئے تھی۔ کہ اس کی موٹی موٹی شربتی آنکھیں جو اس وقت ہراساں ہرنی سی تھیں، نظر آ رہی تھیں اور باقی چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

"ہم ایسے معاملات کو الم نشرح نہیں کرتے۔ ہسپتال کی حدود تک ہمارا ذمہ ہے۔ کہ اس سے کوئی آگاہ نہ ہو گا۔" معمر عورت نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔

"یہ محض میں نے احتیاطاً کہہ دیا ـــــ ورنہ ایک واقعہ سے مجھے معلوم ہے۔ کہ یہاں ایسے نازک مسئلوں کو مدت العمر راز میں رکھا جاتا ہے۔"

لڑکی زیرِ لب کہنے لگی تو ڈاکٹر نے اپنی کشادہ پیشانی پر بل ڈال کر آنکھوں کو نیم باز کرتے ہوئے لڑکی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

"کیا معنی؟"

وہ پوچھنے لگی اس کے لہجہ میں حیرت ابھر آئی۔ لڑکی نے اپنی کرسی ذرا آگے کھسکالی اور گردن آگے کر کے رازدرانہ انداز سے بولی۔

"ڈاکٹر! عرصہ ہوا آپ اسی بدنصیب لڑکی کی ماں پر بھی احسان کر چکی ہیں۔ آپ ہی کے احسان کے نتیجہ پر وہ بچہ آج ترقی کے آسمان پر ستارے کی طرح چمک رہا ہے۔ آپ توجہ نہ کرتیں تو شاید وہ کسی گندی نالی پھینک دیا جاتا ـــــــ"

"کون ـــــ؟ کس کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟"

اب تو لیڈی ڈاکٹر ناز بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی اور بڑے غور سے اجنبی دوشیزہ کے چہرے کو گھورنے کی کوشش

کرنے لگی۔

"اسی لڑکے کے متعلق کہہ رہی ہوں جسے آپ نے راز نیاز احمد کی بیوہ کو دلوایا تھا ـــــــ!" لڑکی نے غور سے لیڈی ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا ـــــــ؟ یعنی کیا مطلب کہ انجمن کی بیٹی کو یہ مشکل درپیش ہے جس کے متعلق آپ کہہ رہی ہیں؟"

لیڈی ڈاکٹر ناز حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

"جی ہاں ـــــــ" لڑکی نے مختصر جواب دیا۔

"کون سی بڑی یا چھوٹی ـــــــ؟ گلنار کو تو میں نے ایک دفعہ کسی تقریب میں دیکھا تھا چھوٹی کو کبھی نہیں دیکھا ـــــــ کیا نام ہے چھوٹی کا؟"

"عذرا ـــــــ! نہیں اُسے آپ نے نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ کہہ رہی تھی۔" لڑکی نے بتایا۔

"تو انجمن ابھی تک انگلینڈ ہی میں مقیم ہے؟ میرے؟ میرے ساتھ تو مدت سے خط و کتابت موقوف کر رکھی ہے اُس نے۔ میں نے آخری مرتبہ اس وقت دیکھا جب وہ ان دونوں لڑکیوں کے باپ خواجہ بہرام سے طلاق حاصل کر کے اپنے تیسرے شوہر مسٹر جعفری کے ساتھ انگلینڈ گئی۔ پھر ان میاں بیوی نے وہیں کی شہریت اختیار کر لی۔ لڑکیوں کو دادی نے پالا۔ بیچارے خواجہ صاحب اس قدر شکستہ دل ہوئے کہ حج بیت اللہ کے واسطے گئے تو وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بڑھیا ماں کہاں تک جوان لڑکیوں پر ضابطہ رکھتی آخر بے راہ ہو گئی ہوں گی شکل صورت کی بھی ماں کی طرح اچھی خاصی ہوں گی ـــــــ اپنے وقت کی مانی ہوئی حسینہ تھی ـــــــ!" ڈاکٹر ناز بے تکلفی پر آئی تو کہتی چلی گئی۔

”جی ہاں عذرا کی صورت بالکل پنی امی کی طرح ہے —— میں نے انہیں تو نہیں تصویر دیکھی ہے!“ لڑکی کہنے لگی۔

”چلو شکل تک کوئی مضائقہ نہ تھا۔ چلن ماں جیسا نہ سیکھتی۔ اُس بدبخت عورت نے اپنے ہرجائی پن کی وجہ سے آج لڑکیوں کا بھی وہی اپنا سا حشر کیا“، ڈاکٹر ناز افسوسناک صورت بنائے کہہ رہی تھی۔

”گلنار تو بُری لڑکی نہیں۔ خدارا البتہ خود سر اور ضدی ہے کہ کسی کی نہیں سُنتی۔ اسی وجہ سے نقصان اُٹھایا۔ اَب بھی ایک ہی ضد پر اڑی ہوئی ہے میں اور گلنار سر پٹخ کر رہ گئیں مگر وہ اُس بدبخت شخص کا نام ظاہر نہیں کرتی۔ کہ ہم اُسے شادی پر مجبور کر سکیں۔ کہتی ہے وہ کہیں چلا گیا ہے“،

برقعہ پوش دوشیزہ بتا رہی تھی۔ ڈاکٹر ناز نے افسوسناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”وہی ماں والی ٹریجڈی ہوئی اس بدنصیب لڑکی کے ساتھ کنور جمیل بھی اسی طرح اُسے چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا تھا۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے پہلے سول میرج کر لی تھی ——! پھر یکایک جمیل نے اُسے طلاق دے دی اور خود کہیں چلا گیا“

”اچھا —— ؟ تو اگر وہ بچہ —— میرا مطلب ہے کہ اگر وہ بچہ —— میرا مطلب ہے کہ اگر وہ جائز بچہ تھا تو پھر گلنار کی امی نے اُسے کیوں دے ڈالا؟“

وہ لڑکی یک دم پوچھ بیٹھی اس کے لہجہ میں انتہائی استعجاب تھا،

”انجمن کے والد اُس کی شادی اپنے طور پر خواجہ بہرام سے طے کر چکے تھے۔ جو ایک بے حد متمول تاجر تھا۔ انجمن کی ماں اچھی ہوشیار عورت تھی اُس نے شوہر سے بالا ہی بالا انجمن کو یہاں میرے ہسپتال میں داخل کر کے بچے کے جھنجھٹ سے چھٹکارا پایا اور چند ماہ بعد بیٹی کی

شادی خواجہ بہرام سے کر دی مگر بہرام سے بھی چند ہی سال میں وہ متنفر ہو گئیں اور دونوں بچیوں کو اس کے حوالے کر کے طلاق حاصل کر لی۔ یہ تو حال تھا اس چڑیل انجمن کا!“ ڈاکٹر ناز افسوسناک لہجہ میں کہہ رہی تھیں۔

”جی ہاں! یہ سب کچھ انہوں نے اپنے روزنامچہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ عذرا نے مجھے دکھایا تھا۔“ برقعہ پوش دوشیزہ کہنے لگی۔

”اچھا ——؟ تو سب باتیں آپ کو اسی روزنامچہ سے معلوم ہوئیں؟“ ڈاکٹر ناز پوچھنے لگیں۔

”جی ہاں!“ لڑکی نے جواب دیا۔

”واہ واہ! یہ بھی بڑی جسارت کا کام ہے کہ انسان اپنے گناہوں کو تحریری شکل میں پیچھے چھوڑ جائے ——!“ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”انھوں نے تو بڑے دلچسپ پیرائے میں قصہ کہانی کی طرح۔ سب کچھ لکھا ہے اور اس موقعہ پر جب لڑکے کی پیدائش کا ذکر ہے تو خوب خوب تعریف لکھی ہے۔ وہی پڑھ کر تو عذرا نے آپ کے پاس بھیجا۔“ برقعہ پوش لڑکی نے کہا۔

”اچھا!“ وہ پوچھنے لگی۔

”جی ہاں —— ورنہ مجھے آپ کے متعلق کیونکر معلوم ہو سکتا کہ آپ نے عذرا کی امی کی مدد کی تھی!“ لڑکی ہنس کر کہنے لگی۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے —— باتوں کے دوران مجھے کئی مرتبہ آپ سے یہ سوال کرنے کا خیال آیا کہ آپ کو یہ باتیں کیونکر معلوم ہوئیں!“ ڈاکٹر ناز کہنے لگیں۔

”جی بس وہ عذرا کی امی کا روزنامچہ بجائے خود دلچسپ افسانوں کا مجموعہ

ہے! ہم لوگ عموماً اکٹھے بیٹھتے ہیں تو پڑھتے رہتے ہیں۔“ لڑکی کہنے لگی۔

”جب ہی ماں کے اوصاف کا عکس لڑکیوں پر بھی پڑا —— مگر آپ تو بہت اچھی دوشیزہ معلوم ہوتی ہیں آپ کی ایسی لڑکیوں کے ساتھ کیسے دوستی ہو گئی ——؟“

”جی کالج میں ——! گلنار میری کلاس فیلو ہے۔ عذرا ہم سے چھوٹی ہے چنانچہ اس موقعہ پر اور اس مصیبت میں ان کی مدد کرنا میرا دوستانہ فرض تھا۔“ وہ کہنے لگی۔

”اچھا تو کب اُسے میرے پاس لانے کا ارادہ ہے؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”جب، آپ مناسب خیال کریں، وقت مقرر کریں میں لے آؤں گی۔“ لڑکی کہنے لگی۔

”آپ کل سہ پہر کو اسی وقت لے آئیں۔ اس وقت میں فارغ ہوتی ہوں۔“ ڈاکٹر ناز نے کہا۔

”جی بہت بہتر!“ اور لڑکی جانے کے واسطے اُٹھی۔

”اور ہاں پیچ کیا خواجہ بہرام کی بوڑھی ماں زندہ ہیں کیا؟“ ڈاکٹر ناز پوچھنے لگی۔

”جی زندہ ہیں مگر مردوں سے بدتر۔ بصارت بھی جاتی رہی۔ مفلوج ہو چکی ہیں وہ ایک کمرے میں پڑی رہتی ہیں۔ پوتیاں اپنی من مانی کرتی پھرتی ہیں۔ گلنار تو پھر بھی کچھ خیال کرتی ہے مگر عذرا تو اُن کی بات نہیں پوچھتی۔“ لڑکی نے بتایا۔

”ننھیال میں تو صرف نانی زندہ ہیں بچارے شیخ ضامن علی تو کئی سال ہوئے فوت ہو گئے۔“ ڈاکٹر ناز کہنے لگی۔

”یہ بزرگ وار شا، گل، رعذرا کے نانا تھے؟“ وہ لڑکی پوچھنے لگی۔

"جی ہاں —— شیخ ضامن علی خفیہ پولیس کے کوئی بڑے افسر تھے۔ یہ انجمن ان کی ایک ہی تو بیٹی تھی" ڈاکٹر ناز نے بتایا۔

"اچھا ڈاکٹر! بہت بہت شکریہ! میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا ——" لڑکی نے دوبارہ نقاب گراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں —— اچھا خدا حافظ!" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"خدا حافظ" لڑکی نے جواب دیا اور قدم بر داشتہ ڈاکٹر کے بنگلے سے نکل کر سڑک پر تیز تیز چلنے لگی۔

(۲۴)

شام گہری ہو چلی تھی۔ بنگلے کے خوش کمپاؤنڈ میں وفا ٹہل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موتیا کے پھولوں سے لدی ہوئی ایک ٹہنی تھی۔ جسے وہ کبھی سونگھتی کبھی رخساروں سے مس کرتی تھی۔ اُسے موتیا کے پھول بے حد پسند تھے۔ اور مالی سے فرمائش کر کے اُس نے کئی قسم کا موتیا بکثرت اپنے بنگلے میں لگوا رکھا تھا۔ اس وقت وہ پھولوں سے لدے ہوئے پودوں کے درمیان ٹہل رہی تھی۔ سارا چمن یاسمین کی نوشیلی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ آسمانی رنگ کا ریشمین قمیض غرارہ پہنے اور ویسا ہی دوپٹہ اوڑھے شام کے جھٹپٹے میں یوں لگ رہی تھی جیسے سمندر کی تاریک سطح پر کوئی جل پری نمودار ہو۔ وفا بظاہر گلگشت کر رہی تھی مگر درحقیقت وہ کسی کی منتظر تھی۔ ہر لمحے اُس کی نگاہیں بے اختیار صدر دروازے کی طرف اُٹھ جاتیں۔ جب بھی سڑک پر سے کوئی سواری گزرتی وہ چونک کر پھاٹک کی طرف دیکھنے لگتی۔ اندھیرا چھا گیا تو اس کے انتظار نے اضطراب اور تفکر کی صورت اختیار کر لی۔ اتنے ہی میں ریشم اُسے تلاش کرتی ہوئی باغیچہ میں چلی آئی۔

"صاحبزادی! میں آپ کو کھوجتی ہوئی سارے میں پھری،" وہ ہنس کر کہنے لگی۔

"کیوں کیا ضرورت پڑ گئی تھی مجھے کھوجتے پھرنے کی؟"

وفا نے خشونت سے پوچھا اُس کی طبیعت پہلے اُلجھ رہی تھی۔

"بڑی سرکار کھانے پر منتظر ہیں صاحب!" وہ کہنے لگی۔

"اُہو ____ اچھا! عرض ____ میں ابھی حاضر ہوئی"

اور وہ قدم برداشتہ اپنے کمرے میں آئی۔ لباس پر ایک غائر نگاہ ڈالی۔ بال درست کیے۔ اور پھر جلدی جلدی اندرونی صحن میں آئی جہاں شام کے کھانے کا میز لگایا جاتا تھا۔ بیگم درانی حسبِ معمول اپنی مقررہ کرسی پر منتظر بیٹھی تھیں۔

"امی! آپ کو بہت دیر تو انتظار نہیں کرنا پڑا ____؟ میں روشنی کے انتظار میں ذرا باہر چمن میں نکل گئی تھی۔ وہ چڑیل ابھی تک پہنچی نہیں!"

وہ میز پر ماں کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اچھا ____؟ روشن آ رہی ہے واپس تو تھوڑی دیر اس کا انتظار ہی نہ کر لیں؟ میں نے سوچا گھر چلی گئی!" بیگم درانی پوچھنے لگی۔

"نہیں امی! آپ اپنے معمول میں فرق نہ ڈالیے۔ بھلا روشن کا کیا جس وقت بھی پہنچ گئی شامل ہو جائے گی!"

وفا نے جواب دیا۔ تو بیگم درانی ہنس پڑیں۔

"ہاں یہی تو خوبی ہے روشن کی! بے تکلف انسان ہے"

بیگم درانی نے ہنس کر کہا اور میز پر سے سفید رومال اُٹھا کر زانوں پر پھیلایا۔ وفا نے بھی ان کی تقلید کی۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اگر اُس نے

کھانے پر روشن کا انتظار کیا تو خود اس کی امی بھی التوا کریں گی۔ اور ان کے مقررہ وقت میں فرق پڑ جائے تو اشتہا باقی نہیں رہتی تھی۔

"مگر روشن اس وقت گئی کہاں تھی؟" بیگم درانی پوچھنے لگیں۔

"وہ تو کافی دیر سے گئی ہوئی ہے۔ کہتی تھی کوئی ضروری کام ہے۔" وفا نے جواب دیا۔

"گھر نہ چلی گئی ہو۔ اب تو خاصی شام ہو چلی کہاں بیٹھ رہی اس وقت تک؟" وہ متفکر سی ہو کر پوچھنے لگیں۔

"نہیں امی جان! وہ گھر نہیں گئی بس آتی ہی ہو گی آپ فکر نہ کریں!"

وفا ماں کی طرف پیار سے دیکھ کر کہنے لگی۔ اور اتنے ہی میں اسے روشنی کے قدموں کی جانی پہچانی چاپ سنائی دی۔

"لیجئے وہ آگئی روشنی!"

روشن کے نمودار ہونے سے بھی پہلے وفا نے اُس کی آمد کا اعلان کر دیا۔ ریشم نے میز تو پہلے ہی تین افراد کے واسطے ترتیب دیا تھا۔

"اسلام وعلیکم خالہ جان! معاف کیجئے گا میں نے شاید آپ کو انتظار میں رکھا۔"

وہ کہنے لگی کیونکہ کھانے کے روزانہ وقت میں واقعی تاخیر ہو چکی تھی۔

"کچھ خاص انتظار میں تو نہیں رکھا ہم لوگ کھانا تو شروع کر ہی چکے —— خیر آؤ بسم اللہ کرو! کہاں رہ گئی تھیں اس وقت تک۔" بیگم درانی پوچھنے لگی۔

"خالہ جان! کوئی سواری نہیں مل رہی تھی —— ! الاماں! باہر بے

جاؤ تو آمد و رفت کی ہما ہمی اور ٹریفک کے بے پناہ سیلاب میں انسان اپنے آپ کو تنکا سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ افرا تفری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ایک رکشا آئے تو دس آدمی بیک وقت اُس پر یوں جھپٹتے ہیں، جیسے گوشت کے ٹکڑے پر چیلیں! نفسا نفسی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ مرد اتنی رعایت نہیں کرتے کہ کوئی اکیلی عورت نا وقت کہیں کھڑی ہے تو پہلے اُسے سواری کی سہولت مل جائے۔ اور کہنے کو یہ لوگ اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں ـــــ!

روشن اتنی سنجیدگی سے شاذ و نادر ہی کوئی گفتگو کرتی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے آج خوب ہی گت بنی ہے سواری کے انتظار میں، جو یوں زہر اُگل رہی ہو؟“

وفا ہنس کر کہنے لگی۔ اپنی تقریر کے دوران ہی روشن ہاتھ دھو کر تولیہ سے خشک کرتی ہوئی اپنی نشست تک آپہنچی تھی۔

”تمہیں، تو بہت ہی خوشی ہو رہی ہے میرے زحمت اُٹھانے پر؟“

وہ جھنجلا کر وفا کی طرف دیکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”معلوم ہوتا ہے میری بیٹی واقعی بہت تھک گئی ہے۔ اُہو! روشی! واقعی یہ کیا حماقت ہے تم گاڑی کیوں نہ لے گئیں بیٹی؟“

بیگم درانی کو شاید اب یاد آیا۔ کہ گھر میں کار موجود تھی اور روشن اسے کام میں لا سکتی تھی۔

”میں نے سوچا شاید آپ کو کہیں جانا ہو۔ ہم لوگ تو خیر کرایہ کی سواری سے کام لے سکتے ہیں آپ کو ضرورت پیش آجاتی تو مشکل ہوتی۔“ روشن کہنے لگی۔

”تم دریافت کر سکتی تھیں۔ اور مجھے کہیں جانا ہوتا تو میں خورشید کو ٹیلیفون کر کے گاڑی منگوا لیتی۔ تم نے ناحق اتنی کوفت اُٹھائی۔“ بیگم

درّانی ہمدردی کے لہجہ میں کہہ رہی تھیں۔

"کوفت اُٹھائے بغیر کوئی کام بھی تو نہیں بنتا وہ جو مرزا غالب نے کہا ہے ؎

"بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا!"

"درست ہی فرمایا ہے!" وہ سالن کا ڈونگا اُٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔

"اور دوسرا مصرعہ تو عین تمہارے حال پر صادق آتا ہے کہ ؎

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا!

وفا نے چمچے کے ساتھ روشن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو بیگم درّانی ہنس دیں۔

"بھئی وفی! تم میری بیٹی کے ساتھ بہت زیادتی کرتی ہو!" وہ کہنے لگیں۔

"ہوں!"

اور روشن اپنی سہیلی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز سے سر ہلا کر رہ گئی۔ منہ میں بڑا سا نوالہ تھا آسانی سے بول نہ سکی۔

"ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انسان نہیں ہوں ——— انسان سے بھی کچھ بڑھ کر ہوں!"

روشن نے وفا کی آنکھوں میں مسکراتی ہوئی نگاہوں کو بغور دیکھ کر کہا تو وہ یک دم ٹھٹکی اور استفسار کی نظروں سے اپنی اس عزیز سہیلی کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر غیر معمولی کیفیات دیکھ کر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ——— "ضرور کوئی اہم بات ہے!" وہ اپنے دل میں سوچنے لگی۔ شوق اور تجسّس سے اس کی اشتہا یک دم اُڑ گئی نوالہ جیسے حلق میں اٹکنے لگا۔

"اُہو! ہم بھی تو سنیں کونسا فوق الفطرت معرکہ سر کیا جو یہ دعوٰے ہے۔"

بیگم درّانی روشن کی عادت سے واقف تھیں ہنستے ہوئے پوچھنے لگیں۔ وہ ان دونوں لڑکیوں کی باہمی نوک جھونک اور دوستانہ آویزش سے بہت محظوظ ہوتی تھیں۔ اس لیے جن دنوں روشن اُن کے ہاں مقیم ہوتی تو وہ بے حد خوش رہتیں۔ گھر کے پر سکُون اور یکساں جیسے ماحول میں زندگی کے آثار نظر آنے لگتے۔

"ضرور عرض کروں گی خالہ جان! آپ اطمینان سے کھانا ختم کر لیجیے۔ پھر باہر لان میں ذرا ٹہلنے نکلیں گے تو باتیں ہوں گی!"

روشن تو واقعی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اس کے انداز سے وفا کے دل کی دھڑکن اور بھی تیز ہو گئی وہ عجب قسم کی بے چینی اور الجھن محسوس کرنے لگی جس میں اُمید کا احساس غالب تھا۔ کیونکہ روشن کا لہجہ امید افزا تھا۔ وہ کوئی سازگار خبر لے کر آئی تھی۔ کھانا ختم ہوا تو بیگم درّانی حسب معمول سب سے پہلے میز سے اُٹھ گئیں۔ اُس شام تو روشن نے بھی حسب معمول التوا نہ کیا۔ اور یہ چاہتے ہوئے بھی کہ تاخیر کر کے وفا کو تنگ کرے وہ خود صبر نہ سکی اور جلدی سے اُٹھتے ہوئے بیگم درّانی سے کہا۔

"خالہ جان باہر لان میں ٹہلنے چلیے گا آپ بھی۔؟"

"ہاں ——— تم چلو میں ابھی آتی ہوں ——— تو اس کا یہ مطلب سمجھا جانا چاہیے کہ تمہارے پاس واقعی کوئی سنجیدہ خبر ہے سنانے کے لیے۔؟"

وہ ہنس کر پوچھنے لگیں، کیونکہ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھیں کہ روشن حسب عادت وفا سے چھیڑ کر رہی ہے۔

"جی ہاں! آپ تشریف لائیے تو!" "وفا کا ہاتھ پکڑ کر جاتے

ہوئے بولی۔

ریشم سے کہکر کمپاؤنڈ میں کرسیاں رکھوا لو۔ کھانے کے فوراً بعد میں ٹہلنا پسند نہیں کرتی۔"

بیگم درّانی کہنے لگیں اور ریشم فوراً ہی تعمیل کے واسطے چلی۔

"تم سے خدا سمجھے وفی! تم نے تین سال مفت میں خراب کیے۔ خود پریشان ہوئیں اُس غریب کو حیران کیا مجھے الگ اُلجھن میں ڈالے رکھا ـــــ کاش تم نے شروع ہی میں مجھے یہ سب کچھ بتا دیا ہوتا۔"

وہ تمہید کو طول دے رہی تھی اور اُسی قدر وفا بے صبر ہوئی جاتی تھی۔

"کچھ کہہ بھی چکو ہوا کیا! امّی بھی آ جائیں گی ـــــ بھلا تم نے امّی کو کیوں بلا لیا؟" وفا نے بےچینی سے اُس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر کہا۔

"خالہ جان کے سامنے سب بیان کروں گی ـــــ!" وہ کہنے لگی۔

"بات کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟" وفا نے اُس کے چہرے پر متوقع جیسی نگاہیں جما کر پوچھا۔

"سب کچھ بتاتی ہوں۔ ذرا خالہ جان کو آ لینے دو ـــــ بخدا انہیں اپنی فردِ گذاشت پر افسوس ہوگا! اگر وہ ذرا سی کوشش کرتیں تو یہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو جاتا۔"

روشن کہہ رہی تھی اور اتنے ہی میں بیگم درّانی برآمد ہوئیں۔ انہیں دیکھتے ہی دونوں لڑکیاں لان کی طرف آئیں جہاں ریشم نے ابھی ابھی کرسیاں بچھا کر درمیان میں ایک ہلکی تپائی رکھ دی تھی اور اب ریشم ایک طشت میں خوشبودار آئس کریم کے پیالے لیے ہوئے آئی۔

"آم کی آئس کریم کا یہ نیا طریقہ میں نے آج ایک زنانہ ماہنامہ میں پڑھا۔ چکھو تو بھلا کیسی بنی ہے؟"

بیگم کہہ رہی تھیں۔ اور دونوں لڑکیوں نے اپنے اپنے پیالے اُٹھائے۔

"بے حد لذیذ! عین حسبِ معمول! بھلا خالہ جان کے ہاتھ کی ہی چیز لذیذ نہ ہو؟" روشن کھاتے کھاتے تعریف کیے جا رہی تھی۔

"لطافت تو کمال کی ہے اس میں امّی! ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آم نہیں بلکہ آم کا ایسنس ڈالا آپ نے!" وفا کہنے لگی۔

"تمہیں پسند تو آئی؟ دیکھنا تو صرف یہ ہے!" وہ ہنس کر پوچھنے لگیں۔

"بے حد!" اس نے خالی پیالہ طشت میں رکھتے ہوئے کہا۔

"خالہ جان آج ایک عجیب قصّہ سُننے میں آیا ——— روشن نے بات چھیڑی۔

"کہو ——— ؟" بیگم درّانی متوجہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"شیخ ضامن علی خفیہ پولیس کے کوئی بڑے افسر تھے۔ اِن کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا پورا نام انجمن آرا ہوگا مگر عرفِ عام میں انجمن کہلاتی تھی۔ اُس نے کچھ ایسے آزاد ماحول میں پرورش پائی۔ اور والدین کے بے جا لاڈ پیار نے اُسے اِس حد تک بگاڑ دیا۔ کہ خودسَر اور بداخلاق ہو گئی۔ اور اپنی اور اپنے متعلقین کی تباہی کا موجب بنی اگر وہ ظالم عورت اپنے اخلاق اور چلن کی حفاظت کرتی تو کئی معصوم ہستیاں ناکردہ گناہ کی تکلیف اُٹھانے سے بچ جاتیں ——— خیر مختصر یہ کہ اِس نے درپردہ ایک شخص کنور جمیل

سے شادی کرلی۔ یہ شادی ''سول میرج'' تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد ان دونوں کے درمیان کچھ ایسا اختلاف رونما ہوا کہ وہ شخص —— کنورجمیل اسے طلاق دے کر خود روپوش ہوگیا۔ کن حالات میں ایسا ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا تو نہ ہوا! ہمیں اس سے بحث نہیں! ہمیں صرف یہ جاننا ہے کہ انجمن کی کنورجمیل سے قانونی طور پر سول میرج ہوئی ——!''

وہ نہایت سنجیدہ لہجہ میں بیان کر رہی تھی۔ کہ بیگم درّانی نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا۔

''مگر ہمیں یہ کیوں جاننا ہے ——؟ کیا معاملہ ہے آخر؟'' وہ جیسے بے صبر ہو کر پوچھنے لگیں۔

''عرض کرتی ہوں —— ہمارے لئے اس نکتہ کا انکشاف بے حد ضروری تھا! کیونکہ اُن غیر ذمہ دار والدین کے اس فعل کا نتیجہ چند بے گناہ ہستیوں پر اثر انداز ہوا —— خیر میں عرض کر رہی تھی کہ کنورجمیل اپنی بیوی کو یقیناً اس کے کسی ناپسندیدہ فعل کی بنا پر طلاق دے کر لاپتا ہوگیا۔ انجمن کے والدین اس واقعہ سے بے خبر تھے۔ اس کے والد نے ایک مشہور مقامی تاجر خواجہ بہرام سے بیٹی کا رشتہ طے کر دیا مگر اس عرصہ میں انجمن کو معلوم ہوا کہ —— میں معافی چاہتی ہوں خالہ خان! کہ حقائق بیان کرتے ہوئے آپ کے روبرو مجھے صاف بیانی سے کام لینا ہوگا۔ اگرچہ پاس ادب و لحاظ مانع ہے مگر حقیقت کا اظہار لازم ——'' روشن نے التوا کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں کہو —— میرا خیال ہے اُسے معلوم ہوگا کہ وہ اُمید سے ہے؟''

بیگم درّانی نے اس موقعہ پر روشن کی مشکل رفع کرتے ہوئے سنجیدگی سے قیاس ظاہر کیا۔

"جی ہاں بالکل ——— بالکل!" روشن مطمئن ہو کر کہہ اٹھی۔

"اچھا تو پھر ———؟"

بیگم درانی کو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور ان کے ذہن میں کچھ کچھ روشنی بڑھنے لگی تھی جس میں ماضی مبہم واقعات کی پرچھائیاں ابھرنے لگی تھیں۔

"انجمن نے یقیناً ماں کے سامنے اپنی حالت کا انکشاف کیا۔ ماں ہوشیار عورت تھی اس نے شوہر سے بالا ہی بالا بیٹی کو ایک مقامی لیڈی ڈاکٹر کے "میٹرنٹی ہوم" میں داخل کر دیا۔ وہ کئی مہینے پوشیدہ طور پر وہاں مقیم رہی۔ خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ ضامن علی صاحب سے خدا جانے کیا عذر کیا ہو گا؟ اس سے ہمیں کیا بحث؟ بہر حال ان کی بیگم تو "سیکرٹ سروس" میں اپنے شوہر نامدار کو بھی جُل دے گئیں اور انہیں اس معاملہ کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کہ بیٹی جس کی وہ شادی رچانے کی تیاریاں کر رہے تھے، ایک بچے کی ماں بن گئی اور بچے کو کسی ضرورت مند کو فی سبیل اللہ خیرات میں دے کر فراغت سے گھر آ گئی اور چند ہی ماہ بعد ملک التجار خواجہ بہرام کی بیگم بن گئی۔ خواجہ بہرام بے حد دولت مند تو ضرور تھے مگر قدامت پسند۔ انجمن کو جس کی زندگی کا جزو "انجمن آرائی" تھا یہ گھٹی گھٹی فضا راس نہ آئی۔ بھلا آم کا پیڑ ریگستان میں اور بادام کا پودا میدانی علاقہ میں کیسے پنپ سکتا ہے خواجہ بہرام سے اس تھوڑے ہی عرصہ میں طلاق لے لی۔ اس شادی کی نشانی کے طور پر ایک لڑکی گلنار تو ضرور پیدا ہوئی ——— مگر دوسری فرضی لڑکی عذرا خدا جانے پیدا ہوئی یا نہ ہوئی۔ ———"

"بہر کیف ———"

"ہیں ———؟ وہ کیا بات ہوئی؟"

بیگم درانی حیران ہو کر پوچھنے لگیں۔ اور وفا نے بھی حیرت کی

نظروں سے اُس کے چہرے پر نگاہیں جما دیں تو روشن ہنسنے لگی۔

"پہلے اصلی واقعات سنا لوں ——— اُس کے بعد ان اضافی باتوں کی تشریح کروں گی ——— ! بہرکیف انجمن خواجہ بہرام سے طلاق لے کر کسی مسٹر جعفری کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی۔ اور اب تک دونوں میاں بیوی وہیں کے شہری ہیں۔ بشرطیکہ وہ اب تک اُن مسٹر جعفری سے حسب عادت طلاق نہ لے چکی ہو ——— یہ اگرچہ ایک اضافی سی بات ہے لیکن انجمن کے قصہ کی ایک شاخ ہے اسلئے عرض کیے دیتی ہوں۔

خواجہ بہرام حج کے لئے گیا تو دُنیا کے سلوک سے یا جگ ہنسائی سے دل شکستہ ہو کر وہیں مر گیا۔ یقیناً ہارٹ فیلیر" سے مرا ہوگا ——— اس کی بڑھیا ماں نے گلنار کو پالا، بڑھیا خبر نہیں ہے یا مر گئی ——— مگر دعا کرنی چاہیے کہ مری نہ ہو صرف قیاس کے موجب نابینا اور مفلوج پڑی ہو اگر اس کے خلاف ہوا تو یہ بھی ایک میری فردِ عمل میں لکھا جائے گا خدا مجھے معاف کرے! میں نے آج ایسے ایسے خالص جھوٹ بولے کہ میں خود حیران ہوں وہ کیونکر میرے ذہن میں خود بخود اُبھرتے چلے آئے ———؟ شاید وہ مثبت اور منفی (نیگیٹیو۔ پوزیٹیو) کا کلیہ یہاں بھی کارفرما ہے کہ خالص حقیقت کو اُگلوانے کے لیے خالص جھوٹ کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ اور میرا یہ تجربہ سو فی صد کامیاب رہا ——— !" وہ ہنس کر کہہ رہی تھی۔

"کیا یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بچہ کس کو فی سبیل اللہ دیا گیا؟ اور لیڈی ڈاکٹر کا نام تو یقیناً تمہیں معلوم ہوگا!"

بیگم درّانی کمال اشتیاق سے اپنی کرسی سے آگے جھک کر روشن کے چہرے کو غور سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ڈاکٹر ناز کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ بھی اُسے جانتی

ہیں ـــــ اور وہ بیچارہ لڑکا بیگم راؤ احمد نیاز کو دیا گیا جو بے حد ضرورت مند تھی ـــــ! وہ قصہ اپنے طور پر الگ نوعیت رکھتا ہے مگر ہمیں تو اسی قدر معلوم کرنا تھا۔ کہ طیّب اپنے سابقہ اور حقیقی والدین کا جائز بیٹا تھا۔ اور اچھے خاندان سے ہے اس کی ماں صدیقی شیخوں کی بیٹی تھی اگرچہ بے حد جھوٹی تھی۔ اور باپ راجپوت تھا اگرچہ انتہائی بزدل ثابت ہوا ـــــ! بہرکیف اس بیچارے طیّب بھیّا کا کیا قصور؟ اور میری وفا کی کیا خطا کہ آپ نے ان دونوں معصوموں کو اتنی طویل سزا دے رکھی ہے ـــــ خالہ جان!" روشن نے اپنا بیان ختم کرتے ہوئے اور منت کے لہجہ میں بیگم درّانی کو پکارتے ہوئے ان کا چھوٹا سا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا جو اس وقت برف کی مانند ٹھنڈا تھا، اور روشن کو اس میں لرزش محسوس ہوئی۔ ضبط اور وفورِ جذبات سے وہ کانپ رہی تھیں!

"روشن میری دانشمند بچّی! تو نے ایک بہت بڑے مسئلہ کو حل کر دیا! میرے دل کی ایک بہت بڑی الجھن کو رفع کر دیا بخدا میں طیّب کو کبھی نہیں بھول سکی ـــــ کبھی نہیں ـــــ! جب بھی وفا کی شادی کا معاملہ درپیش ہوتا میں اُسے ٹالنے کے بہانے سوچتی جیسے مجھے کسی معجزہ کا انتظار ہوتا اور معینہ وقت آیا تو وہ معجزہ رونما ہو گیا!" اور انہوں نے روشن کو کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ان کی آواز رقت سے گھٹ گئی۔ وفا کسی بت کی طرح ساکت تھی۔ ماں نے اُس کے زرد چہرے اور پھٹی پھٹی متحیّر آنکھوں کی طرف دیکھا تو محسوس کیا۔ کہ اُسے حالات کے یوں ایکا ایکی کروٹ بدلنے کا گویا یقین نہیں آ رہا۔ اُنہوں نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر روشن کے بعد وفا کو گلے سے لگا۔

"میری حوصلہ مند بچّی کو اللہ پاک نے اُس کے صبر کی

جزاء دی۔"

وہ اس کے سر کو اپنی آغوش میں چھپائے کہہ رہی تھیں۔ اور وفا ماں کی آغوش کی خوش گوار حرارت سے شمع کی مانند پگھل گئی۔ اس کی سرد بے حسی میں زندگی کی روح سرایت کر گئی اور وہ شدید سسکیاں لے لے کر آنسو بہانے لگی —— یہ خوشی اور تشکرانے کے آنسو تھے —— اور اگلے لمحے روشن، ڈاکٹر ناز کے ساتھ ایک "برقعہ پوش دوشیزہ" کے انٹرویو کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔ کہ اس نے کس طرح انجمن کے قصہ سے یکسر لاعلم ہوتے ہوئے بھی عجیب ہوشیاری سے لقمہ دے دے کر خود ڈاکٹر ناز کے منہ سے ساری حقیقت اگلوا لی۔ اور انجمن کی فرضی لڑکی کے ذکر پر تو وفا اور بیگم درّانی تک ہنستے ہنستے بیحال ہو گئیں ——

﴿ ۲۵ ﴾

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پاکستانی طلباء اور طالبات کو دو اور پاکستانی لڑکیوں کے ہوسٹل میں آنے کی اطلاع ملی تو وہ انہیں "خوش آمدید" کہنے اور ان کی ضروریات یا مشکلات کے متعلق پوچھنے اور اپنی خدمات پیش کرنے کے واسطے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ آئے۔ اس غیر اور دُور افتادہ ملک میں جہاں انسان کی ذاتی مصروفیتیں اور سرگرمیاں بڑی مشکل سے اُسے دوسروں کی طرف توجہ کرنے کا وقت دیتی ہیں پاکستانی طالب علموں کی یہ روحِ اخوت قابلِ تعریف اور باعثِ مسرت تھی ——— وفا اور روشن کو اس اجنبی مقام پر وطن جیسا ماحول نظر آنے لگا۔ اپنے لوگ! اپنی زبان! کس قدر غنیمت تھا کہ وطن سے دُور یہ نعمت میسر آ سکے۔ اور ان دونوں مخلص اور نیک دل لڑکیوں کو اُن لوگوں سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ وہ دو چار یا کم و بیش تعداد کی ٹولیوں میں آتے۔ خیر و عافیت دریافت کرتے۔ ضرورتوں کے متعلق سوال کرتے اور پوچھتے کہ وہ ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔

سب آئے مگر ہر آہٹ پر جس کی آمد کا گمان گزرتا تھا وہ نہ آیا۔

آخر روشن نے ایک طالبہ جس کا نام مبارکہ تھا دریافت کیا۔

”یہاں ایک راؤ طیّب نیاز ہیں۔ لاء میں پڑھتے تھے! اسی سال یونیورسٹی میں اوّل آئے اور ایک سال کے کسی مزید کورس کے واسطے پھر یہیں رہ گئے تھے۔ وہ کہیں نظر نہیں آئے ہم لوگ کل سے آئے ہیں ہوسٹل کے تمام لوگ دیکھے وہ کہیں نظر نہیں آئے؟“

روشن کے استفسار پر طالبہ نے اپنے ساتھ ولی لڑکی کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔

”ہم لوگ لٹریچر کے سٹوڈنٹ ہیں۔ لاء کا شعبہ ہمارے شعبہ سے بالکل الگ تھلگ ہے تاہم پاکستانی طلباء یہاں ایک برادری کی طرح رہتے ہیں۔ چاہے کوئی کسی ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتا ہو۔ ایک دوسرے کو جاننا ضرور ہے۔ مثلاً آپ دونوں فرض کیجیے ہسٹری لیں تو بھی ہم لٹریچر کے طالب علم آپ سے ملاقات ضرور رکھیں گے اور آپ سے واقفیت پیدا کریں گے۔ جس صاحب کو آپ پوچھ رہی ہیں وہ یقیناً کسی اور نام سے مشہور ہوں گے۔ اُن سے تو ہم یقیناً واقف ہونگے اُن کے نام سے واقف نہیں۔“

وہ لڑکی مبارکہ کہنے لگی اس سلسلہ میں اُس کی ہمجولی بھی کوئی روشنی نہ ڈال سکی۔

”ہمارا خیال تھا وہ تو خاصے مشہور اور جانے پہچانے آدمی ہوں گے یونیورسٹی میں فرسٹ پوزیشن لی ”ڈیلی ہیرلڈ“ میں اُن کا تعارف معہ تصویر چھپا تھا!“ روشن نے بڑے فخریہ لہجہ میں کہا۔

”اُوہو! اب سمجھی ——— ! یہ ہیرو سوکریٹیز“ کو پوچھ رہی ہیں۔ !

سبزہ! مبارکہ نے اپنے ساتھ والی لڑکی سے کہا اور وہ ہنسنے لگی۔

”وہ یہاں ”ٹی۔ این رائے کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

عام طور پر مسٹر رائے کہلاتے ہیں۔" مبارکہ کے ساتھ والی لڑکی سبزہ نے بتایا۔

"مگر انہوں نے تو کچھ اور ہی نام بتایا ہے۔؟"

وفا نے مسکرا کر مبارکہ کی طرف اشارہ کیا وہ اُس وقت سے حیران ہو رہی تھی۔ کہ اس عجیب و غریب نام کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

اس کے استفسار پر دونوں لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

"گھبرائیے نہیں اس نام کے معنی بھی آپ کو جلد ہی معلوم ہو جائیں گے ——!"

مبارکہ کہنے لگی۔ اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں۔

"کیوں سسپنس (SUSPENCE) میں رکھتی ہو بتا دو!" سبزہ مبارکہ سے کہنے لگی۔

"جی بات صرف اتنی ہے کہ آپ کے وہ مسٹر رائے اس قدر سنجیدہ خاموش اور "زاہدِ خشک" قسم کے آدمی ہیں کہ یہاں لوگوں نے شرط لگا رکھی ہے کہ جو شخص ثابت کر دے کہ وہ ہنستے دیکھے گئے ہیں اُسے خبر نہیں کتنے پونڈ انعام دیا جائے گا! ان کے اس فلسفیانہ اور متفکرانہ طرزِ عمل پر تو اُن کا نام سوکریٹیز (سقراط) رکھا گیا۔ اور اس ساتھ ہیرو کا لفظ لگانے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یونیورسٹی میں شاید ہی کوئی لڑکی ایسی ہو گی جو ان کی چاہت کا دم نہ بھرتی ہو یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی سے متاثر نہ ہوں۔ اور دوسری وجہ اُن کے ہیروازم کی یہ ہے کہ چپکے سے میدان مار لیتے ہیں اور سب دیکھتے رہ جاتے ہیں ——! مقابلہ میں تو کوئی ان کی گرد کو نہیں پا سکتا!"

مبارکہ نے بتایا تو وفا کا چہرہ جوشِ مسرت سے تمتما اُٹھا۔

"خوب ہے!" روشن نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

„آپ دونوں کا ان سے کیا رشتہ ہے ——؟" سبزہ پوچھنے لگی۔

„جی ہاں! میرا تو ان سے بڑا محفوظ قسم کا رشتہ ہے —— میں بہن ہوتی ہوں ان کی! مگر ان کے متعلق اُس وقت بتاؤں گی جب آپ میری تسلی کر دیں۔ کہ ان مسٹر ہیرو کے متلق آپ دونوں صاحبوں کے خیالات تو „عافیت سے ہیں نا؟" روشن نے گویا پہلا حملہ کیا۔

„ہائے روشن! کچھ ہوش کی دوا کرو!"

وفا نے ہنسی روکتے ہوتے سنجیدگی سے اُسے ڈانٹا۔ دونوں لڑکیاں قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ اور دلچسپی سے روشن کی طرف دیکھنے لگیں۔

„ہمارے خیالات بالکل „بخیر و عافیت" ہیں آپ تسلی رکھئے بلکہ یوں کہیئے کہ ان کے جملہ حقوق کسی اور کے نام محفوظ ہو چکے ہیں!" مبارک نے ہنستے ہوئے کہا۔

„یہ تو نہایت ہی مبارک بات ہے —— چنانچہ اب مجھے ان کا تعارف کرانے میں عذر نہیں۔ یہ ان مسٹر ہیرو کی ہونے والی —— ہیروئن ہیں!" روشن نے سنجیدگی سے مگر نہایت ڈرامائی انداز میں بتایا۔

„بہت خوب! بہت خوب!" وہ دونوں تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگیں۔

„روشن! تم سے خدا سمجھے! عجب باتیں ہیں تمہاری!" وفا کہنے لگی۔

„ہاں سچ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ ہیں کہاں؟ کیا اسی ہوسٹل میں نہیں رہتے وہ؟" روشن نے پوچھا۔

„رہتے تو یہیں ہیں —— آپ کو „انکوائری" سے ان کے کمرے کا نمبر معلوم ہو جائے گا۔ چلیئے ہم جاتے جاتے آپ کو لاء کے شعبہ

میں چھوڑتے جائیں۔"

مبارکہ کہنے لگی اور روشن اور وفا فوراً ان کے ساتھ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یونیورسٹی کی عظیم الشان عمارات میں گویا ایک پورا شہر آباد تھا۔ طویل راہداریاں اور وسیع لان طے کرنے میں انہیں کئی فرلانگ کا فاصلہ چلنا پڑا۔ قانون کے شعبہ میں پہنچے تو "انکوائری" کے دفتر سے انہوں نے طیّب کے کمرے کے متعلق پوچھا۔ کمرہ نمبر ۲۴۰ طیّب کا کمرہ تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اپنے ماموں کے پاس لندن گیا ہوا ہے۔ اُس کے ماموں بیمار ہیں اور ان کی تیمارداری کے لئے اُس نے ایک ہفتہ کی چھٹی لے رکھی ہے۔ یہ سُن کر وفا اور روشن دونوں ہی اُداس ہو گئیں۔ مگر کلرک نے بتایا کہ اُن کی چھٹی کے ہفتہ کا آج آخری دن ہے۔ انہیں اگلے روز حاضر ہونا چاہیئے کیونکہ وہ اپنے کالج کی ابتدائی جماعتوں کے لیکچرار بھی ہیں یہ معلوم کر کے انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ اور وہ مبارکہ اور سبزہ کی فرمائش پر اُن کے کمرے میں شام گذارنے کے واسطے جانے پر رضامند ہو گئیں۔

"آپ بھی اپنے کمرے کا نمبر نوٹ کرا جائیں ہم انہیں آتے ہی آپ کا پیغام پہنچا دیں گے۔" کلرک نے کہا۔

"جی شکریہ! آپ انہیں کہیے کہ کمرہ نمبر ۱۲۷ میں آکر ہمیں ملیں۔" روشن نے کہا اور کلرک نے پیغام نوٹ کر لیا۔

مبارکہ اور سبزہ کے علاوہ ان کے کمرے میں ایک اور لڑکی بھی رہتی تھی جس کا نام سمیرا تھا۔ یہ پہنچیں تو سمیرا کھانا تیار کر کے میز پر لگا چکی تھی۔ یہ تینوں لڑکیاں باری باری اپنا کھانا خود تیار کرتی تھیں۔ کیونکہ میس (MESS) کا کھانا انہیں پسند نہیں۔ مبارکہ نے ان کا تعارف سمیرا سے کراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں سن کر خوشی ہوگی کہ یہ ہیرو سوکریٹیز" کی بہن ہیں اور یہ اُن کی منسوبہ!"

مبارکہ نے پہلے روشن اور پھر وفا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وفا کو اس قبل از وقت خطاب پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ اُس کی امّی نے اسے اسی غرض سے یہاں طیّب کے پاس بھیج دیا تھا۔ کہ وہ اس کے سابقہ رنج اور مایوسی کی تلافی کے واسطے خود جا کر اُسے خوشخبری دے اور اسی رعایت سے ایک سال اس کے ساتھ یہاں رہ کر لٹریچر کی کوئی اعلیٰ سند بھی حاصل کر لے پھر یہ لوگ پاکستان واپس آئیں تو ان کی شادی کر دی جائے۔ روشن کے والدین سے خود بیگم درّانی نے خاص طور پر فرمائش کر کے اجازت حاصل کی تھی۔ کیونکہ وہ بھی اس سال ایم۔ اے کر چکی تھی۔

سمیرا کچھ دیر بیٹھی ہوئی ان سے باتیں کرتی رہی۔ اس لڑکی کا زاویہ نگاہ اپنی دونوں ساتھی لڑکیوں سے وسیع تھا۔ اس کے سوالات اُن کی نسبت بہت عالمانہ قسم کے تھے وہ پاکستان کے مختلف ترقیاتی منصوبوں کے متعلق معلوماتی سوال کرتی رہی۔ سیاسی اور مختلف سماجی حالات پر تبادلۂ خیالات کرتی رہی۔ اتنے ہی میں کھانے کا وقت ہو گیا سمیرا نے اُٹھ کر دو اور پلیٹ الماری سے نکالے اور دو کرسیاں اور میز کے قریب کر دیں۔

"آپ نے تو اپنے لیے کھانا تیار کیا ہو گا۔ ہم لوگ عین وقت پر بلا اطلاع چلے آئے۔ یہ کچھ موزوں نہیں لگتا۔" وفا نے کچھ گھبراتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کیجیے۔ کھانا ہم لوگ کافی مقدار میں پکا لیتے ہیں۔ اسی خیال سے کہ کوئی عزیز شامل ہو جائے تو کمی محسوس نہ ہو۔"

سمیرا کہنے لگی۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں بھی کرتی جاتی تھی اور کام بھی۔ اس کے ہاتھ میں ایسی بے تکلفی۔ نزاکت اور پھرتی تھی کہ معلوم ہی ہوتا تھا کہ وہ کچھ کام بھی کر رہی ہے۔ باتوں ہی باتوں میں اُس نے آملیٹ اور میٹھا تیار کر کے مہمانوں کے اعزاز میں دو زائد چیزیں مہیا کر لیں۔ اور سب نہایت مسرت بھرے ماحول میں کھانے کے لئے بیٹھے۔ باتیں بھی ہو رہی تھیں اور کھانا بھی کھایا جا رہا تھا سمیرا نے اپنی خداداد قابلیت سے ان دونوں لڑکیوں کو بے حد متاثر کیا اُس نے اس مختصر وقفہ میں انہیں یونیورسٹی کے نظام تعلیم۔ اساتذہ اور طلبا ان کے طریق کار کے متعلق ایک چھوٹا تعارف پیش کر دیا۔ اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ وہ اس ماحول کو اب یکسر ہی اجنبی نہیں پائیں گی بلکہ اس کے متعلق انہیں کچھ معلومات پہلے ہی سے حاصل ہوں گی۔

کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سمیرا نے نہایت چابکدستی سے کافی دم کر لی "کیتلی" تو وہ خبر نہیں کس وقت لگا آئی تھی برتن ہٹائے تو کافی کا سامان میز پر موجود ہو گیا۔

"کچھ کریم ہو گی سمیرا؟ بھئی میں تو بغیر کریم کے کافی نہیں پیوں گی!" مبارکہ کہنے لگی۔

"جواب کا تو انتظار کر لیا ہوتا۔ اگر نہ ہوتی تو یہ "الٹی میٹم" ملنا بجا تھا" سمیرا نے ہنس کر کہا۔ —

"آہا! تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ کریم موجود ہے؟"

وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔ سمیرا نے کریم کا پیالہ میز پر رکھا۔ سبزہ کافی بنانے لگی۔ یہ لذیذ اور لطیف کافی پینے کے بعد وفا اور روشن نے اپنی میزبان لڑکیوں کا شکریہ ادا کیا اور جانے کے واسطے اُٹھیں۔

"آیئے ہم چل کر آپ کو چھوڑ آئیں۔ میرا تو خیال ہے آپ کو اپنے کمرے کا راستہ بھی نہیں ملے گا!" مبارکہ کہنے لگی۔

"ہاں چلو! سیر بھی ہو جائے گی۔"

سمیرا کہنے لگی اور وہ تینوں انہیں کمرے تک پہنچانے آئیں مگر اصرار کے باوجود دروازے ہی سے رُخصت ہو گئیں کمرے میں آتے ہی وفا کی طبیعت پھر مضمحل سی ہو گئی۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ وُہ گھر سے اتنی دور آئی تھی اگر آتے ہی طیّب سے ملاقات ہو جاتی تو شاید اُس کی طبیّت پر یہ اضمحلال کی کیفیت غلبہ نہ پاتی۔ وہ کمرے میں آتے ہی تھکی ہوئی سی پلنگ پر دراز ہو گئی۔ روشن کو اس کی کیفیت کا خوب اندازہ تھا۔

"سنتی ہو وفی! یہاں تو ہیرو بنے بیٹھے ہیں —— ؟ خبر نہیں ہم لوگ اسے یاد بھی ہیں یا نہیں؟ ایک ہم ہیں کہ سات سمندر پار کر کے ان کے پاس پہنچے ہیں!" روشن نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تنگ نہ کرو روشی! پہلے ہی طبیّت پریشان ہے!" وفا نے تنگ آکر کہا۔

"بس اب طبیّت درست ہوئی جاتی ہے۔ کلرک نے کہا۔ کہ پروفیسر کو کل کالج میں ضرور حاضر ہونا ہے۔ ابھی آتے ہی ہوں گے ——
اُہو! خوب یاد آیا! وفی! یہ ان لوگوں نے طیّب کا نام "سوکریٹیز" اِس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ وُہ چپ چاپ اور سنجیدہ رہتا ہے! طیّب بھیّا اور چپ چاپ اور سنجیدہ؟ حیرت انگیز بات ہے!"

روشن اُسے بہلانے کیلئے کہہ رہی تھی۔ مگر وہ خاموش رہی اُس کی طبیّت پر اضمحلال نے پوری طرح قابو پا لیا تھا۔ ماحول دھندلا اور غیر واضح

سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اور مستقبل پر کوئی امید افزا کرن ڈالنے کے ناقابل تھا۔ اتنے ہی میں کہ اُسے یہاں پہنچے ہوئے پورا دن گذر گیا اور طیّب اُسے نہ مل سکا، اس کے دل میں مایوسی نے غلبہ پالیا۔ وہ چاہتی تھی کہ روشن اسے مخاطب نہ کرے اور اُسے اپنے خیالوں سے اُلجھنے کے لیے خاموش چھوڑ دے اس وقت شام کے آٹھ بجے تھے۔ روشن نے سامان کھولا اور چیزوں کو ان کے موزوں مقام پر لگا کر کمرے کو آراستہ کرنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی عادت کے موافق بولتی جا رہی تھی مگر وفا آنکھیں بند کیے نیم خوابیدہ سی پڑی رہی۔ اُس نے کچھ نہ سُنا کہ روشن کیا کہہ رہی ہے۔ ہر چیز کو ٹھکانے لگا کر اُس نے اپنا اور وفا کا شب خوابی کا لباس نکالا، وہ دونوں رات کو ہلکے غرارہ نما پاجامے اور ان پر فراک نما چھوٹی قمیض پہنتی تھیں۔ عام مروجہ بد وضع اور نیم مردانہ لباس اُنہیں پسند نہ تھا۔ روشن کا لباس ہلکا زرد اور وفا کا آسمانی رنگ کی کریپ کا تھا۔ ساڑھے نو بجے تو روشن بھی طیّب کی آمد سے مایوس ہو گئی۔ اُس نے وفا کو بیدار کیا اور لباس بدل لینے کو کہا۔

”مجھے نہ چھیڑ روشی! اسی طرح سو رہنے دو!“ وہ خوابیدہ سی سست آواز میں بولی۔

”ہائے وفی! اسی طرح کیسے سو سکو گی۔ بے آرام ہو کر ناوقت جاگ جاؤ گی! اُٹھ جاؤ کپڑے بدل لو“ روشن نے اُس کے اوپر سے کمبل ہٹاتے ہوئے کہا۔

”پہلے تم بدل لو میں بعد میں بدل لوں گی“

اِس نے ٹالنے کو اتنا وقفہ بھی غنیمت جانا روشن نے اُسے پھر کمبل اوڑھا دیا اور خود کپڑے اُٹھا کر غسل خانہ میں چلی گئی۔ اُسے گئے ہوئے تین منٹ ہوئے ہونگے کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ وفا یک دم چونک

کر اُٹھ بیٹھی۔ اور لپک کر دروازہ پر پہنچی۔ لرزیدہ ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ باہر طیّب موجود تھا ——! لمبا کوٹ پہنے، فلیٹ ہاتھ میں لئے آنکھوں میں گہرا تجسّس بھرے اُس نے دروازہ کھلنے کا انتظار کیا اور جب دروازہ کھلا تو جیسے اُس کا دل اچھل کر گلے میں آگیا وہ حیرت استعجاب کا مجسّمہ بن گیا اُسے اِس منظر کے حقیقت ہونے میں شک تھا۔

”طیّب!“

وفا نے وفورِ شوق سے اُس کا ہاتھ تھام کر غور سے اُس کے حیرت زدہ اور زرد چہرے کی طرف دیکھا جو اس عرصہ میں کافی بدل گیا تھا۔

”وفی! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ خواب نہ ہو ——! میں نے ایسے ایسے خواب بار ہا نیند میں بھی دیکھے ہیں اور تصوّر میں بھی۔ مگر حقیقت نے ہر بار مجھے بُری طرح مایوس کیا!“

وہ وفا کے ہاتھ کو زور سے دبائے اور مضبوطی سے پکڑے ہوئے اندر داخل ہوا۔ وفا کے چہرے پر نویدِ صبح کی پُر نور شفق پھوٹ رہی تھی۔

”اچھی خود فریبی ہے! خواب کو حقیقت سمجھتے رہے، تو اَب حقیقت کو خواب ہی سمجھتے رہو گے؟“

”بیٹھو!“

اِس نے مسکرا کر کہا۔ اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ مگر طیّب نے بدستور کھڑے کھڑے اُس کا ہاتھ دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے غور سے اُس کی طرف دیکھا گذشتہ تین سال کے عرصہ میں وہ جیسے مسکرانا بھول چکا تھا اب بھی وہی سنگین سنجیدگی اُس کے

زرد چہرے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔

"مگر یہ معجزہ کیسے رونما ہوا ——؟ خالہ جان کو معلوم تھا کہ میں اِس جگہ ہوں انہوں نے کیسے تمہیں یہاں آنے کی اجازت دے دی؟" وہ وہی آزردگی آنکھوں میں بھرے پوچھ رہا تھا۔

"سب بتاؤں گی۔ تم بیٹھو تو سہی!"

اس نے خود اُسے کرسی پر آہستہ سے دھکیلتے ہوئے کہا۔ اور خود لپک کر غسلخانہ کے دروازہ پر پہنچی۔

"روشن ——! طیّب آگئے ہیں!"

اِس نے روشن کو اطلاع دی۔ تاکہ وہ لباس تبدیل نہ کرے۔ روشن پہلے ہی دستک کی آواز سُن چکی تھی اور دوبارہ ساڑھی پہننے میں مصروف ہوگئی۔

"اچھا؟ روشن بہن بھی آئی ہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں! میں اور روشن کے بغیر چلی آتی؟ یہ تو قدرت نے مہربانی کی۔ کہ تمہارے وہاں سے آتے ہی روشن واپس چلی آئی ورنہ آج تم مجھے زندہ نہ دیکھ سکتے اِس نے میرے رنج وغم میں اتنی سی کمی پوری کردی کہ میں اپنی زندگی کا یہ منحوس ترین دورِ جاروناچار گزارنے کیلئے قوّت برداشت پیدا کرسکی۔"

وفا کے لہجہ میں صاف گوئی نے حقیقت کی ناقابلِ انکار طاقت پیدا کردی تھی۔ طیّب کو اس کے ہر لفظ کا یقین تھا۔ اُس نے ایک بھرپور نگاہ وفا کے پُر وقار چہرے پر ڈالی۔

"میری اپنی وفا! تم واقعی اسم بامسمّی ہو!"

وہ اس کے سراپا کو پرستارانہ نظروں سے دیکھ کر اور لمبا سانس کھینچ کر کہنے لگا۔ اور اتنے ہی میں روشن برآمد ہوئی۔

"آخا! بھیّا آئے بیٹھے ہیں ——؟ بھئی آج واقعی کسی کا وہ کہنا سچ ثابت ہوگیا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے!" میں کہتے کہتے ہار

گی کہ وفی اُٹھو کپڑے تبدیل کر کے سو رہو، مگر نہیں! بظاہر مایوس تھی مگر دل ہی دل میں انتظار کیے جا رہی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ آپ آئیں گے اور اسی شام آئیں گے!"

روشن کی ان باتوں پر طیّب کے چہرے پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے اُٹھ کر روشن کو گلے سے لگا لیا۔

"میری اچھی بہن! خدا تمہیں زندگی کی ہر خوشی عطا کرے!" وہ گویا دل سے دعا دے رہا تھا۔

"فی الحال تو اسی خوشی کے عطا کرنے پر میں خدا کی شکر گذار ہوں، کہ اُس نے بچھڑوں کو ملا دیا!"

وہ ہنس کر طیّب اور وفا کی طرف چمکتی ہوئی شریر آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ اور دونوں قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

"مجھے حیرت ہے کہ خالہ جان نے آپ صاحبوں کو اس جگہ آنے کی اجازت کیسے دے دی؟ جہاں میرا سامنا ہونے کا صریحاً امکان تھا!" وہ بدستور حیرت سے کہہ رہا تھا۔

"طیّب! حقیقت یہ ہے کہ امّی تمہیں کبھی نہیں بھولیں ——— تمہارے اُس خط سے خدا جانے کیسی غلط فہمی میں پڑ گئیں وہ اس کی وضاحت کرنے پر نہ اُس وقت رضامند تھیں نہ اَب ہی آمادہ ہوئیں لیکن ان کے یہ لفظ ہیں کہ وہ اپنے انکار کے باوجود کسی معجزہ کی منتظر رہیں جو ان کی اس غلط فہمی کو رفع کر سکے۔" وفا نے حسبِ عادت اپنے سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو شروع کی۔

"پھر ——— طیّب کی نگاہوں میں جوشِ اشتیاق سے جیسے اُس کی ساری روح سمٹ آئی۔

"پھر وہ معجزہ رونما ہوا ——— مگر کیا؟ اس کا خالہ جان جواب

نہیں دیتیں۔ بہر حال اس کے نتیجہ پر وفا یہاں آپ کے پاس موجود ہے! روشن نے اپنے مقررہ انداز سے شرارت آمیز لہجہ میں کہا۔

"بخدا! ——— ؟"

طیب نے وفورِ مسرت سے بے خود ہو کر ایک ہاتھ میں روشن کا اور دوسرے میں وفا کا ہاتھ جھپٹ کر پکڑتے اور جوش سے ہلاتے ہوئے کہا۔ اُس کے زرد اور بے جان سے چہرے پر جیسے یک دم تازگی عود کر آئی آنکھوں سے، وہی پرانا تبسّم اُمنڈنے لگا یہ اُس شخص کا چہرہ ہی نہ تھا جس کے لئے ابھی چند منٹ پیشتر وفا نے دروازہ کھولا تھا۔ بلکہ یہ وہی طیّب تھا جو تین سال پیشتر مسکراتا ہوا اس کے کمرے سے رخصت ہوا تھا۔ اور وہ شام، وفا کے ذہن سے کبھی فراموش نہ ہو سکی تھی جب ان دونوں نے مل کر خواستگاری کا خط بیگم درّانی کو لکھنے کا مشورہ کیا تھا مگر وہ شام جسے وہ اپنی خوشیوں کو ہمیشگی بخشنے کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے ان کے لئے پیغامِ غم لے آئی تھی۔

"لیجئے! اب قانون کیا پڑھا کہ کوئی بات بھی بیان حلفی کے بغیر قابل یقین نہیں!"

روشن نے ہنس کر کہا تو اس پھبتی پر طیّب اور وفا قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

"ارے! یہ اس زور سے نہ ہنسیے گا ورنہ آپ اپنا شاندار خطاب کھو بیٹھیں گے "سوکرٹیز صاحب!"

روشن نے سنجیدہ ہو کر کہا تو اس پر طیّب اور بھی زور سے ہنسا۔

"اچھا تو یہاں پہنچتے ہی آپ کو میرے تمام القاب وخطابات معلوم ہو گئے ——— ؟ وہ ہنس کر پوچھنے لگا۔

"جی ہاں۔ یہاں پہنچ کر ہمارا سب سے پہلا کام ہی جو آپ کا کھوج لگانا تھا۔" روشن کہنے لگی۔

"ایک اور خطاب بھی تو ہے اُس کا تم نے ذکر ہی نہ کیا؟" وفا نے شرارت بھری نگاہ سے طیب کی طرف دیکھ کر روشن سے کہا۔

"اُس خطاب کا ذکر کرنا تمہارا حق ہے بھئی اسی لیے وہ میں نے تمہارے لیے چھوڑ دیا —— ! بھلا میں کون ہوں یہ پوچھنے والی کہ اگر ان کے قصّے کا یہاں کا دور یکسر بغیر ہیروئن کے تھا تو یہ ہیرو کس بنا پر کہلاتے رہے؟"

روشن نے نہ پوچھتے ہوئے بھی پوچھ ہی لیا۔ اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا۔

"ہنسی میں نہیں اڑائیے اب کہلوایا ہی جو سہی تو جواب دیجئے؟" روشن نے مسکرا کر طیب سے پوچھا۔

"اب میں کیا جواب دوں یہ خطاب دینے والوں ہی سے تحقیقات کیجئے ! اپنی تو بقول غالب اور مدّت سے یہ کیفیت تھی کہ زبانِ حال سے پکارتے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
آپ اپنی خبر نہیں آتی ۔

بخدا عرصہ جیسے خواب میں چلتے پھرتے بسر ہوا !"

اُس نے وفا کی طرف غائر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ اور ایک دفعہ پھر سنجیدہ ہو گیا۔

"چلئے اب تو خواب پریشاں ختم ہوا اور حقیقت کی دنیا میں آتے ہی اس کی نیک تعبیر ملی۔ مبارک ہو!" روشن ہنس کر کہنے لگی۔

”سلامت رہو! میری اچھی بہن! تم نے مجھے ہمیشہ عالم یاس میں اُمید کا راستہ دکھایا ہے۔!“

طیبّ شکر گذار نظروں سے روشن کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

اِس موقعہ پر وفا کی زبان پر یہ کلمہ آتے آتے رہ گیا کہ اِس ملاپ کا معجزہ بھی اسی روشن کی کرامات سے ظہور پذیر ہوا مگر بیگم درّانی نے اس سارے قصّہ کو جس کا تعلق بیچارے طیبّ کی پُر اسرار پیدائش تھا۔ نہایت تاکید کے ساتھ صیغۂ راز میں رکھنے کی ہدایت کی تھی —— ضروری تھا کہ اَب وہ ہمیشہ آپ کو وہی سمجھے جو لوگوں نے اپنی اپنی مقصد برداری کے واسطے اُسے بنا دیا تھا۔

”ہاں سچ! ہم اصل بات سے دُور نکل آئے —— مجھے پوری بات تو آپ لوگوں نے بتائی نہیں کہ وہ معجزہ کیا تھا اور آپ کا یہاں آنا کیونکر طے ہوا؟“

وہ پوچھنے لگا۔ اس بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے وہ بے حد بیقرار تھا۔

”یہ تو وفا نے آپ کو بتا ہی دیا۔ کہ خالہ جان اپنے سابقہ یا موجودہ طرزِ عمل کی وضاحت کرنے پر آمادہ نہیں۔ بہرکیف انہوں نے ایک شام مجھے بلا کر کہا کہ وفا کو اکسفورڈ بھیجنا چاہتی ہے۔ جہاں یہ لٹریچر کی کوئی امتیازی سند حاصل کر سکے —— میں خاموش رہی مگر حیرت کو اُنہوں نے میرے چہرے سے پڑھ لیا، اور کہنے لگیں —— ”مجھے معلوم ہے کہ طیبّ وہاں ایک سال اور کسی مزید امتحان کے واسطے ٹھہرا ہوا ہے اِسی لیے میں چاہتی ہوں۔ کہ وفا کو وہاں بھیج دوں۔ یقیناً اِن دونوں کے درمیان گزشتہ فرد گزاشت پر تلافی اور مفاہمت ہو جائے گی۔ پھر گھر واپس آنے پر ان کی شادی کر دُوں گی۔“ انہوں نے

میرے متعلق بھی ڈیڈی سے اپنے طور پر کہہ سُن کر وفا کے ہمراہ آنے کا فیصلہ کیا۔ پھر اپنی کوششوں سے چند ہی دنوں کے اندر اندر ہمارا پاسپورٹ بنوا کر سامان سفر درست کر دیا —— ہم اِس حیرت انگیز واقعہ کو معجزہ سے کم نہیں سمجھتے۔"

روشن نے مختصر لفظوں میں ساری روئیداد بیان کر دی اور طیّب کی تسلی ہو گئی۔ واقعہ کی تفصیل سے اُسے چنداں تعرض نہ تھا اُس کا مقصد پورا ہو گیا یہی کافی تھا۔

"بے شک —— ! بلکہ مجھے تو اَب تک بھی یہ کوئی خوشگوار خواب ہی محسوس ہو رہا ہے !" وُہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کہو طیّب! خدا نہ کرے کہ یہ خواب ہو —— ! ہمیں اپنے خالق کا شکر گزار ہونا چاہیئے جس نے ہمارے خوابوں کو تعبیر بخش دی۔ اور خدا کا شکر ہے یہ حقیقت ہے۔ !"

وفا نے بیحد متاثر ہو کر طیّب کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور التجا بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بس بھی وفی! میں اکتا چکی ہوں سنجیدہ ماحول سے! تین سال۔ شب و روز یہی کچھ دیکھتی رہی اب معافی دے دو مجھے اور اُس عادت کو بھول جاؤ۔!"

روشن نے وفا کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو وُہ ہنس پڑی۔

"سچ کہتی ہو۔ اب اِس عادت کو بھول جانا چاہیئے۔"

وفا نے روشن کی طرف محبت بھری نگاہ ڈال کر کہا۔ اور اپنی جگہ سے اُٹھی۔

"کہاں جاتی ہو؟" روشن نے پوچھا۔

"کافی بنا لاؤں!" وفا نے جواب دیا۔

"نہایت مستعد ہو ماشاء اللہ! بیٹھ جاؤں تکلیف نہ کرو میں بنالوں گی۔ ایسی کیا جلدی ہے ابھی تو طبیب بھیا بیٹھیں گے۔" روشن کہنے لگی۔

"یہاں کے بھی کچھ اصول ہیں میں ساڑھے دس بجے کے بعد نہ اپنے کمرے سے باہر رہ سکتا ہوں نہ آپ کے کمرے میں ——!" طبیب ہنس کر کہنے لگا۔

"اُوہو! دس تو بج چکے ۔!"

وفا گھڑی پر نگاہ پڑتے ہی چونکی اور سہمناک جیسی نظروں سے طبیب کی طرف دیکھنے لگی۔

"ارے! کیا ہو گیا وفی؟ تم تو یوں سہم گئیں جیسے —— جیسے" ابھی اُسے کوئی موزوں تشبیہ نہ سوجھ سکی تھی کہ وفا نے قطع کلام کر کے کہا۔

"چلو اَب جلدی سے کافی تو بنا لو!"

اِس نے گویا روشن سے بچنے کا حربہ ڈھونڈا۔ اور طبیب پھر ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے ابھی لو —— ! مگر میں تو سوچ رہی ہوں کہ وہ انعام حاصل کروں جو مبارکہ اور سبزہ بتا رہی تھیں کہ کسی نے اُس شخص کے لیے مقررہ کر رکھا ہے جو یہ بات ثابت کر دے کہ ان سو کر یٹیز صاحب کو کسی نے ہنستے دیکھا ہے۔ میں انعام کا دعوےٰ کروں گی اور تم گواہی دینا۔"

روشن خود بھی ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی اور پھر اُس میز کی طرف بڑھی جہاں برقی کیتلی اور چائے کافی وغیرہ کا سامان اُس نے ابھی

درست کر کے سجایا تھا۔

“اب یہ کون سے قصّہ کا حوالہ ہے؟”

طیّب پھر ہنس کر کہنے لگا۔ اِس پر وفا نے اُسے واقعہ سنایا کہ کس طرح مبارکہ اور سبزہ دو لڑکیاں اُن کی ملاقات کو آئیں اور اُن سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔

“خوب! ان لوگوں کو اتنی فرصت کہاں سے ملتی ہے کہ دوسروں کی حرکات و سکنات کو اِس باریکی کے ساتھ مشاہدہ کر سکتے ہیں؟” وہ کہہ رہا تھا۔

“اب آپ کو بھی ملا کرے گی! تسلّی رکھیے؟” روشن میز پر کافی کا سامان رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

“بہر حال سُنا ہے کہ لڑکیوں کو تم سے بے حد شکایت ہے کہ بے حد روکھے پھیکے آدمی ہو!” وفا نے چھیڑ کرتے ہوئے کہا۔

“اب نہ رہے گی! تسلّی رکھیے!”

طیّب نے روشن کے فقرے سے فقرہ ملایا اور تینوں ہنسنے لگے۔

“میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ سچ مچ ہی آدم بیزار بن گئے ہوں تو اب ہمارا کیا بنے گا؟” اُس نے کافی کی پیالی طیّب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

“سچ مچ کا کیا مطلب؟ تو کیا آپ سوچتی ہیں کہ اُن لوگوں نے آپ سے جھوٹ بولا؟” طیّب پوچھنے لگا۔

“اور نہیں تو کیا ——؟” وہ کہنے لگی۔

“ہوں ——!”

وہ دلچسپی سے سر ہلاتے ہوئے مسکراتا اور کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔

”خیر میری اس یکایک تبدیلی پر جس حیرت کا اظہار ہوگا وہ دلچسپ اور قابلِ دید ہوگی!“ اُس نے کچھ سوچتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”روشن کہہ رہی تھی کہ اتنی ڈھیر لڑکیوں کے تو ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ اگر اُنہوں نے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا تو؟“ وفا نے طیّب کو پھر چھیڑ کر کہا۔

”روشی میری بڑی پیاری بہن ہے اُسے خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا وہ محض نہیں ستانے کو یوں کہہ رہی تھی۔“

طیّب نے خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے پُر محبّت نگاہوں سے وفا کی طرف دیکھا۔ اِس کے بعد وہ روشن کے استفسار پر اپنے متعلق اُنہیں سب کچھ بتاتا رہا۔

لندن میں اس کے ماموں ہیں۔ ایک اِس کی امّی کے سگے بھائی ہیں وہ ایک مقامی ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں دوسرے ماموں اسکی امّی کے عم زاد اور دودھ بھائی ہیں وہ اختلاجِ قلب کے مریض ہیں اور کئی سال سے امراضِ قلب کے ماہرین کے زیرِ علاج ہیں۔ وہ ہر ہفتہ کی شام اُن کے پاس چلا جاتا۔ اور اتوار کا دِن وہیں گزار کر سوموار کو واپس چلا آتا ہے پچھلے دنوں بڑے ماموں بیمار ہو گئے اور چھٹی لے کر اُن کے پاس ٹھہرنا پڑا اپنا بیان ختم کرتے ہوئے بولا۔

”اِس ہفتہ کو میں جاؤں گا تو آپ دونوں بھی میرے ساتھ چلیے گا۔“ یہ کہتے کہتے اُس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور جانے کے واسطے اُٹھ کھڑا ہوا دس بج کر پچیس منٹ ہو چکے تھے۔

”اچھا خدا حافظ شب بخیر!“ اُس نے مسکرا کہا۔

”شب بخیر۔ فی امان اللہ!“ دونوں لڑکیوں نے جواب دیا۔ اور طیّب رخصت ہوا۔

(۲۶)

اور ہفتے کے دِن سہ پہر کو طیّب، وفا اور روشن لندن کے عظیم الشّان شہر میں ایک چھوٹے سے خوشنما بنگلے کے سامنے ٹیکسی سے اُترے۔ طیّب ان کو لئے ہوئے صدر دروازہ کی طرف بڑھا۔ روشن اور وفا دونوں نے بیک وقت باہر لگے ہوئے سائن بورڈ کی طرف دیکھا اور یک دم ٹھٹک کر حیرت سے ایک دوسری کی طرف دیکھنے لگیں۔ طیّب ان کی اس کیفیت پر حیران ہو کر ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا ———؟"

وہ پریشان لہجہ میں پوچھنے لگا وفا اور روشن دونوں کی حالت واقعی پریشان کن تھی ان کے چہروں کی رنگت سراسر سفید پڑ گئی۔

"یہ ——— یہ ———"

روشن کی آواز جیسے گلے کے اندر خشک ہو کر رہ گئی اُس نے صرف سائن بورڈ کی طرف اشارہ کیا طیّب نے اس کے اشارہ پر دیکھا۔

"ڈاکٹر جمیل احمد کنور"

"کیا یہ تمہارے ماموں ہیں؟" وفا نے اپنی حیرت پر قابو پا کر پوچھا۔

„ہاں ہاں ـــــ! مگر یہ آپ لوگوں کو کیا ہوا؟ کیا آپ انہیں جانتی ہیں؟" وہ پوچھنے لگا؟"

„نام سُنا ہوا ہے۔ یک دم جو شناسا جیسا نام نگاہ کے سامنے آیا ہمیں حیرت ہوئی۔"

وفا نے بات بنائی۔ طیّب ہنسنے لگا۔

„تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ میں سمجھا کہیں تمہیں بھوت نظر آ گیا ہے!"

اُس نے کہا اور دونوں لڑکیوں کو لیے ہوئے آگے بڑھا۔ وفا اور روشن اب تک بھی ایک دوسری کی طرف حیرت اور استفسار سے دیکھ رہی تھیں۔

„یہ ڈاکٹر صاحب تمہارے حقیقی ماموں ہوتے ہیں؟" وفا پوچھنے لگی۔

„ہاں ـــــ میں نے اس شام تمہیں بتایا نہ تھا؟ خیر نہیں تم لوگ اِس قدر حیران کیوں ہو رہے ہیں؟ کس سلسلہ میں تم نے اِن کا نام سُنا ہوا ہے؟ یقیناً اِن کے کسی رومان کے سلسلہ میں؟"

وہ ہنس کر پوچھنے لگا تو ان لڑکیوں کو عذر کے لئے جیسے سہارا مل گیا ورنہ تو وہ اپنے اظہارِ حیرت پر متاسف ہو رہی تھیں۔

„بالکل ـــــ!" روشن نے اب تو ہنس کر کہا۔

„کچھ واضح بات معلوم ہوتی؟ یعنی پورا قصہ معلوم ہو سکا؟" اُس نے سادگی سے پوچھا۔

„پوری تفصیل تو معلوم نہیں ہوئی نہ ہی ہمیں اُس وقت یہ جاننے کی کچھ ایسی ضرورت ہی محسوس ہوئی ہمیں کیا معلوم تھا۔ کہ اِس قصہ کے ہیرو خود ہمارے ہیرو کے ماموں ہیں!"

روشن نے بات کو مزاح کا رنگ دے دیا اور راستے ہی میں وہ طویل ڈرائیو طے کر کے بنگلہ کے ”پورٹیکو“ میں پہنچ گئے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔ اب اُن کی صورت دیکھ کر پھر حیرت کا اظہار نہ کرنا۔“ طیّب نے ہنس کر کہا۔

”صورت سے نہیں، ہم تو صرف اس کے نام سے واقف تھے تم نے اُسی دن نام بتا دیا ہوتا تو ہم اپنی حیرت پر قابو پا چکے ہوتے۔“

وفا کہنے لگی اور وہ دونوں حمیدہ کے پیچھے پیچھے ایک وسیع اور آراستہ حال میں داخل ہوئیں جو بجائے خود ایک طویل و عریض ڈرائینگ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے انتہائی سرے پر پرانی ساخت کا اُونچا آتشدان تھا جس کے نیچے کوئلے دہک رہے تھے اور اندر خوشگوار حرارت پھیلی ہوئی تھی۔ آتشدان کے قریب ایک نیچی نشست کی کرسی پر ایک خوش وضع اور خوش پوش معمر شخص نیم دراز تھا۔ کرسی کے عقب میں ایک اونچا برقی لیمپ روشن تھا جس کی تیز روشنی میں وہ مطالعہ میں مصروف تھا۔

”السلام علیکم انکل!“ طیّب نے سلام کیا۔

”علیکم السلام! آؤ طیّب بیٹھو!“

اس نے کتاب پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر خواہرزادے کے سلام کا جواب پر شفقت لہجہ میں دیا طیّب کچھ سٹپٹایا کہ ان لڑکیوں کا تعارف کن لفظوں میں کرائے۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ وہ اپنے ساتھ لڑکیوں کو لیے ہوئے آیا ورنہ اس کے متعلق یہ افواہ کہ وہ صنف نازک سے کتراتا ہے اتنی مشہور تھی کہ اس کے ماموں تک بھی پہنچ چکی تھی اور وہ اس وجہ سے طیّب کو اور بھی چاہنے لگ گیا تھا کیونکہ وہ خود فرقۂ اناث کو ”خطرناک صنف“ کے نام سے پکارتا تھا۔

"ہوں ——؟ تم کھڑے کیوں ہو بیٹھو!"

ڈاکٹر نے آخر محسوس کرتے ہوئے کہ طیب بدستور وہیں کھڑا ہے کتاب پر سے نگاہ اُٹھاکر اوپر دیکھا۔

"اُہو! تمہارے ساتھ —— کوئی مہمان خواتین ہیں؟" اُس نے تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں یہ میری کلاس فیلو رہ چکی ہیں! اسی ہفتے پاکستان سے آکر آکسفورڈ میں داخلہ لیا ہے۔

طیب نے تعارف کرایا تو دونوں لڑکیوں نے آداب کہا۔

"آیئے —— !خوش آمدید! تشریف رکھیئے"

اُس سنہری فریم کی عینک کے پیچھے سے نوواردوں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا اور وہ تینوں آگے بڑھ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"ماموں بشیر اب کیسے ہیں؟ آگئے یا ابھی ہسپتال ہی میں ہیں؟"

طیب نے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں ——! مگر ہسپتال ہی میں ہیں اس مرتبہ میں انہیں کافی دنوں تک وہیں رکھنا چاہتا ہوں" وہ کہہ رہا تھا۔

"کیوں طیب نے پوچھا۔

"اس لئے کہ وہ گھر آتے ہی اپنے آپ کو بالکل تندرست ثابت کر دیتے ہیں۔ اور بھول ہی جاتے ہیں کہ وہ ایک مستقل عارضہ اپنے اندر لیے پھرتے ہیں۔ جو مسلسل علاج اور پرہیز چاہتا ہے۔ ہسپتال کی حدود تک خوب پابندی رکھتے ہیں مگر گھر پہنچے نہیں کہ بس وہی زعم! کہ بس جی تندرست ہو گئے۔ اسی وجہ سے اس مرتبہ وہ ہسپتال ہی میں مقیم رہیں گے"

ڈاکٹر جمیل کہہ رہا تھا اور طیّب کے علاوہ دونوں لڑکیاں بڑے غور سے اُس کی باتیں سُن رہی تھیں۔ اور ساتھ ساتھ اُس کے چہرے کا بغور مطالعہ کر رہی تھیں۔ اِس عمر میں بھی وہ خاصی پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ سَر کے بال کھچڑی تھے مگر سُرخ و سفید چہرے پر جوانی کی رعنائیاں ابھی تک باقی تھیں۔ صحت مند اور توانا جسم پر بھی عمر نے تصرف نہ کیا تھا غور سے دیکھا جائے تو اُن پختہ خدوخال میں طیّب کے نقش و نگار کی جھلک نظر آتی تھی وہی پیشانی وہی آنکھیں ناک کی ساخت میں تھوڑا فرق تھا۔ ہونٹ اور دانت بالکل مشابہ تھے ___ بے خبر نہیں اِس مشابہت پر کبھی خود طیّب نے غور کیا تھا یا نہیں؟

„آپ اِس وقت ہسپتال جائیں گے؟“ طیّب نے پوچھا۔

„ہاں کھانے کے بعد میں راؤنڈ کے واسطے جاؤں گا“ ڈاکٹر جمیل نے بتایا۔

„ہم لوگ ابھی آپ کے ساتھ چلیں گے ماموں جان کو دیکھنے کے لئے“ طیّب نے کہا۔

„ضرور چلو ___ اگر تمہاری مہمان بیبیاں یہیں ٹھہریں گی تو مسز گریہم کو ان کے واسطے کمرے درست کرنے کا حکم دے دو“ ڈاکٹر جمیل کہنے لگا۔

„جی ہاں میں ابھی جا کر کہے دیتا ہوں ___ الگ الگ کمرے میں سوئیں گی یا ایک ہی خواب گاہ میں دو بستر لگوا دیئے جائیں!“ اُس نے آخری فقرہ اپنی عزیز مہمانوں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔

„ایک ہی کمرہ ٹھیک ہے“ روشن نے جواب دیا۔

”تو اِس صورت میں مسز گرِیہم ڈبل بیڈ والی بڑی خوابگاہ درست کرا دے گی۔“ ڈاکٹر جمیل نے اپنی سنہری فریم والی عینک میں سے طیّب کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جی بہت بہتر۔“ -

کہتے ہوئے طیّب ایک پہلو کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر دونوں لڑکیوں سے اِن کے سفر کے متعلق اور پھر اِن کے تعلیمی مقاصد کے متعلق سوالات کرتا۔ وہ ان کی گفتگو اور اخلاق سے کافی متاثر نظر آنے لگا۔ حتیٰ کہ کھانے کی میز پر وہ خوش اور مطمئن تھا۔ اور غیر معمولی دلچسپی سے باتیں کر رہا تھا۔ خود روشن اور وفا بھی بے حد دلچسپی سے حصّہ لے رہی تھیں، انہیں دل ہی دل میں اس شخص سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی جو ایک بے وفا عورت کی وجہ سے دِل شکستہ ہو کر ساری عمر جلاوطنی میں گذار چکا تھا۔ وہ اس ملک کی مسموم فضا میں سانس تک لینا حرام سمجھتا تھا جہاں وہ اخلاقِ باختہ عورت رہتی تھی۔ اُسے آج تک معلوم نہ ہو سکا تھا کہ ایک عرصہ دراز خود وہ بھی ترک وطن کر کے اس ملک میں آ رہی تھی جہاں اس نے پناہ لے رکھی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد یہ سب لوگ ہسپتال جانے کے واسطے نکلنے ہی والے تھے کہ ٹیلیفوں کی گھنٹی بجی ڈاکٹر نے طیّب کو اشارہ کیا چند منٹ کے بعد وہ قدم بر داشتہ واپس آیا یہ تینوں اُس کے انتظار میں ہال کے بیرونی دروازہ پر کھڑے تھے باغ میں نیلی روشنی سے عجب سماں نظر آتا تھا اور ڈاکٹر جمیل انہیں بتا رہا تھا۔ کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں باغ میں مصروف رہتا ہے اُس نے بعض ایسے پودے اپنے باغ میں پرورش کیے ہیں جن کے لیئے یہ آب و ہوا سازگار

نہیں لیکن مصنوعی ذرائع سے ان کے لئے اُن کے وطن کی آب و ہوا پیدا کی جاتی ہے۔ دونوں لڑکیاں یہ سُن کر حیران ہو رہی تھیں اور ڈاکٹر ان کی حیرت پر خوش ہو کر ہنس رہا تھا طیّب نے اطلاع دی۔

"انکل! کوئی کیس آیا ہے۔ آپ کے اسسٹنٹ ڈاکٹر وکٹر کہہ رہے تھے۔ فوری آپریشن کا کیس ہے اور آپ کو جلد پہنچنے کے لئے کہا ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ بس آ رہے ہیں!"

"اچھا کیا ——!"

وہ ڈاکٹر قدم بر داشتہ کار کی طرف بڑھا نوکر نے جو سفید وردی پہنے سرخ پیٹی باندھے مستعد کھڑا تھا آگے بڑھ کر وفا کے واسطے دروازہ کھولا۔ طیّب نے دونوں لڑکیوں کو عقبی نشست پر بٹھایا اور خود ڈاکٹر کے پہلو میں بیٹھ گیا اور کار گیٹ سے نکل کھلی جگہ فراٹے بھرنے لگی۔ راستہ میں سب خاموش بیٹھے رہے۔ روانگی کے وقت ایسا سنجیدہ پیغام پاکر سب کے ذہن متاثر ہو گئے تھے، پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ ہسپتال کی عظیم الشان عمارت میں داخل ہوئے ڈاکٹر نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ چند نرسیں اور ڈاکٹر اسے حال کے دروازے پر آملے اور کیس کے متعلق بتانے لگے۔

"مریضہ کوئی پاکستانی عورت ہے سینہ کے شدید سرطان میں مبتلا ہے۔"

ڈاکٹر وکٹر نے بتایا۔ ڈاکٹر جمیل نے طیّب کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ لڑکیوں کو ماموں بشیر کے کمرہ میں لے جائے وہ تو خود آپریشن سے ہو کر ہی آئے گا۔ اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ڈاکٹروں اور نرسوں کو جلو میں لیے معائنہ کے کمرے میں چلا گیا طیّب کے ذہن پر ہسپتال کی فضا ہمیشہ آزردگی طاری کر دیتی تھی مگر اس وقت کیفیت تو کچھ بہت

ہی شدید تھی وہ مضمحل اور خاموش تھا ۔ دونوں لڑکیوں کو لیے ہوئے بشیر کے کمرے میں آیا ۔ وہ ہیٹر کے قریب آرام کرسی پر دراز تھا زانو پر ایک گداز اور بیش قیمت کمبل ڈال رکھا تھا اور ایک نوعمر انگریز لڑکی سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی اُسے کچھ پڑھ کر سنا رہی تھی ان لوگوں کے داخل ہونے پر وہ مسکراتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ بشیر نے بھی آنکھیں کھول دیں ۔ اور حیرت سے نوارد اجنبی لڑکیوں کی طرف اور استفسار کی نظروں سے طبیب کی طرف دیکھنے لگا ۔ تینوں نے سلام کیا ۔ طبیب نے حال پوچھا پھر تعارف کرایا ۔ بشیر نے انگریز لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے کہا ۔

” یہ مس ایوا ڈارٹن ہیں ان کے والد ملٹری آفیسر ہیں ۔ یہ اپنا شام کا خالی وقت مریض کی دلجوئی میں صرف کرتی ہیں ۔ بڑی ہی پیاری اور خلیق دوشیزہ ہیں ۔ مریضوں کے لیے پھول اور کتابیں لاتی ہیں ۔ جو خود نہیں پڑھ سکتے انہیں پڑھ کر سناتی ہیں ۔ ہر شام نصف گھنٹہ میرے پاس گذارتی اور بڑے اعلیٰ مضامین منتخب کر کے مجھے سناتی ہیں ۔ “

اور اپنی تعریف سُن کر ایوا ڈارٹن شرم سے لال گوں ہوگئی ۔

” ڈاکٹر خود نہایت اچھے اور شفیق بزرگ ہیں کہ کسی کی معمولی سی خدمت کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں ——— اچھا اب میں چلتی ہوں “ اُس نے ہنس کر جواب دیا اور سب کے ساتھ ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی ۔

” ہمارا ملک بھی نام خدا ترقی کی منزلیں بہت تیزی سے طے کر رہا ہے ۔ ایک ہی جست میں وہ تہذیب و تمدن علم و ثقافت کے تمام مراحل طے کر کے ترقی یافتہ مغربی ممالک کے دوش بدوش آ پہنچا ہے ۔ عورتیں

ہر دوڑ میں مردوں کے پہلو بہ پہلو ہیں ——— مگر اُس دوڑ میں ہمارے ہاں کی دوشیزائیں خبر نہیں اِس قسم کے اخلاقی اور انسانی نکات کو نظر انداز کیوں کر جاتی ہیں ——— ؟ کیا آپ کے معاشرہ میں مہذب خواتین نے انسانی ہمدردی کے اس پہلو پر کبھی غور کیا ؟ اپنے خالی وقت کے لیے ایسی معصوم اور پاکیزہ مصروفیات تلاش کی ہیں ؟"

طیّب کے بوڑھے ماموں نے دونوں لڑکیوں سے نہایت شفقت بھرے اور نرم لہجہ میں یہ نازک سوالات کیے ۔ کہ ان کی گردنیں شرم سے جھک گئیں

"محترم بزرگ ! اگر ایسی کوئی مثال ہمارے ملک میں ہے بھی تو ہمارے علم سے بالاتر ہے ۔ ہم نے اپنے ہاں کوئی ایسی لڑکی نہیں دیکھی جس کی یہ مصروفیت ہو ۔"

وفا نے جھکی جھکی شرمیلی نگاہوں سے جواب دیا ۔ وہ دل ہی دل میں تمنا کر رہی تھی ۔ کہ کاش وہ اِس وقت نہایت دلیری اور فخر کے ساتھ جواب دے سکتی کہ ہاں ہمارے ملک میں بھی ایسی صاحب ایثار دوشیزاؤں کی کمی نہیں ۔ جو حسبۃً اللہ دکھی انسانیت کے واسطے خوشی اور سکون کے لمحات پیدا کر سکتی ہوں ۔

"ہم یہاں سے جو بھی قابلِ تقلید باتیں سیکھیں گے اُن میں ایک یہ بھی ہو گی !" روشن نے فوراً کہا ۔

"اور کبھی یہی باتیں ان لوگوں نے آپ کے اسلاف سے سیکھی تھیں آج یہ ملک جو مرجعِ خلائق اور مبتدائے فیض بنے ہوئے ہیں کبھی بغداد اور قرطبہ گشت زارِ علوم کے خوشہ چین تھے ۔ آج اخلاقی رواداری انسانی ہمدردی اور باہمی مروّت کے جو نکات ان تہذیب کے علمبرداروں اور انسانیت کے دردمندوں نے اپنا رکھے ہیں یہ ہماری شریعت کا جزو ہیں ہمارے

ایمان کی کسوٹی اور ہمارے دین کے اصول ہیں۔ مگر بقول حالی ؎

شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے
وہ لے جا کے سب اہلِ مغرب نے جوڑے

اور آج وہ وقت ہے کہ ہمارے لیے وہ اخلاقی قدریں یوں اجنبی اور انجانی ہو چکی ہیں جیسے ہم کبھی ان سے آشنا ہی نہ تھے اور ہم۔ اپنی ہی بخشی ہوئی صلاحیتوں کے لیے دریوزہ گری کرنے ان کے ملک میں آتے ہیں ——— !"

طیّب غور سے اپنے ضعیف ماموں کی باتیں سُن رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ کہ ضعیفی اور علالت نے اس کی عادات کو کتنا بدل دیا ہے۔ وہ ہمیشہ ہنسنے اور ہنسانے والا شخص، جس نے کبھی زندگی کے ان سنجیدہ پہلوؤں پر غور نہ کیا تھا اب مفکروں اور مصلحوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ ہر بات اور ہر چیز کا حسین اور پُر اُمید پہلو دیکھا تھا۔ قبح اور یاس اُس کے نکتہ نظر میں کبھی آئی ہی نہ تھی۔ مگر اب وہ سوچ اور فکر کا عادی ہو گیا تھا ——— غور و فکر سے ہمیشہ انسان پر حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور انکشافِ حقیقت اس پر یاس گیں افسردگی طاری کر دیتا ہے۔ بشیر نے ابھی اپنی بات ختم نہ کی تھی۔ کہ ڈاکٹر جمیل کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کی عجب کیفیت تھی، رنگت زرد تھی نگاہوں سے غم و غصہ کی جھلک ظاہر تھی۔ طیّب نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"اپریشن ہو گیا انکل؟" وہ پوچھنے لگا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے بھائی جان؟" اس نے طیّب کے سوال کو نظر انداز کر کے بشیر سے حال پوچھا۔

"میں اب تو بالکل ٹھیک ہوں ——— صرف تنہائی میرے لئے تکلیف دہ ہے بس گھر لے چلو تو کوئی شکایت باقی نہیں رہتی!"

جمیل نے ان کی بات کا کچھ جواب نہ دیا اور باہر نکل گیا۔ صریحاً اس کا ذہن مضطرب تھا۔

"اپریشن کیسا پوچھ رہے تھے تم؟" بشیر نے طیب سے پوچھا۔

"ہم لوگ آ رہے تھے کہ ٹیلیفون آیا۔ کوئی فوری اپریشن کا کیس آیا ہے۔ یہاں پہنچے تو انکل کے اسسٹنٹ دروازے پر موجود تھے انہوں نے بتایا۔ کہ کوئی پاکستانی عورت ہے جو کینسر کی مریضہ ہے انکل ہمیں آپ کے پاس بھیج کر خود اسی کے معائنہ کے واسطے گئے تھے مگر ظاہر ہے کہ اتنی جلدی اپریشن سے فارغ ہو نہیں سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی نہایت نازک کیس ہے۔ اسی لیے انکل پریشان ہیں" طیب نے قیاس دوڑایا۔

"اپریشن گو کیسا ہی نازک کیوں نہ ہو اپنے جمیل کے سامنے کیا حقیقت رکھتا ہے دل سے زیادہ نازک کونسا اپریشن ہو سکتا ہے اس نے یوں چٹکی بجاتے میں ایسے ایسے اپریشن کیے ہیں۔ کہ ڈاکٹروں کو حیرت میں ڈال دیا ہے!"

بشیر نے چٹکی بجا کر اپریشن کے قلیل ترین وقفہ کا اظہار کیا۔ اتنے ہی میں نرس اسے دوائی دینے کے واسطے کمرے میں آئی۔

"ڈاکٹر جمیل کہاں گئے ہیں؟" بشیر نے پوچھا۔

"راؤنڈ لینے گئے ہیں صاحب!" نرس نے جواب دیا۔

"تو اس کینسر والی عورت کے اپریشن کیا ہوا؟"

بشیر نے پھر پوچھا تو نرس الماری سے اس کی دوائی کی شیشی نکالتے ہوئے متوجہ ہو کر بشیر کی طرف دیکھنے لگی۔

"خدا جانے ——— کس وجہ سے ڈاکٹر نے اس کا اپریشن کرنے سے انکار کر دیا"

اس نے مختصر سا جواب دیا مگر اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے کچھ زیادہ ہی بتا سکتی ہے لیکن نہیں بتانا چاہتی۔

"انکار کر دیا؟ وہ کیوں۔؟"

بشیر نے پوچھا اور کمرے میں موجود دونوں لڑکیاں اور طیب بھی استعجاب کی نظروں سے نرس کی طرف دیکھنے لگی

"خبر نہیں صاحب ——— ایں ڈاکٹر کے ساتھ معائنہ کے کمرہ میں نہیں گئی۔"

اُس نے پانی کا گلاس اور دوائی کی ٹکیہ مریض کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کون نرس ساتھ تھی؟"

بشیر نے ٹکیہ اور گلاس لیتے ہوئے پوچھا اور دوائی کھانے کے ہنگام میں سوالیہ نظریں بدستور نرس کے چہرے پر رہیں۔

"سسٹر عاریا اور نرس جارمرنا ساتھ گئی تھیں۔ اوہ یاد تھا تو وہاں ضرور موجود ہو گی کیونکہ معائنہ کے کمرہ کی وہ انچارج ہے" وہ بتا رہی تھی۔

"آپ مہربانی سے ان تینوں میں سے کسی کو یہاں بھیج دیں گی؟ میں دریافت تو کروں۔ کہ ایسا کونسا سبب ہے کہ ڈاکٹر جمیل نے اپریشن سے انکار کر دیا وہ تو برف باری کی راتوں میں بستر سے اُٹھ کر مریض کی مدد کو پہنچتا رہا ہے میرے اپنے مشاہدہ کے واقعات ہیں" بشیر نے کہا۔

"بہتر صاحب!"

نرس جاتے ہوئے کہنے لگی ڈاکٹر جمیل کی وجہ سے ہسپتال کا سارا اسٹاف اُن کے بڑے بھائی کی بے حد عزت کرتا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر

جمیل ہر کہہ و ماہ کے مہربان اور ہر دلعزیز تھے۔

”حیرت کی بات ہے۔ کہ جمیل نے اپریشن سے انکار کر دیا —— ؟ اور وہ کچھ پریشان ہے —— آخر بات کیا ہو سکتی ہے؟“

بشیر زیر لب جیسے خود اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ اتنے ہی میں سٹاف نرس ماریا کمرے میں داخل ہوئی۔

”آپ نے مجھے بلایا تھا انکل؟“

وہ پوچھنے لگی۔ اور بشیر نے پہلے شفقت سے اُس کی خیر و عافیت پوچھی پھر اُس سے بھی حسب سابق استفسار کیا۔ کہ کیا واقعہ پیش آیا ماریہ مسکرانے لگی۔ اور پھر بشیر کے قریب جھک کر سرگوشی میں بولی۔

”خبر نہیں انکل! ڈاکٹر یقیناً اُسے پہچانتے ہیں اور ڈاکٹر وکٹر کے ساتھ معائنہ کے واسطے اچھے خاصے درست موڈ میں گئے لیکن۔ جیسے ہی اُنہوں نے مریضہ کو ایک نظر دیکھا وہ دم بخود سے رہ گئے ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا پھر وہ یک دم کمرے سے باہر نکل آئے اور ڈاکٹر وکٹر سے کہا کہ میں اس مریضہ کا آپریشن نہیں کروں گا۔ اب یہ کس کی جرأت ہو سکتی ہے۔ کہ اُن سے سوال و جواب کرے۔ اب ڈاکٹر وکٹر، دوسرے سرجن روچیٹر کو جو اس وقت چھٹی پر ہیں بُلانے لگے ہیں۔“

”سُنا ہے یہ کوئی پاکستانی عورت ہے؟“ بشیر نے پوچھا۔

”جی ہاں اسی پر تو یہ احتمال ہے کہ ڈاکٹر اُسے پہلے سے جانتے ہوں گے۔“ سسٹر ماریہ مسکرا کر کہنے لگی۔

”کچھ معلوم ہے یہ عورت یہاں کیسے آئی اس کے ساتھ کون ہے؟“

”یہ تو یہیں کی رہائش اختیار کر چکی ہے۔ کوئی بیس سال ہوئے اسے اپنے وطن سے آئے ہوئے۔ شہر کے فیشن ایبل حصہ میں اس کا

ذاتی مکان تھا کئی سال سے اُس نے ایک بیوٹی کلینک کھول رکھا تھا جہاں تقریباً آدھے شہر کی عورتیں آرائش کے لئے مشورہ لینے جاتی تھیں ——— شاید آپ نے روزناموں میں کبھی اشتہار دیکھا ہوگا ''انجمن بیوٹی کلینک'' اب بھی مشہور سنگھار مرکز ہے۔ مارتھا اِسے پہچانتی ہے' وہ بتا رہی تھی۔ کہ یہ مسز ''جوفرے'' کہلاتی ہے۔

''تو کیا اس نے یہاں کسی انگریز ''جوفرے'' نامی سے شادی کر لی تھی؟'' بشیر نے پوچھا۔

''جی نہیں اِس کا شوہر پاکستانی مسلمان تھا خود بھی مسلمان عورت ہے ———''

سسٹر ماریا بتا رہی تھی۔ کہ اتنے ہی میں مارتھا اسے ڈھونڈتی ہوئی اِس طرف آئی۔

''یہ مارتھا اس کے متعلق اچھی طرح جانتی ہے'' ماریہ نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

''سسٹر آپ یہاں کھڑی ہیں میں آپ کو ڈھونڈتی پھری۔ آپ کو ڈاکٹر وکٹر بلا رہے ہیں'' مارتھا کہنے لگی۔

''انہیں میں نے بلایا تھا'' بشیر نے کہا۔

سسٹر ماریہ نے مارتھا کی طرف اشارہ کیا کہ اِس سے پوچھیے۔

''مس مارتھا! سُنا ہے آپ اس کینسر کی مریضہ کے متعلق کچھ واقفیت رکھتی ہیں۔ کون ہے یہ کچھ اس کے حالات معلوم ہیں آپ کو؟''

بشیر نے جس وقت سے یہ سُنا تھا۔ کہ جمیل نے اس کو پہچان کر اُس کا اپریشن کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اُسے خواہ مخواہ تجسس پیدا

ہو گیا تھا وہ کرید کرید کر اِس کے حالات پوچھ رہا تھا۔ کیونکہ جمیل کے ترکِ وطن کے ابتدائی زمانہ میں کچھ ایسی افواہ اِس کے سننے میں آئی تھی کہ اُس نے کسی لڑکی کی بے وفائی سے متاثر ہو کر وطن چھوڑ دیا ہے۔

"انکل! یہ "انجمن بیوٹی کلینک" کی مالکہ اور منتظمہ ہیں۔ جب میری ممّی نے اِن کے کلینک میں ملازمت کی تو ان کے شوہر مسٹر جوفری

"یہ لفظ اغلباً جعفری ہو گا؟" بشیر نے طیّب کی طرف روئے سخن کر کے مارتھا کی تصحیح کی۔

"بہرحال سب انہیں اِس نام سے پکارتے تھے۔ میری ممّی کہتی تھیں کہ۔ دونوں میاں بیوی کے تعلقات کچھ اچھے نہیں تھے وہ اکثر آپس میں لڑتے تو شوہر اَسے طعنے دیا کرتا کہ جیسے اِس نے پہلے شوہروں کی طلاق لے لی ویسے ہی وہ اسے بھی مجبور کر رہی ہے کہ وہ اُسے چھوڑ دے۔ اور آخر وہ بھی اسے طلاق دے کر وطن واپس چلا گیا۔ اس وقت یہ آزاد زندگی گزار رہی ہے ——— لیکن کوئی نیک نام عورت نہیں ہے۔ جب سے بیمار رہنے لگی ہے اِس نے اپنی املاک بیچ کر وطن واپس جانے کا قصد کر لیا مگر اچانک زیادہ بیمار ہو گئی تو اسے ایک ہمسائی مسز ہربرٹ ہسپتال لے آئی۔ مارتھا نے جلدی اپنا بیان ختم کیا اور زیادہ نہ ٹھہرنے کی معذرت کرتی ہوئی تیز تیز قدم اُٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ ماریا اور مارتھا کی گفتگو کے درمیان وفا اور روشن اکثر غیر اختیاری طور پر چونک کر ایک دوسری کیطرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگیں اور ان کی اس کیفیت کو بشیر نے دو تین مرتبہ لغور دیکھا اُسے اپنے دل میں یقین ہو گیا۔ کہ یہ لڑکیاں اِس قصّہ کا کچھ نہ کچھ علم رکھتی ہیں۔

"اِن سارے بیانات سے اس امر پر تو روشنی نہ پڑ سکی کہ آخر جمیل اِسے کیسے جانتا ہے؟" بشیر نے اِن تینوں کی طرف مخاطب

ہو کر پوچھا۔

"خدا جانے!"

طیّب نے تذبذب کے انداز سے سر ہلا کر جیسے صرف اس لیے کہہ دیا۔ کہ گویا کچھ نہ کچھ جواب دینا لازمی تھا اور وفا نے اُن کے چہرے کو عجیب ہمدردانہ نگاہ سے دیکھ کر پھر اپنی سہیلی کی طرف دیکھا اور طویل سانس کھینچ کر چُپ ہو گئیں۔ بشیر کی جہاں دیدہ نگاہوں سے یہ نگاہ بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ "وفا اور روشن بہت کچھ جانتی ہیں۔"

بوڑھے آدمی نے اپنے دل میں خوب اچھی طرح یقین کر لیا۔ اور اس کا دل اس راز کو کریدنے کے لیے بیتاب ہو گیا۔

"طیّب! جانا ذرا جمیل کو تو بلا لانا" وہ کہنے لگا۔

"ماموں جان! میں ضرور انہیں بلا لاؤں گا میرا اپنا مشورہ ہے کہ فی الحال اِن سے کچھ نہ پوچھئے گا وہ صریحاً ذہنی طور پر بے چین اور مضطرب ہیں۔"

طیّب نے بے حد سنجیدہ اور اُداس لہجہ میں کہا جیسے اُسے بھی اپنے اپنے ماموں اور اس عورت کے کسی رازدارانہ تعلق کا یقین ہو چکا ہو۔ اور وہ ناکامیٔ محبّت کی جانکاہ اور روح سوز عقوبت سے بے خبر نہ تھا۔ گزشتہ تین سال وہ اِسی بھٹی میں پھنکتا رہا تھا۔ اور اس وقت اُسے اپنے ماموں کی حالت کا اندازہ کر کے اس پر رحم آ رہا تھا جس نے ساری عمر اِس آگ میں جلتے گزار دی تھی۔

"خیر میں کچھ نہ پوچھوں گا تم بلاؤ تو سہی۔ میں اُسے صرف بات پر آمادہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ مجھے گھر لے چلے۔" بشیر نے کہا تو طیّب بادلِ نخواستہ اُٹھ کر کمرے سے نکلا۔

بشیر اس قدر بے صبر ہو رہا تھا۔ کہ اِس کے باہر قدم رکھتے ہی وفا اور

روشن کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"مجھے میرے تجربہ نے بتایا ہے کہ اس عجیب و غریب مخمصہ کو اگر کوئی حل کر سکتا ہے تو وہ آپ ہیں!" اس نے بغور دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی کون! آپ ہمیں کہہ رہے ہیں؟"

وفا نے کچھ گھبرا کر سوال کیا۔ روشن نے نیم رُخ ہو کر وفا کے کندھے کی آڑ لیتے ہوئے اس کے کان میں کہا۔

"میرا خیال ہے انہیں بتا دیا جائے، آخر چھپانے کا فائدہ بھی کیا؟"

"ہاں بیٹی! تمہیں سے کہہ رہا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس قصّہ کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو تم جوڑ سکتی ہو ——؟"

بشیر نے پورے یقین سے کہا اور اس کی پر شفقت سی نگاہیں ان دونوں کو اپنے دل تک اُترتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"بزرگوارم! آپ پہلے وعدہ کریں کہ جو کچھ ہم سے کہیں وہ آپ طبیب بھیا سے کبھی، کسی وقت بھی نہ کہیے گا!" روشن نے اپنی کرسی بشیر کی نشست کے قریب سرکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں! میں وعدہ کرتا ہوں —— تمہیں کیا معلوم کہ اس قسم کے رازوں کو دفن کر دینے کے حق میں میرا سینہ کتنا گہرا ہے۔!"

وہ کچھ عجیب لہجہ میں بولا اور اس کی چمکتی ہوئی دانشمند آنکھیں ان لڑکیوں کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

"میں ڈرتی ہوں کہ اس جگہ یہ گفتگو کی جائے تو ممکن ہے طبیب کو کچھ شبہ گزرے۔ مناسب ہے کہ مکان پر چل کر ——"

وفا کہنے کو تھی کہ درمیان میں بشیر نے ٹوک دیا۔

"وہاں جمیل کی موجودگی کی وجہ سے موقعہ نہ ملے گا اور پھر طیب بھی تمام وقت ساتھ رہے گا۔ میں احتیاط رکھوں گا کہ طیب کو کسی کام سے بھیج دوں سردست اُسے جمیل کو تلاش کرنے میں خاصہ وقت لگے گا۔ یہ کوئی چھوٹا سا ہسپتال نہیں ہے" بشیر نے کہا۔

"آپ اختلاج قلب کے مریض ہیں، کہیں ایسا نہ ہو یہ واقعات آپ دل پر اثر انداز ہوں۔؟"

روشن نے اندیشہ ظاہر کیا۔

تم بلا کسی احتمال کے بیان کرو، بیٹی میرا دل ایسا کمزور نہیں؛" اِس پر روشن نے مختصر لفظوں میں انجمن کی روداد سنا دی۔

"اُف خدایا ——— ! تو یہ وہ عورت ہے؛ جس کا نوزائیدہ بچہ ہے کہ میں نے آسیہ کی گود بھری؟ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ——— کہ طیب ——— ؟ یعنی جمیل، طیب کا ——— !"

"ایسا لفظ زبان پر نہ لائیے محترم! وفا کی امی نے ہمیں بے حد تاکید کی ہے کہ یہ راز ہماری زبان تک آئے مگر اتفاق ایسا پیدا ہو گیا کہ آپ کے روبرو ہمیں ظاہر کرنا پڑا۔" روشن نے قطع کلام کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے فہمائش کی۔

"آہ بیچارہ طیب! کتنا پیارا۔ کس قدر بلند کردار لڑکا ہے اُسے خواب میں بھی خیال نہ ہو گا۔ کہ اُس کے گرد اسرار اور سازش کے ایسے جال بنے ہوئے ہیں جنہیں ہرگز کھولا نہیں جا سکتا ——— ! اور پھر اس ناکردہ گناہ نے تین سال ناحق اذیت برداشت کی ——— لیکن اِس سلسلہ میں مجھے کچھ یاد آیا ——— ؟"

بشیر نے اچانک چونک کر کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا اور پھر رفا کی طرف دیکھ کر جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"نہیں نہیں ——— ! ہرگز نہیں! آسیہ کو اِس قدر خود غرض نہ ہونا چاہیئے۔ اُسے اِس مظلوم بچے سے اتنی بڑی قربانی لینے کا حق نہیں پہنچتا۔ اُسے یہ حق ہرگز نہیں دیا جائے گا ——— طیّب کی شادی اِس کی اپنی مرضی کے مطابق ہوگی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔!"

بشیر نے پُر زور لہجہ میں کہا۔ دونوں لڑکیاں حیران سی ہو کر ایک دوسری کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"تو کیا طیّب بھیا کی شادی ان کی والدہ اپنی مرضی سے کہیں ٹھہرا چکی ہیں؟" روشن نے پوچھا۔

"ہاں مگر تم اُس کا خیال نہ کرو۔ وہ کوئی ایسی سنجیدہ بات نہیں خصوصاً جب کہ میں طیّب کے ساتھ ہوا۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے وفا کے بھولے بھالے فرشتگانہ چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اِس کا رنگِ رخ متغیّر ہو گیا تھا شہابی رنگت پر زردی چھا گئی تھی۔

"تم ہرگز فکر نہ کرو میری بچی! میں خود تمہیں طیّب کے لیے منتخب کر چکا ہوں اور آسیہ کبھی میری تجویز کو مسترد نہیں کر سکتی۔"

وہ کہہ رہا تھا کہ جمیل اور طیّب داخل ہوئے۔ بشیر نے جمیل کی طرف کچھ اِس قدر غور سے دیکھا جیسے وہ اِس کے لیے نیا آدمی ہو، پھر اُس نے طیّب کے سراپا پر ایک غائر نگاہ ڈالی اُسے عمر بھر میں پہلی مرتبہ اُن کی باہمی مشابہت کا اندازہ ہوا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں بھائی جان؟" جمیل اُسے اِس قدر غور سے دیکھتے پا کر حیران سا ہوا۔

میں یہ دیکھ رہا تھا۔ کہ تم آج وہ ہمیشہ جیسے ڈاکٹر جمیل نظر نہیں آ آ رہے۔ کچھ بدلے بدلے ہوئے لگ رہے ہو۔ ورنہ تم اور کسی مریض

کی طرف توجہ کرنے سے انکار کر دو ——؟" بشیر کی یہ بات سُن کر جمیل خلافِ توقع ہنس دیا۔

"بھائی جان! یہ مریض نہیں مریضہ ہے ——!" اور مریضہ بھی ایسی کہ بس کچھ نہ پوچھیے!"

وہ ہنس کر کہنے لگا۔ اُس کی ہنسی میں زہر خند کی گونج تھی۔

"جیسی کیسی بھی ہے مگر ہے تو مریضہ؟ چنانچہ اس رعایت سے تمہاری توجہ کی مستحق ہے!"

بشیر کہنے لگا۔ اور بدستور غور سے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز رکھیں۔

"ہوں"

ڈاکٹر جمیل نے گویا بشیر کی بات نہ سُنی اور کسی گہری سوچ میں کھو گیا اور اسی عالم میں کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا سب خاموشی سے اُس کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"اچھا تو آپ گھر چلنے کو کہہ رہے تھے ——؟"

دو تین چکر لگانے کے بعد جمیل یکایک بشیر کے سامنے رُکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ہاں —— یہ بچے آئے ہوئے ہیں۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ رونق میں وقت گزاروں۔ تم نے مجھے یہاں قید کر چھوڑا ہے۔" بشیر کہنے لگا۔

"خیر آپ اس وعدہ پر چل سکتے ہیں کہ بد پرہیزی نہ ہو گی!" ڈاکٹر کہنے لگا۔

"وعدہ ہوا بھئی! پرہیز کے نام پر تو اگر تم کہو گے سانس لینا بند کر دو۔ تو فوراً تعمیل ہو گی۔"

بشیر نے کچھ ایسے طریقہ سے کہا۔ کہ طبیب کو بے اختیار ہنسی آگئی اور

دونوں لڑکیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

"اب یہ اپنے گرد رونق لگانے کے واسطے آپ سب کو رات بھر جگائیں گے۔ تیار رہنا!" ڈاکٹر نے اِن سے کہا۔

"جی ہم بسر و چشم تیار ہیں۔ بھلا بزرگوں کی زیارت کا روز روز موقعہ تھوڑا ہی ملتا ہے۔"

روشن بے دھڑک بول اُٹھی۔ اس علم کے ماتحت کہ جمیل طیّب کا ماموں نہیں بلکہ اُس کا باپ ہے وہ اُسے قریب تر محسوس کرنے لگی تھی۔

"اچھا تو چلیے پھر ——!"

وہ یک دم کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولا۔ طیّب نے سہارا دے کر بشیر کو اُٹھایا اُس کے ایما پر اس کی چند اشیاء روشن نے ایک بیگ میں ڈالیں اور یہ سب لوگ کمرے سے باہر نکلے۔ جمیل ڈاکٹر وکٹر کے ساتھ ساتھ ہال کے بڑے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

"اپریشن آج ہو یا کل پھر میں آپ کو یقینی طور پر بتا دوں کہ وہ عورت بچ نہ سکے گی —— سرطان نے اِس کے دماغ کی طرف رُخ کر دیا ہے چھاتی کا اپریشن کر بھی دیا جائے تو وہ موذی مرض جسم کے نازک ترین حصّہ میں محفوظ ہو چکا ہے۔ اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ ریڈیم کو اس کے دماغ میں "شوٹ" کیا جائے، اور اس عمل کے لئے ہمارے پاس آپریٹس نہیں ہے۔ امریکہ سے منگوانا پڑے گا ہمارے پاس اس سے پیشتر ایسا کیس آج تک نہیں آیا!"

وہ کار تک پہنچتے پہنچتے یہ تقریر ختم کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر وکٹر مسلسل اپریشن کے واسطے بضد تھا کیونکہ ڈاکٹر روچیٹر بھی اسے حل نہیں سکا تھا۔ اور جمیل کے اس بیان پر بھی جیسے مطمئن نہ ہوا اور بددلی سے خاموش ہو گیا۔

(۲۷)

„خیریت تو ہے طیّب؟ تمہارا چہرہ اس قدر اُترا ہوا کیوں ہے؟“

اگلی صبح ناشتہ کی میز پر بشیر نے طیّب کی طرف غائر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ تو جمیل نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ یہ عجیب نگاہ تھی! جس کا تجزیہ شاید کوئی ماہرِ نفسیات بھی نہ کر سکتا۔ اس ایک نگاہ میں جذبہ ترحم بھی تھا اور بے پایاں محبت بھی۔ برداشت اور مجبوری کا عنصر بھی تھا اور شوق سے بے اختیار بھی ——— مگر بظاہر وہ طیّب کے جواب کا منتظر بھی تھا، طیّب نے جیسے گہرے استغراق کی کیفیت میں ماموں کی بات ہی نہ سُنی۔ وہ نظریں جھکائے اپنی دلیے کی پلیٹ اور چمچ سے گویا کھیل رہا تھا۔

„طیّب بھیّا! بڑے ماموں جان آپ سے کچھ کہہ رہے ہیں! ذرا واپس آکر ان کی بات سُن لیجیے!“

روشن نے آہستہ سے اُس کا بازو چھو کر کہا۔ تو وہ چونک کر متوجہ ہوا۔ سب اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

„فرمایئے ———؟“ اُس نے خوابیدہ سی نظروں سے بشیر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

تم تو آدھے سو رہے ہو بیٹے! میں نے پوچھا تھا کیا بات ہے تمہارا چہرہ یوں اترا ہوا اور زرد نظر آ رہا ہے؟"

بشیر نے اور بھی گہری نظروں سے اُس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جی تو چاہ رہا ہے کہ پورا ہی سو رہا ہوتا!"

اُس نے مسکرا کر کہا۔ عجب آزدگی تھی اُس کے لہجہ میں جمیل نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اُس کے ہونٹ گویا عالم بیچارگی میں لرز کر رہ گئے۔

"ہاں رات کی بے آرامی سے مضمحل سے ہو گئے ہو ——— ! لیکن طالب کو تو شب بیداری کا عادی ہونا چاہیئے۔ یہ لڑکیاں بھی تو تمہارے ساتھ جاگتی رہی ہیں"

بشیر نے گویا طیّب کی طرف سے خود ہی جواب دیا۔ مگر طیّب خاموش رہا۔

"طیّب بھیّا! آپ تو کچھ بھی نہیں لے رہے یہ آپ کی چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی ———؟"

روشن کہنے لگی۔ تو طیّب نے ٹھنڈی چائے کی پیالی اُٹھالی اور جلدی جلدی پینے لگا۔ وفا اگرچہ خاموش تھی لیکن اسکی نگاہیں مسلسل طیّب کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں اور اسے شبہ ہی نہیں یقین ہو چلا تھا۔ کہ وہ۔ اِس راز سے آگاہ ہو چکا ہے جو اِس کی ذات سے وابستہ ہے ورنہ اس کے اِس بدلے ہوئے انداز کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ شام کے کھانے پر وہ میزبان کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہر چیز اپنے ہاتھ سے انہیں پیش کر رہا تھا۔ لیکن اِس وقت یوں لاتعلق بلکہ بے خبر اور کھویا کھویا سا بیٹھا تھا جیسے ان کی موجودگی تک کو بھول گیا ہو۔ وفا نے جب بھی دیکھا ڈاکٹر جمیل کو صرف طیّب کی طرف دیکھتے پایا۔ اِس کی نگاہوں میں آج ایک شوق تازہ

کی جھلک تھی جیسے اُسے آج ہی یہ چہرہ دیکھنے کو ملا ہو! آخر ناشتہ ختم ہوا اور سب سے پہلے ڈاکٹر جمیل اپنی نشست سے اُٹھا۔

"میں آج جلدی ہسپتال جاؤں گا۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے یا گھر ہی پر ٹھہریں گے؟" وہ بشیر سے پوچھنے لگا۔

"میں ـــــ فی الحال تو یہیں ٹھہروں گا۔ مگر دوپہر کو میرے لئے گاڑی بھیج دینا۔ میں ذرا اُس عورت کو دیکھنا چاہتا ہوں!" بشیر کہنے لگا۔

"اچھا ـــــ ذرا میرے ساتھ آئیے! ـــــ"

ڈاکٹر جمیل بشیر کو لے کر آگے چل دیا۔

"کیا بات ہے طیّب؟"

وفا نے دونوں معمّر آدمیوں کے منظر سے ہٹتے ہی بے اختیار طیّب کا بازو تھام کر اُس کی نگاہوں کو ڈھونڈتے ہوئے کہا۔ وہ اس سے مسلسل نظریں چرا رہا تھا۔

"کچھ نہیں وفا ـــــ!"

اُس نے منہ پھیرتے ہوئے کہا بے ساختہ ایک سسکی اس کے سینے سے ابھری۔

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟" ورنہ آپ کی یہ کیفیت کیا معنی رکھتی ہے۔؟"

وفا کی بجائے روشن بول اُٹھی اور وفا استفسار سے طیّب کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ لیکن طیّب نے کوئی جواب نہ دیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے بڑھ گیا۔

"میں ابھی آتا ہوں ـــــ!"

اس نے جاتے جاتے آہستہ سے کہا۔ اور ہال کی بجائے ایک

عقبی دروازہ سے گیا۔ جو ایک اندرونی برآمدہ میں کھلتا تھا اور برآمدہ سے ایک اور چھوٹا زینہ اُس کی خواب گاہ کی طرف اُوپر جاتا تھا۔ وفا اور روشن حیرت زدہ سی ایک دوسری کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہ گئیں اور آخر ہال کی طرف نکلیں۔ کھانے کا یہ کمرہ ہال کے صدر دروازہ سے متصل تھا۔ وہ نکلیں تو سامنے ہی باہر کے چبوترے پر ڈاکٹر جمیل اور بشیر کھڑے تھے۔

„ ہرگز ہرگز نہیں! میں تمہیں اِس کی اجازت نہیں دے سکتا! یہ راز ہمیشہ راز ہی ہونا چاہیئے۔ تمہاری اِس نادانی سے طیّب کے مستقبل پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔“ بشیر تنبیہ کے لہجہ سے مگر دبی آواز میں کہہ رہا تھا۔

„ طیّب کے مستقبل پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ یہی نا کہ وہ راؤ نیاز احمد کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔ تو اس صورت میں میرے پاس اُسے دینے کے لیے پانچ گنا مالیت کی جائداد اور نقد موجود ہے بلکہ اس انکشاف سے بھی بہت پہلے میں اپنا سب کچھ اس کے نام پر منتقل کر چکا ہوں ـــــ بھائی جان! للہ یہ اسرار کی دیوار میرے اور میرے بیٹے کے درمیان سے ہٹا لیجئے! مجھے ایک بار اُسے پکار کر سینے سے لگا لینے کی اجازت دے دیجئے!“

ڈاکٹر جمیل کی آواز فرطِ جذبات سے لرز رہی تھی۔ بشیر نے اُس کی پشت پر ہاتھ سے آہستہ آہستہ تھپکتے ہوئے تسلی دی۔

„ صبر ـــــ! صبر سے کام لو۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ خود قدرت کا ہاتھ اس معاملہ میں کارفرما ہے۔ فضا خود بخود ہموار ہو رہی ہے۔ اسرار کی گرہیں خود بخود کھل رہی ہیں واقعات کی کڑیاں ملانے کو سازگار اتفاقات رونما ہو رہے ہیں تحمل سے کام لو میرے عزیز! قدرت کو اپنے سوچے

سمجھے طریقوں کے ماتحت اس گتھی کو سلجھانے دو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ——!

بشیر دھیمی اور مرعوب کن جیسی آواز سے کہہ رہا تھا جیسے یہ بھی مقدر ہی کی آواز ہو!

"اچھا ——!"

جمیل نے راضی برضا جیسے انداز میں طویل سانس کھینچتے ہوئے کہا اور سیڑھیاں اُترنے لگا، اس کے انداز میں عجب قسم کی شکستگی تھی قدموں میں لرزش تھی وہ تھکی تھکی ہوئی سی رفتار سے کار کی طرف جا رہا تھا۔ بشیر اپنی جگہ پر کھڑا ہوا رحم بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہ وفا اور روشن آگے بڑھیں۔

"دیکھ لیا نا؟ ان بوڑھے کھوسٹ ماموں بشیر نے آخر ڈاکٹر جمیل کو سب کچھ بتا کر دم لیا؟" روشن نے چٹکی لے کر دبی زبان سے کہا۔

"اور مجھے تو یقین ہے کہ طبیب بھی کچھ نہ کچھ جان گیا ہے۔ ورنہ اس کی یہ کیفیت کیا معنی رکھتی ہے؟ وفا کہنے لگی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" روشن بولی۔ باتوں کی آواز پر بشیر نے پیچھے پھر کر دیکھا۔

"باہر تو ابھی تک کہر ہے فضا بالکل دُھندلی ہو رہی ہے۔ ذرا دن چڑھے باغیچہ میں نکلیں گے آؤ اندر چل کر بیٹھیں ہمیں تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں —— طبیب کہاں ہے؟ بشیر نے کہا۔

"شاید اُوپر گئے ہوں گے اپنے کمرے میں —— ماموں جان! آپ نے ان کی کیفیت ملاحظہ کی؟ —— صریحاً انہیں کچھ معلوم ہے!" وفا کہنے لگی۔ تو بشیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کچھ سوچنے لگا۔

ماموں جان ! آپ نے چھوٹے ماموں جان کو سارے حالات بتا دیئے اچھا نہیں کیا !“

روشن نے اُسے مہلت ہی نہ دی۔ کہ وہ انکار یا اقرار کرتا اور فوراً فیصلہ بھی سنا دیا۔ بشیر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے کہ مجھے بتانا پڑا۔ ایک انسان کی زندگی اور موت کا سوال ہے“ اور بشیر غور سے دونوں لڑکیوں کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ کہ آیا وہ اس انکشاف پر اس سے ناراض تو نہیں ہو گئیں۔ اور وہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اندر ہال میں آئے، آتشدان میں آگ دہک رہی تھی وہ آگ کے گرد کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔

”حیرت ہے کہ جمیل جیسا نرم دل اور انسان دوست شخص اس مرحلہ پر آکر ایسا خود غرض اور سنگدل بن گیا کہ اُسے اپنی مطلب براری کے پیشِ نظر اُس عورت کی عقوبت ناک حالت کا احساس نہ رہا —“ بشیر نے کرسی پر بیٹھتے ہی تمہید پوری کر دی۔

”تو اب انہیں اس سے کیا مطلب ہے ؟ یعنی کیا وہ —؟“

روشن نے کچھ کہنا چاہا تو بشیر نے ہاتھ کے اشارہ سے روکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”چند سال پیشتر کوئی پاکستانی مریض جمیل کے زیرِ علاج رہا۔ وہ اتفاق سے اس بدنصیب عورت، کی کسی رازدان سہیلی کا شوہر تھا اور جمیل اگرچہ اُسے نہیں جانتا تھا مگر وہ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں کوئی ذکرے اُس نے جمیل کو جتا دیا۔ کہ وہ اس کے متعلق کافی واقفیت رکھتا ہے اور یہ بھی بتایا کہ انجمن کو جب وہ طلاق دے کر چلا آیا تو چند ہی ماہ بعد اُس کے لڑکا ہوا جو اُس نے کسی کو دے ڈالا۔ مگر یہ وہ بھی نہیں جانتا تھا۔ کہ کس کو وہ بچہ دے دیا گیا۔ جمیل نے یہ معلوم کرنے کے واسطے انجمن کا سراغ

لگانا چاہا لیکن وہ بھی وطن چھوڑ کر باہر جا چکی تھی جب اچانک، جمیل نے اُسے پہچانا تو اس دیرینہ خواہش نے کہ اپنے بچے کا سراغ لگائے اس کے دل کو ایک دفعہ پھر بے تاب کر دیا۔ اس کی حالت سے وہ دیکھتے ہی اندازہ کر چکا تھا۔ کہ اپریشن بے سود ثابت ہوگا اور وہ جانبر نہ ہو سکے گی۔ اور اپنے بیٹے کا سراغ لگانے کا یہ آخری سہارا بھی اس کے ہاتھ سے جاتا رہے گا اُسے ہوش میں لانے کا صرف ایک ممکن ذریعہ تھا کہ کسی خاص آلہ کے ذریعے اُس کے ماؤف دماغ میں ریڈیم شوٹ کی جائے چنانچہ اس آپریشن کے لیئے اُس نے وائرلیس سے رات ہی آرڈر بھیج دیا تھا جو آج کی پہلی فلائٹ سے پہنچے گا۔ ڈاکٹر نے رات بھی کئی مرتبہ ٹیلیفون کیا۔ کہ مریضہ، بے حد تکلیف میں ہے۔ خواب آور دوائیوں کے باوجود وہ بدستور بیقرار ہے۔ اور سو نہیں سکتی۔ اس کا اپریشن ناگزیر ہے مگر ڈاکٹر جمیل بدستور اپنی ضد پر قائم تھا۔ کہ وہ پہلے مریضہ کو ہوش میں لا کر اس سے یہ راز پوچھے گا پھر اُس کا اپریشن کرے گا کیونکہ اپریشن کے ساتھ اگر اس کی موت واقع ہو گئی تو وہ اپنے بچے کو کبھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ اور یہ راز اس عورت کے سینہ میں ہمیشہ کے لیے مدفون ہو جائے گا ــــــ چنانچہ میں مجبور ہو گیا کہ اُس سے سارے حالات بیان کر دوں۔ وہ اب تک طیب کو آسیہ کا حقیقی بیٹا اور اپنا سگا بھانجا ہی سمجھتا تھا۔ حالانکہ میں تو پہلے دن سے ہی اس راز سے واقف تھا۔ میں نے ہی ڈاکٹر ناز سے مل کر سارا معاملہ طے کیا تھا ــــــ" بشیر نے دبی آواز میں سارا واقعہ بیان کیا۔

„تو پھر اس سے اپریشن کے معاملہ میں کیا فرق پڑا ــــــ" وہ تو بہرحال آج ہی پر موقوف رہا؟" وفا نے پوچھا۔

„نہیں! رات ایک بجے جمیل ہسپتال گیا اور اپریشن کر کے آیا۔ بلکہ اُس کی توقع کے خلاف اپریشن کامیاب رہا۔ اور مریضہ بچ گئی۔ اگرچہ مرض نے

اب دماغ پر قابو پالیا ہے جس کے لیے ریڈیم کا وہ خاص قسم کا آلہ جمیل نے منگوایا ہے۔ عین ممکن ہے یہ علاج کارگر ہو اور وہ جانبر ہو جائے۔

„لیکن طبیب ابھی تک نہیں آیا۔ تمہارا کیا عندیہ ہے اُسے اس معاملہ کی کیونکر خبر ہو گئی۔ ماشاء اللہ میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔"

بشیر نے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے ان دونوں کی خائف جیسی نظریں ڈالتے ہوئے کہا تو اس کی اس ہیئت کذائی پر انہیں ہنسی آگئی۔

„آپ بزرگ ہیں اگر بتا بھی دیتے تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہوتی۔" وفا نے مسکرا کر کہا۔

„مگر تم لوگ کہہ رہے ہو کہ وہ —— ہاں میں نے بھی دیکھا۔ کہ ناشتہ پر وہ واقعی بہت سنجیدہ اور مضمحل نظر آ رہا تھا۔ تو کیا خیال ہے تمہارا؟"

بشیر نے کچھ الجھن سی محسوس کرتے ہوئے بے ربط فقروں میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کیا۔

„میرا تو خیال ہے کہ انہوں نے آپ کو اور ڈاکٹر صاحب کو باتیں کرتے سُن پایا ہے ——" روشن نے احتمال ظاہر کیا۔

„مجھے تو یقین ہے کہ طبیب کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔" وفا کہنے لگی۔

„تو پھر اب کیا کیا جائے؟" بشیر نے واضح طور پر سہم کر پوچھا۔

„اس صورت میں کر ہی کیا سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ انہیں تلقین کی جائے کہ اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیں۔"

وفا نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

„وہ ہے کہاں، جا کر اُسے بلانا تو سہی روشن بیٹی؟" بشیر نے کہا۔

„ماموں جان! میرا خیال ہے میں اور وفا پہلے اپنے طور پر ان کا عندیہ لیں اور معلوم کریں۔ کہ انہیں حالات سے کہاں تک واقفیت ہے؟ روشن

نے تجویز پیش کی۔

"ہاں! تمہاری رائے صائب ہے جاؤ بہن کے ساتھ جاؤ اور نہایت نرمی اور دلجوئی سے اس کے دل کا حال معلوم کرو۔"

بشیر نے وفا کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ وہ اتنے قلیل عرصہ میں ہی اس لڑکی کو بے حد پسند کرنے لگ گیا تھا۔ یہ حکم پا کر وفا اُٹھی اور روشن کے ساتھ ساتھ اُوپر آئی۔ طیب اپنے کمرے میں تھا۔ یہ دونوں بلا اطلاع ہی اندر گھسیں وہ ایک صوفے پر نیم دراز تھا سگریٹ کے دھوئیں سے کمرہ دھواں دھار تھا۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری پڑی تھی جو رات بھر میں اس نے پھونکے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے طیب؟ ہم انتظار کر کر کے تھک گئے تم اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھے ہو؟"

وفا آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھ کر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"وفی ــــــ!"

اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ویرانیاں چھا گئی تھیں۔ اُس نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر اُس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

"مگر ہوا کیا ہے؟ مجھے صاف صاف بتاؤ آخر تمہارے دل میں کیا ہے؟"

"وفا ــــــ! یہ پوچھو کہ تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہے؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"ہاں چلو یہی بتا دو ــــــ کچھ بتاؤ سہی؟"

وفا اُسی طرح اُس کی گردن میں بازو حمائل کیے بیٹھی تھی۔ اور غور

سے اُس کے چہرے کو تک رہی تھی۔

”آؤ روشی! میری اپنی بہن! میں دیکھوں گا تم اپنے اس ازلی بدنصیب بھائی کے لیے اب کیا مداوا کر سکو گی ——— آؤ یہاں میرے سامنے بیٹھو اور ایک عجیب وغریب قصہ سنو!“

اُس نے روشن کی طرف دیکھ کر کہا۔ روشن آگے بڑھ کر سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”سنائیے ———!“

اُس نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ وہ چند لمحے سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔

”واقعی یہ دُنیا عجب پُراسرار اور پُرفریب مقام ہے ———! اگر کوئی شخص خود صاف باطن ہے تو بھی کچھ بھروسہ نہیں کہ اہلِ غرض نے اپنی مقصد براری کے لیے اس کی معصوم ہستی کے گرد مکروفریب کے جال بُن رکھے ہوں۔ اُسے اسرار اور بھید کی بھول بھلیوں میں مقید کر رکھا ہو۔ یہاں ایسے خطرناک لوگ بستے ہیں جو اپنے گناہ کی پردہ پوشی کے لیے اپنی اولاد تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہاں ایسے خود غرض لوگ رہتے ہیں جو اپنی غرض کے لیے کسی معصوم ہستی کو آلۂ کار بناتے ہیں اور انہیں اپنی پُراسرار شعبدہ بازیوں کے بل پر واقعیت اور اصلیت سے محروم کر کے ایسی شخصیت کا جامہ پہناتے ہیں جو وہ نہیں ہوتے یہ غرض کے بندے اتنا نہیں سوچتے کہ کسی وقت اُس شخص کی اپنی شخصیت اُجاگر ہو کر ان کی اپنی پہنائی ہوئی شخصیت سے متصادم ہو جائے گی تو نتیجہ کیا ہو گا ——— اپنی پیدا کی ہوئی شخصیت کو وہ قائم نہ رکھ سکے گا اُن کی عاید کی ہوئی شخصیت کو قبول کرنے سے انکار کر دے گا تو اس کے پاس زندہ رہنے کے واسطے کیا باقی رہ جائے گا۔؟“

وہ کہتا جا رہا تھا کہ روشن کا دل اُلجھنے لگا۔ وہ طیب کو اس قدر سنجیدہ اور وفا کو اس حد تک رنجیدہ دیکھنے کی زیادہ دیر تک متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ درمیان میں بول اٹھی۔

"اب ختم بھی کیجئے گا طیب بھیّا! میں تو گھبرا گئی ــــــ! سچ کہتی تھیں وہ لڑکیاں آپ کو واقعی "سقراطیت" کا دورہ پڑتا ہوگا یونہی! بھلا ایک دم سے سیدھی سیدھی بات کیجئے؛ وفا نے تو اسی قدر پوچھا کہ ہوا کیا؛ اور آپ نے مجھے یہ لالچ دے کر بٹھا لیا تھا۔ کہ آؤ اور ایک عجیب و غریب قصہ سنو؛"

طیب اُس کی طرف شفقت بھری نگاہ سے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"جیو! میری بہن! زندگی میں تمہیں یوں ہی مرنجاں مرنج رہنا نصیب ہو ــــــ؛"

"آمین! چلیے براہِ راست شروع کیجئے ــــــ!"

روشن بے صبری سے درمیان ہی میں بول اُٹھی۔ طیب اپنی اس انتہائی رنجیدہ کیفیت کے باوجود۔ مسکرائے بغیر نہ سکا۔ اگرچہ وفا کو یہ بے محل مذاق اچھا نہ لگا مگر وہ خاموش رہی۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ لوگ اس دنیا میں اپنے مفاد پر دوسروں کو قربان کر دیتے ہیں۔ خبر نہیں کتنے ایسے ہی مطلوم ان اہلِ غرض کی خود غرضیوں کا شکار ہوں گے ــــ بہر حال اُن مظلوموں میں سے ایک میں ہوں۔ رات مجھے ایک عجیب پُر اسرار قصہ معلوم ہوا۔ میں اپنے "پورٹ مینٹو" کی چابی نیچے کرسی پر ہی پھینک آیا تھا کمرے میں آ کر بکس جو کھولنے لگا تو چابی ندارد خیال آیا کرسی پر رکھی رہ گئی ہوگی۔ چنانچہ میں نیچے آیا۔ میں ابھی راہداری میں چند قدم دُور ہی تھا۔ کہ مجھے ماموں بشیر کی آواز آئی۔ میں حیران ہوا کہ یہ لوگ اس وقت تک یہاں کیوں بیٹھے ہیں میں آگے بڑھنے ہی کو

تھا۔ کہ ماموں بشیر کے لفظ جیسے مجھ پر بجلی بن کر گرے ——— وہ کہہ رہے تھے۔

„طیب در حقیقت راؤ نیاز احمد کا بیٹا نہیں!“

میں وہیں جیسے مفلوج سا ہو کر رہ گیا نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ اتنا کہہ کر وہ پھر کشمکش میں پڑ گیا یہ باتیں دوہرانا اس کے لیے عقوبت ناک تھا۔ اور وفا نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا۔

„اگر یہ باتیں دوہرانا تمہارے لیے تکلیف دہ ہے تو رہنے دو طیب!

وہ اس کا سرد ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے کہنے لگی۔

„ہاں آپ کا یہ عجیب و غریب قصہ ہمارے لیے کچھ نیا نہیں۔ اس کا کچھ حصہ ہم لوگ پاکستان ہی میں سن کر آئے تھے اور کچھ یہاں آ کر مکمل ہو گیا!“

روشن نے اپنے اُسی ہلکے پھلکے انداز سے کہا اور اتنے ہی میں واضح کر دیا کہ جس بات کو وہ اتنی اہمیت دے رہا ہے وہ در حقیقت کوئی ایسی بات نہیں جس سے انسان اس قدر دل گرفتہ ہو جائے۔

„میں نہیں سمجھ سکا ——— ؟ کیا معلوم تھا آپ کو یہاں آنے سے بیشتر؟“ وہ پوچھنے لگا۔

„یہی کہ راؤ نیاز احمد کی بیگم نے آپ کو کن حالات میں گود لیا؟ آپ کے حقیقی والدین کون تھے؟ آپ کے والد کا صرف نام معلوم تھا اُن کی اصلی شخصیت یہاں آ کر معلوم ہوئی ——— کہ عجیب و غریب اتفاق سے آپ اُسی شخص کے حقیقی فرزند تھے۔ جو آپ کو اپنا حقیقی خواہر زادہ خیال کرتا تھا کیونکہ آپ کی پیدائش کا راز خود ان کو بھی معلوم تھا۔ ماموں بشیر کو اگرچہ اس سارے ڈرامہ کا سوچا سمجھا پلاٹ معلوم تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا۔ کہ ڈاکٹر جمیل آپ کے حقیقی والد ہیں۔

یہ انہیں کل ہماری زبانی معلوم ہوا۔"

روشن نے جلدی جلدی مختصر حالات بتائے طیب حیرت زدہ سا سنتا رہا۔

"مگر آپ کو اگر یہ سب حالات معلوم ہو گئے یقیناً خالہ جان کو بھی معلوم ہوئے ہوں گے تو انہوں نے آپ کو یہاں آنے اور مجھ سے ملنے کی اجازت کیوں کر دے دی ــــــ؟ مجھے یاد ہے۔ کہ انہوں نے میری درخواست میں راؤ نیاز احمد کا نام پڑھ کر ہی تو نامنظور کر دیا تھا۔ جب ہی وہ یک دم مجھ سے متنفر ہو گئیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

اس وقت انہیں پورے حالات معلوم نہ ہو سکے تھے چند شکوک کی بنا پر انہوں نے انکار کر دیا۔ لیکن اب جب کہ جزو کل معاملہ ہوا تو خود نے ہمیں فوراً تمہارے پاس بھیجا۔ وہ تمہیں بے حد چاہتی ہیں طیب اور تم پر فخر کرتی ہیں!" وفا نہایت دلجوئی کے انداز سے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"عجب معاملہ ہے!"

طیب مارے حیرت کے صرف اسی قدر کہہ کر رہ گیا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر شرم کے مارے پوچھ نہیں سکتا۔

"میں آپ کو سب حالات شروع سے سناتی ہوں ــــــ"

روشن نے اُس کی اُلجھن کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ بکھرے ہوئے واقعات کی کڑیاں اس کے پریشان ذہن میں ترتیب سے جڑتے نہیں پا رہی تھیں۔ چنانچہ روشن نے اس کی والدہ یعنی بیگم راؤ نیاز کے بیگم درانی کے پاس آنے اور وفا کے پس پردہ اُن کی گفتگو سُننے کا سارا حال سُنایا۔ اس کے بعد اب وفا کے اُس واقعہ کو ظاہر کرنے اور اپنے ڈاکٹر ناز سے مل کر تحقیقات کرنے کا سارا قصہ تفصیل سے بیان کرنے لگی۔

„ اچھا ــــ ؛ تو کیا میرے والدین نے باقاعدہ قانونی طور شادی کر لی تھی ؟"

جب روشن واقعات سناتے ہوئے اس خاص مرحلہ پر پہنچی تو طیب بے اختیار بول اُٹھا۔ کیونکہ یہی پھانس تو اُس کے دل میں کھٹک رہی تھی۔ کہ اُس کی پیدائش ناجائز تھی۔ اور اب یہ معاملہ ظاہر ہونے پر وہ اُن مخلص لوگوں کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا تھا اور اُسے یقین تھا کہ حقیقت حال سے آگاہ ہو کر وفا اور اس کی امی اس کے ساتھ رشتہ استوار کرنا پسند نہ کریں گی۔ اُسے معلوم نہ تھا۔ کہ وہ لوگ پہلے ہی پوری تحقیقات کر کے اپنی تسلی کر چکے ہیں۔ وہ سُن سُن کر حیران ہو رہا تھا۔

„ جب کسی امر کا معینہ وقت آ پہنچتا ہے تو قدرت خود ہی گرہ کشائی کرتی چلی جاتی ہے۔ بہر کیف ہمیں اللہ پاک کا شکرانہ ادا کرنا چاہیئے کہ اُس نے بہتر حالات پیدا کر دیئے۔ اسرار کی دھندلی فضا چھٹ گئی اور حقیقتِ صبحِ نو کی طرح آشکارا ہو گئی ــــ" وفا نے محبت بھری نظروں سے طیب کی طرف دیکھتے ہوئے پُر حلاوت لہجہ میں کہا تو اس صالح نوجوان کی اُمیدوں کے گلستان میں ایک بار پھر بہار مسکرانے لگی۔ جس واقعہ کو وہ اپنی بدنصیبی کا پیش خیمہ سمجھ رہا تھا اب وہی اُسے اپنے طالع کا ستارہ نظر آنے لگا۔ وہ ہر لفظ سے پہلے شکرانہ ادا کر رہا تھا۔

„ اب ماموں جان آئیں گے تو تم اُنہیں خود "ابو" کہہ کر مخاطب کرنا اور اُن سے گلے ملنا۔ وہ ابھی کیسی حسرت اور منت کے ساتھ بڑے ماموں جان سے التجا کر رہے تھے۔ کہ ایک بار طیب کو گلے سے لگا کر بیٹا کہنے کی اجازت دے دیں۔ !"

وفا رقت بھری آواز میں بتا رہی تھی۔ طیب کی آنکھوں میں بھی وفورِ جوش سے آنسو آ گئے۔

"ماموں جان نے آخر یہ کیا کیا کہ شادی کے فوراً ہی بعد بیوی کو طلاق دے دی! بس اُن کی محض اتنی سی غلطی نے یہ سارا مخمصہ پیدا کیا!" روشن نے جھنجھلا کر کہا۔

"وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گئے ـــــ ان کی رات جو گفتگو میں نے سُنی اُس سے ثابت ہو گیا۔ کہ قصور سراسر اُن کی بیوی کا تھا۔

(میں اُس عورت کو ماں کے مقدس لقب کا حق دار نہیں سمجھتا جس نے ایک بچے کو جنم دیا لیکن بدنامی یا دُنیا کے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر اُس بے بس ہستی کو دوسروں کے رحم و کرم کے حوالے کر دیا) وہ رات ماموں جان کو بتا رہے تھے۔ کہ شادی کے بعد اُن کی بیگم نے اُنہیں اپنے سابقہ معاشقوں کی عجیب و غریب داستانیں سنانی شروع کیں شوہر کو غصہ دلا کر اور جلا کر وہ لطف اُٹھاتی ـــــ ہنستی اور فخر کیا کرتی کہ وہ اس قدر حسین ہے کہ دُنیا اُس پر مرتی ہے! اُس نے اپنے چاہنے والوں کی ایک طویل فہرست شوہر کو گنوائی وہ خونِ جگر پی پی کر رہ گیا اور آخر حکم دیا۔ کہ اب شادی کے بعد وہ اپنے سابقہ دوستوں سے نہیں ملے گی مگر اُس نے اُسی وقت صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ قید برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی پر ہمیشہ جھگڑا ہوتا وہ بدستور اپنے والدین کے پاس رہتی تھی۔ یہ جب بھی ملنے جاتے کسی نہ کسی کو موجود پاتے وہ نہ تو اپنے والدین کی پابندی میں تھی نہ شوہر کی فرمانبرداری کر سکی۔ بلکہ صاف کہہ دیا کرتی کہ وہ اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ اس کے اس طرزِ عمل سے بے حد شکستہ دل ہوئے اُسے طلاق دے دی اور وطن کو ہمیشہ کے واسطے خیر باد کہہ کر چلے آئے ـــــ"

"چلو اب نیچے چلیں۔ باتوں میں ہم بڑے ماموں جان کو بھول ہی گئے وہ ہال میں اکیلے بیٹھے ہیں۔ ہمیں اُنہوں نے تمہاری خبر گیری کے واسطے بھیجا تھا۔"

وفا کہنے لگی۔ اور تینوں اُٹھ کر نیچے آ گئے۔

"بڑی دیر کر دی آپ لوگوں نے؟ میں تو فکر مند ہو گیا تھا اور خود اُوپر آنے کے لیے سوچ رہا تھا۔" بشیر نے انہیں آتے دیکھ کر کہا۔

"ماموں جان! یہ طیب بھیا نہیں مان رہے تھے بڑی مشکل سے انہیں منا کر ساتھ لائے ہیں۔" روشن کہنے لگی۔

"کیوں؟ کیا ناراض ہو گئے تھے طیب بیٹا؟" بشیر نے پوچھا۔

"جی نہیں ماموں جان! میں کیا ناراض ہو سکتا ہوں جس کی ناپائیدار ہستی کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں کہ ہر آن تغیر پذیر ہے۔ کل کچھ تھا آج کچھ ہوں۔ کل کو خبر نہیں کیا ہو جاؤں گا۔" وہ طنزیہ لہجہ میں کہنے لگا۔

"میں نہیں سمجھا؟ یہ کس قسم کی گفتگو ہے؟"

بشیر نے حیران ہو کر پوچھا اور استفسار سے روشن اور وفا کی طرف دیکھا۔ روشن اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھایا۔

"انہوں نے رات اتفاقاً آپ کی اور چھوٹے ماموں جان کی کچھ باتیں سُن پائی ہیں۔ انہیں سے پریشان ہو گئے تھے۔ اب سمجھانے بجھانے سے کچھ تسلی ہوئی ہے!" وفا کہنے لگی۔

"ادھر آؤ میرے پاس —— بے وقوف لڑکا! بھلا اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ دُنیا میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے تمہارے ساتھ کوئی انہونی بات نہیں ہوئی۔ شکر ہے انجام بخیر ہوا اور پھر تمہاری پرورش تو شہزادوں کی طرح ناز و نعم میں ہوئی۔ تمہاری ماں آسیہ بیگم نے ناز برداری میں کبھی کوئی کسر اُٹھا رکھی؟" بشیر اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے شفقت بھرے لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا ماموں جان! میں تو اب یہ سمجھتا ہوں۔ کہ مجھے انہوں نے اپنی جائیداد کے تحفظ کے لیے سپر بنایا۔ میں انہیں محض اس لیے عزیز تھا کہ میری

ذات کی آڑ میں وہ ایک معقول آمدنی پر متصرف تھیں۔ انجانے میں مجھ سے جو رول انہوں نے ادا کروایا اُس کا تقاضہ یہی تھا۔ کہ مجھے ظاہری حیثیت سے اُس درجہ کے شایانِ شان رکھتیں ورنہ تو مدمقابل کے دل میں شکوک پیدا ہونے کا احتمال تھا! —— مزید برآں انہوں نے میری مرضی کے خلاف میری زندگی کے حقوق دائمی طور پر مخالفین کے نام منتقل کر دینے چاہیئے۔ گویا میں کسی زر خرید غلام سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ کہ وہ مجھے میری مرضی کے خلاف جیسے چاہیں کام میں لا سکتی تھیں۔ اور جب میں نے اس اقدام کے خلاف احتجاج کیا تو وہ اس حد تک بگڑیں کہ مامتا کا نقلی پیراہن اُتار پھینکا اور اپنے اصلی رُوپ میں ظاہر ہو گئیں۔ مگر میری آنکھوں کے سامنے اسرار اور بناوٹ کا پردہ کچھ اس طرح حائل رہا کہ میں انہیں پہچان نہ سکا۔ اگرچہ ان کے چند لفظوں نے مجھے مشکوک ضرور کر دیا۔ مگر اُن کے وہ لفظ کیونکہ کچھ معنی رکھتے تھے اس لیے میرے ذہن پر دائمی نقش چھوڑ گئے میں بارہا اب تک بھی ان کی صدائے بازگشت اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس کر کے چونک اٹھتا رہا —— کہ "یہ بد اصل لڑکا اپنی اصلیت ظاہر کر کے رہا۔ سچ ہے ہر چیز اپنی اصل پر جاتی ہے!" جب میں نے اپنی زندگی کا یہ نازک مسئلہ ان کے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیا تو وہ مشتعل ہو کر بے اختیار کہہ اٹھی تھیں۔!

طیب اپنے جوش و خروش میں کہتا جا رہا تھا۔ کہ بشیر نے آہستہ سے اُس کی پشت کو تھپتھپاتے ہوئے تحمل کی تلقین کی۔

"مگر تم خدانخواستہ بد اصل نہیں ہو بلکہ اب تو ثابت ہو گیا کہ تمہاری اور خود آسیہ کی اصل و نسل ایک ہے تم اس کے نہیں تو اس کے بھائی کے حقیقی فرزند ثابت ہو چکے ہو"

بشیر نے پُر شفقت لہجہ میں کہا جیسے کوئی کسی ننھے بچے سے لاڈ کرتا ہے وفا کی نگاہیں طیب کے متغیر اور زرد چہرے پر گڑی ہوئی تھیں، روشن ہمدردی

سے لبریز نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ اس انکشاف نے طیب کے ذہن پر گہرا گھاؤ لگایا ہے۔

”مگر انہیں تو یہ حقیقت معلوم نہ تھی انہوں نے تو ایک لاوارث اور ناجائز بچے کو اپنا آلۂ کار بنانے کے واسطے گود لیا تھا۔ اور اب تک وہ یہی خیال اپنے دل میں لیے ہوئے ہیں۔ یہ تو روشن کو خدا نے میرے حق میں فرشتۂ رحمت بنا دیا ورنہ یہ راز کبھی نہ کھلتا اور میں اپنے مقصد تک کبھی نہ پہنچ سکتا بلکہ اپنے باپ کی طرح ساری زندگی دیارِ غیر میں رائیگاں کر دیتا۔“

طیب کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور اس کا دلی اندوہ لرزتی ہوئی بوجھل آواز سے ظاہر تھا۔

”روشن ——! روشن بڑی پیاری اور روشن دماغ بچی ہے۔ یہ میری یگانۂ روزگار وفا کی سہیلی ہونے کے عین مناسب ہے۔ یہ دُرہائے نایاب کی عدیم المثال جوڑی ہے تم اپنے آپ کو خوش نصیب کہو طیب تمہیں خدا نے ایسی شفیق بہن اور ایسی محبت شعار شریکِ زندگی بخش دی ——!“

بشیر کے آخری فقرہ پر وفا کا چہرہ یک دم گلنار ہو گیا اور اُس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنا چہرہ روشن کے پہلو میں چھپا لیا۔ طیب کے چہرے پر بھی سُرخی عود کر آئی اور ہونٹ پھر ایک بے ساختہ مسکراہٹ سے آشنا ہو گئے۔ بشیر ان دونوں کی کیفیت پر مسرت بار قہقہہ لگاتے ہوئے طیب کی طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

”ہوں ——! اب آیا مزاج شریف میں؟ میں کہتا ہوں تمہارے جیسا خوش نصیب دُنیا میں کون ہوگا ——! تمہاری جگہ اگر میں —— اُہو! نہ توبہ! یہ میں کیا بکنے لگا تھا؟“

بشیر کی اس بوکھلاہٹ پر ہنسی روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی طیب

نے قہقہہ لگاتے ہوئے بوڑھے ماموں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں وہ بھی اسے گلے سے لگاتے ہوئے اس قدر بے ساختہ ہنسے کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، روشن اور وفا مارے ہنسی کے الگ لوٹ رہی تھیں کہ اتنے ہی میں ڈاکٹر جمیل ہال کے صدر دروازے سے نمودار ہوئے۔

"لو اٹھو اور باپ کے سینے سے لگ جاؤ! اُف میرے اللہ! کس قدر حسرت سے صبح یہ شخص تمنا کر رہا تھا کہ وہ تمہیں بیٹا کہہ کر لپٹا سکے!" بشیر نے زیرِ لب کہا۔

"ماشاءاللہ! آج تو میرا ویران کدہ باغ و بہار ہو رہا۔ کس بات پر یہ گلگوں قہقہے اُڑ رہے ہیں کوئی مجھے بھی سُنا کر ہنسائیے؟"

ڈاکٹر جمیل آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے ان کی طرف بڑھا اور اپنے آزردہ جیسے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولا۔ طیب وفا اور روشن کھڑے ہو گئے۔

"نام خدا تمہیں اللہ نے فرزند بخشا ہے! اسی کی خوشی سنائی جا رہی ہے!"

بشیر نے بھی اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا اور طیب کا ہاتھ پکڑ کر اُسے جمیل کے بازوؤں میں دھکیل دیا۔ جو غیر اختیاری طور پر خود بخود کھل گئے تھے، بیٹے کو آغوش میں لیا تو ہنسنے کی بجائے جمیل کی آنکھوں سے ایک سیلِ رواں پھوٹ پڑا۔ طیب کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے اور خوشی کے ان آنسوؤں نے غبارِ خاطر کو دھو ڈالا —— ! طیب جس وقت باپ کے سینے سے الگ ہوا تو اس کے دل میں اُس شکوہ و شکایت کا ایک شمہ تک باقی نہ تھا جس کا ابھی ابھی وہ پورا دفتر لیے بیٹھا تھا۔ جمیل طیب کا ہاتھ تھامے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اُسے اپنے سامنے

بٹھا لیا آج اُس کی نگاہیں کسی طرح اس حسین و وجیہ نوجوان کو دیکھنے سے سیر نہ ہو رہی تھیں جو اب اِس کا حقیقی فرزند تھا۔ اُمید کی وہ کرن جو اس کی تاریک اور ویران زندگی میں کبھی پھوٹتی اور جھلملا کر مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں جذب ہو جاتی تھی، اب طلوعِ نو کی صورت میں اس کے جادۂ حیات کو روشن کر رہی تھی ــــــ اس کے چہرے کی ساری آزردگی دھل گئی۔

ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

نئے پروگرام ہونے لگے۔ جمیل نے وطن واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور اس ارادے کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کے واسطے بے قرار نظر آنے لگا۔ اُس نے طویل رخصت لینے کا تہیہ کر لیا تھا۔

"ہاں سچ جمیل ! وہ کیا بنا تمہارے مریض کا ؟" بشیر کو اچانک یاد آیا تو اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہو گیا سب کچھ"

جمیل نے مبہم سا جواب دیا۔ یہ تینوں بھی غور سے اُس کے چہرے کو تکنے لگے۔

"اپریشن مکمل ہو گیا ؟ یعنی وہ جو ریڈیم وغیرہ کا عمل تھا کارگر ہوا۔" بشیر اپنے چہرے پر اہمیت تجسس پیدا کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"جی ہاں ــــــ !"

مگر اُس کی آنکھوں میں نہایت سنجیدہ گہرائی پیدا ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے وہ تفکر میں ڈوب گیا اور چہرے پر ایک اندوہناک کیفیت جھلکنے لگی۔ بشیر نے غائر نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے جمیل ! ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ تم کچھ چھپا رہے ہو؟" بشیر نے گہرے استعجاب سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جو ہوا بہتر ہوگیا —— ! قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی —— جس وقت اُسے لے جارہے تھے معاً میری سماعت میں یہ آواز گونجی جیسے وہ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہو ـــ

”رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم
مارا دیارِ غیر میں، مجھ کو وطن سے دُور!“

(۲۸)

اُسی روز طیب دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر واپس آیا۔ مگر پروگرام بن چکا تھا۔ کہ ویزے بنوائے جائیں اور دو ہفتے کے اندر اندر روانگی طے ہو چکی تھی۔ بشیر اور جمیل بے تاب تھے۔ کہ کب وہ پاکستان پہنچیں اور طیب اور وفا کی شادی انجام پائے۔

یہ لوگ واپس آئے تو دو حیرت انگیز پیغام ان کے منتظر تھے ـــــ وفا کی امی، بیگم درانی نے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی تھی۔ کہ ” وہ بیمار ہیں اور چاہتی کہ دونوں لڑکیاں فوراً واپس آجائیں “ اور دوسرا یہ کہ کوئی نیوی کے لفٹینٹ نادر آئے تھے اور مس درانی کے لیے پیغام چھوڑ گئے تھے کہ وہ شام کو سات بجے پھر آئیں گے۔

” یہ نادر ـــــ ؟ وہ یہاں کیونکر آ پہنچا اور مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے اُسے ؟“ وفا متوحش نظروں سے روشن کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

” حد ہے بھئی! مجھ سے یوں پوچھ رہی ہو گویا اُس نے مجھے الگ سے خبر کر دی ہے کہ کیا کام ہے تم سے ؟“

روشن کے اس انداز سے جواب دینے پر طیب ہنسے بغیر نہ رہ

سکا۔

"ہو سکتا ہے وہ یہاں آ رہا ہو تو خالہ جان نے کچھ پیغام وغیرہ اس کی زبانی بھی بھیجا ہو۔"

طیب نے وفا کی تسلی کے لیے کہا وہ کچھ حیران بھی ہوا کہ نادر کے نام پر وفا اس قدر واضح طور پر پریشان کیوں ہو گئی۔

"مگر پیغام بھیجنا کیا ضرور تھا۔ کہ امی نے اسی کی زبانی بھیجا۔ اور کوئی ذریعہ نہ تھا؟ اسی طرح "کال" کر لیتیں جیسے آج کی۔" وفا نے الجھن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"مگر اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

اس نے وفا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ نادر کے رشتہ وغیرہ کا خیال تو روشن کے ذہن سے بھی رفت وگذشت ہو چکا تھا۔ اسی لیے کبھی طیب کے روبرو اس کا ذکر نہ آیا۔

"ان کی امی کے کوئی ملنے والے ہیں انہیں کا بیٹا ہے یہ نادر" روشن کہنے لگی۔

"اس کے والد کرنل حیدر میرے ابو کے دوست تھے۔" وفا نے بتایا۔

"او ہو! کرنل حیدر کا بیٹا نادر تو میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم نے میٹرک کا امتحان ایک ہی سکول سے پاس کیا پھر یہ لوگ شاید کہیں باہر چلے گئے کہ اس کے بعد یہ کبھی نہیں ملا۔" طیب کہنے لگا۔

"چلیے آج آئے تو وفا کی بجائے آپ ہی اُسے مل لیجیے اور اپنا تعارف بھی کرا لیجیے گا۔"

روشن نے ہنس کر معنی خیز انداز سے کہا تو جیسے طیب کی سمجھ میں کچھ آگیا۔

"اُہو! کیا ——— کوئی خاص بات ہے؟ اُس نے روشن سے پوچھا۔

"جی ہاں ——— خاص بات تھی مگر خالہ جان کا دل تو آپ میں لگا ہوا تھا اُنہوں نے کبھی کسی کی بات پر کان ہی نہیں دھرا۔ وفی! میرا تو خیال ہے یہ خورشید انٹی کی حرکت ہے۔ ضرور انہوں نے اسے یہاں کا پتہ دیا ہوگا!"

روشن کو خوب سوجھی۔

"واقعی! یہی بات ہوگی۔ خدا سمجھے اُن خورشید انٹی سے! خدا جانے انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی نیک کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔" وفا کہنے لگی۔

"چلو چھوڑو ان کے ذکر کو ——— مجھے تو بھوک لگ رہی ہے آؤ پہلے کھانا کھا لیں۔ کہیں وہ آدمی آ پہنچا تو بھوک بھی خراب ہو گئی۔"

روشن نے جلدی جلدی ناشتہ دان کھولا۔ جو جمیل کی ہاؤس کیپر مسز گریہیم نے "ہاٹ کیس" میں رکھ کر ان کے ساتھ کر دیا تھا۔ کھانا اسی طرح گرم تھا۔ روشن اور وفا نے مل کر میز لگایا اور طیب نے میس میں ٹیلیفون کر کے اطلاع کر دی کہ وہ کھانا اپنے طور پر الگ کھائیں گے۔ کیونکہ یہ تینوں ہوسٹل کے میس (MESS) میں کھاتے تھے۔

وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ طیب نے اُٹھ کر ریسیور اُٹھایا۔ چند لمحے سُننے کے بعد اُس نے سنجیدگی سے کہا" او۔کے!" اور ریسیور رکھ دیا۔

"آپ کے مہمان سیلون میں انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے بغیر کسی ایک کی طرف مخاطب ہوئے دونوں لڑکیوں ہی سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم جا کر مل لو۔ اتفاق سے تمہاری واقفیت بھی ہے۔

اور موجودہ حالات میں اپنا تعارف بھی کرا دو تاکہ ـــــ"

وفا نے طیب کی طرف دیکھ کر سادگی سے کہا۔ مگر فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"تاکہ لفٹیننٹ صاحب کی تسلّی ہو جائے!" روشن نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے متعلق کیا کہوں کہ کیوں نہیں مل سکتیں!" وہ پوچھنے لگا۔

"عجب بات ہے! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا۔ میرا اُس سے کبھی تعارف نہیں ہوا تم کچھ ہی کہہ دو جو مناسب خیال کرو۔" وفا نے پریشان ہو کر کہا۔

"میرا خیال ہے یہ عذر مناسب رہے گا کہ وہ یہاں آ کر پردہ کرنے لگی ہیں!" روشن ہنس کر کہنے لگی۔

"تم ہمیشہ بے ڈھب ہی بولو گی ـــــ صاف کیوں نہ کہہ دو کہ وہ کہتی ہیں میرا آپ سے تعارف نہیں میں اپنی والدہ کی اجازت کے بغیر آپ سے ملاقات نہیں کر سکتی ـــــ!" وفا نے پہلے روشن کو ڈانٹا پھر طیب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ ـــــ کچھ مناسب نہیں لگتا۔ اخلاق کے منافی معلوم ہوتا ہے۔" طیّب سے تذبذب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر میں ٹیلیفون سے اُسے خود یہ کہے دیتی ہوں۔" وفا کہنے لگی۔

"مجھے یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ پھر پرانے ملنے والے ہیں خالہ جان سے گلہ کریں گے۔" طیب کہنے لگا۔

"مگر وفا کا ان سے ملنا قطعاً مناسب نہیں!" اب تو روشن نے بھی مشورہ پیش کیا۔

"میں کب کہتا ہوں کہ ضرور ملیں۔ لیکن عذر کوئی معقول ہونا چاہیئے۔"

"چلیئے میں اور آپ مل لیتے ہیں۔ معقول عذر راستے میں سوچ لیں گے یا عین وقت پر سوجھ جائے گا۔"

روشن کہنے لگی۔ اور اسی تجویز پر اتفاق ہوا۔ روشن اور طیب مہمان سے ملنے چلے ہوسٹل کے فراخ سیلون میں نو وارد ایک صوفہ پر بیٹھا ہوا اخبار دیکھتے ہوئے انتظار کی گھڑیاں گزار رہا تھا۔

"ہیلو لیفٹیننٹ! مزاج بخیر!"

طیب نے اُسے پہچان لیا تھا۔

"اُہو طیب! آپ؟"

نو وارد نوجوان اُٹھ کھڑا ہوا اور حیرت سے کبھی طیب اور کبھی اُس کی ساتھی دوشیزہ کی طرف دیکھنے لگا۔ روشن جو اس وقت عنابی ساڑھی پر سفید لمبا کوٹ پہنے ہوئے خاصی پرکشش نظر آ رہی تھی چہرے پر عجب قسم کی شرارت بھری چمکیلی مسکراہٹ لیے ہوئے ان دونوں کے ملاپ کا منظر دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ نادر چھریرے بدن کا کشیدہ قامت نوجوان تھا۔ چوڑا چہرہ موزوں خدوخال فراخ پیشانی سیاہ چمکیلے بال کھلتا ہوا گندمی رنگ ہلکے نیلے سوٹ کے ساتھ سفید قمیص اور سُرخ ٹائی پہنے وہ وجیہہ اور جامہ زیب نوجوان، مردانہ حُسن وجاہت میں کسی طرح بھی طیب سے کم معلوم نہ ہوتا تھا اور روشن کو خبر نہیں کیا سُوجھی انجانے ہی میں ان دونوں کا موازنہ کر رہی تھی! رسمی پرسشِ احوال کے بعد وہ تینوں قریب قریب بیٹھ گئے۔ طیب نے کنٹین کے ملازم چھوکرے کو جو مہمان کو دیکھ کر خود بخود آرڈر لینے چلا آیا تھا کافی اور بسکٹ لانے کا حکم دیا اور ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ باتوں کے دوران نادر نے بار ہا غلط انداز نگاہوں سے اپنے سامنے بے تکلفانہ انداز سے بیٹھی ہوئی متبسم چہرے والی دوشیزہ

کی طرف دیکھا وہ اب تک اسے وفا درانی سمجھ رہا تھا اور طیب کا اُس کے ساتھ ہونا اس کی امیدوں کے واسطے گھن ثابت ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ کھو سا گیا اور سنجیدگی سے رکی رکی جیسی گفتگو کر رہا تھا۔ طیب نے اُسے اپنے متعلق بتانے کے بعد ہنس کر پوچھا۔

„اور آپ اپنی شانِ نزول کی وضاحت کیجئے؟"

„میں اپنا جہاز لے کر یہاں آیا ہوں۔ چند نئے آدمی ایک مختصر کورس کے لیے آئے ہیں میں ان کا انچارج ہوں۔ مگر ان کی ٹریننگ کے دوران میں فارغ ہوں سوچا چلو اس وقفہ میں سیر ہی کر لیں۔ اور جو جو ہم وطن اس جگہ موجود ہیں اُن سے ملاقات بھی ہو جائے۔" اس نے مختصراً بیان کیا۔

„یہاں کا پتہ آپ کو یقیناً خورشید انٹی نے دیا ہو گا؟" روشن نے ہنس کر پوچھا۔ تو نادر نے چونک کر اُس کی طرف غور سے دیکھا۔

„یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" وہ حیران سا ہو کر پوچھنے لگا۔

„بس ہو گیا معلوم کسی نہ کسی طرح ——— ! کیوں طیب بھیا! اب تو آپ قائل ہو گئے ہوں گے ہماری پیشین گوئی کے؟"

وہ ہنس کر پوچھنے لگی۔ نادر کچھ عجیب استعجاب بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا مگر اس کا طیب سے یہ طرزِ تخاطب صریحاً دلجمعی کا باعث ہوا۔ کہ اس کے چہرے کی اُڑی ہوئی رنگت واپس آ گئی۔ کھویا ہوا تبسم پلٹ آیا۔ اس کی گفتگو میں جان سی پڑ گئی۔ اور وہ خاصی دلچسپ باتیں کرنے لگا۔ کافی پینے کے دوران اُس نے بار بار روشن سے براہ راست مخاطب ہو کر کچھ نہ کچھ کہا۔ اور کافی ختم ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنے دل میں تہیہ کر چکا تھا۔ کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے وہ اس مسکراتی ہوئی آنکھوں والی متبسم لڑکی کو اپنی زندگی کے گلستان کی بہار بنانے

گا۔ وہ گھر جاتے ہی خورشید انٹی کے درپے ہو جائے گا اور اس وقت تک اُن کا پیچھا نہ چھوڑے گا جب تک وہ اُسے اس لڑکی سے ہمیشہ کے لیے وابستہ کر دینے کا مژدہ نہ سنائیں گی ——— !

”یہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہو دوست ؟ افسوس کہ ہم محدودِ ذرائع کے طالب علم تمہیں یہ دعوت تک نہیں دے سکتے کہ ہمارے پاس ٹھہرو۔ ہاں اگر لنڈن میں ٹھہرنا چاہو تو میں تمہیں دعوت دے سکتا ہوں “

طیب نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔ اُسے یہ جوانِ رعنا بے حد پسند آیا تھا اور اپنے دل میں اس کے متعلق ایک خاص فیصلہ کر چکا تھا۔ خصوصاً جب کہ اُس کی بے صبر نگاہوں کو وہ خوب پڑھ چکا تھا۔

”نہیں شکریہ میرے دوست ! ہمیں تو لازماً سینٹر ہی میں ٹھہرنا پڑتا ہے نا۔ رات کو ساڑھے دس بجے ، زیر ترتیب نوجوانوں کی حاضری مجھے خود لینی ہوتی ہے پھر صبح چھ بجے ——— چنانچہ میرا اُن کے ساتھ ٹھہرنا ضروری ہے۔ بہر حال اگر تم اجازت دو تو میں فرصت کے وقت۔ تمہارے ساتھ گزار کر بے حد خوش ہوں گا۔ تم کس وقت فارغ ہوتے ہو ——— ؟ وہ پوچھنے لگا۔

”بس اب فرصت ہی فرصت ہے ——— ہم لوگ فی الحال یونیورسٹی چھوڑ رہے ہیں۔ اور دو ہفتے تک واپس وطن جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ویسے تم لنڈن میں اس پتہ پر جس وقت چاہو آ سکتے ہو ——— ؟“ اُس نے اپنی ڈائری سے ایک کارڈ نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔

”اچھا ——— ؟ تو آپ لوگ جلد ہی پاکستان جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”جی ہاں ! بیگم درانی یعنی وفا کی امّی نے آج ٹیلیفون کیا ہے کہ وہ بیمار

ہیں۔ اور انہیں واپس بلایا ہے؟" طیب نے بتایا۔

"اُہو!" نادر بس اسی قدر کہہ کر کچھ سوچنے لگا۔

"تو آپ یہاں کس چیز میں تکمیل کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں —؟" وہ روشن سے پوچھنے لگا۔

"جی لٹریچر میں —" روشن نے جواب دیا۔

"بڑا افسوس ہے کہ آپ کا شوق ناتمام ہی رہ گیا!" وہ ہنس کر کہنے لگا۔

"جی ہاں — دنیا میں ایسے خوش قسمت بہت ہی کم ہوتے ہیں جن کا ہر شوق پورا ہو جائے۔" روشن نے بھی ہنس کر کہا۔

"تو آپ کی امی جان ایسی کیا علیل ہو گئیں کہ آپ کو واپس بلا لیا۔؟"

وہ پوچھنے لگا اس کا مقصد صریحاً طویل کلام تھا۔

"جی میری امی نہیں —! بھیا نے ابھی آپ سے بیگم درانی کے متعلق کہا تھا۔ وہ میری نہیں وفا کی امی ہیں میری خالہ ہوتی ہیں وہ!" نادر سخت بوکھلایا۔

"تو — تو — کیا آپ ———؟ میرا مطلب ہے یعنی آپ؟"

وہ گھبراہٹ میں اپنا مافی الضمیر ظاہر نہ کر سکا۔ تو روشن بے اختیار ہنس پڑی۔

"طیب بھیا یہ آپ کی غلطی ہے —! آپ کو چاہیئے تھا شروع ہی میں ساری تفصیل بتا دیتے؟"

وہ طیب سے شکایت کرنے لگی۔ اور مسکراتی ہوئی شریر آنکھیں اُس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"اس مقصد کے لیے تم خاص طور پر آئی تھیں یہ تمہیں لازم تھا۔"

طبیب نے ہنس کر کہا۔ کیونکہ نادر کی غلط فہمی خاص پر لطف تھی وہ صریحاً روشن کو وفا سمجھتا رہا تھا۔

"میں عرض کرتی ہوں ــــــ ہوا یہ کہ وفا درانی جن سے آپ ملاقات کی غرض سے تشریف لائے راستہ میں کچھ علیل ہوگئیں اور اس وقت بستر میں تھیں، انہوں نے اپنی بجائے اپنے ان ــــــ یعنی میرا مطلب ہے طبیب بھیا کو جو اُن کے منسوب اور ہونے والے شریکِ حیات قرار پا چکے ہیں معذرت کے واسطے بھیجا۔ ان صاحب کو اپنا تعارف کراتے میں "حجاب" مانع تھا چنانچہ اس مشکل کو آسان کرنے کے واسطے میں ہمراہ آئی۔ کہ ان کی شخصیت کی تصدیق کروں اور آپ کو ثبوت دوں کہ یہ واقعی اپنی منسوبہ کی بجائے اُن کے کسی ملنے والے سے ملاقات کا جائز حق رکھتے ہیں. مگر دیکھا تو آپ بذاتِ خود ان کے دوست نکل آئے تو میرا مشن خود بخود ہی ختم ہوگیا۔ اب مجھے اگر یہ احتمال ہوتا کہ آپ مجھے ہی وفا سمجھنے لگیں گے تو میں جبراً بھی اپنا تعارف پیش کر دیتی۔"

وہ نیم خندہ کیفیت چہرے پر لیے کہتی جا رہی تھی۔ اور نادر نگاہ شوق سے اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔

"اور جو آپ نے ابھی تک نہیں کیا ــــــ!"

نادر اب اپنی الجھن پر قابو پا چکا تھا۔ اور اُسے اپنی اس غلطی یا غلط فہمی پر ذرا بھی پشیمانی نہیں تھی۔ وہ اپنے انتخاب پر خوش تھا اور سوچ رہا تھا۔ کہ ممکن ہے وہ اس کی جگہ وفا کو دیکھتا تو پسند نہ کرتا۔ اس کے استفسار پر روشن طبیب کی طرف دیکھنے لگی، گویا یہ اُس کا فرض تھا۔ کہ تعارف کرائے۔

"یہ روشن آرا بیگم ہیں۔ اعتماد علی کمشنر لاہور کی صاحبزادی ہیں۔ میری اور وفا درانی کی بڑی ہی پیاری بہن ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری اور ہمارے گھر کی رونق ہیں ــــــ! ہنسنا اور ہنساتے رہنا ان کا مشغلہ

ہے ـــــ اور وہ شخص دنیا کا خوش نصیب ترین آدمی ہوگا جس کے گھر کو یہ اپنے معصوم قہقہوں سے نغمہ زار بنائیں گی!" طیب نے مسکرا کر یہ تعارف پیش کیا۔

"طیب بھیا بھی تو کسی موقع پر نہیں چوکتے۔ میں وفا سے آپ کی شکایت کروں گی جا کر!" اُس نے روٹھنے کے انداز میں کہا۔

"کم از کم یہ شکایت نہ کر سکو گی کہ میں نے تعارف میں کوئی کمی چھوڑ دی ـــ!"

اُس نے چشمک کرتے ہوئے کہا تو نادر بے اختیار ہنس دیا۔

"تم کچھ زیادہ بدلے نہیں ہو طیّب تمہاری وہی اسکول کے زمانہ کی سی عادت ہے!" نادر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تمہیں پسند ہوں میں؟" وہ یکدم پوچھنے لگا۔

"تم مجھے شروع سے بہت پسند تھے!" وہ کہنے لگا۔

"اب کی بات کرو!" طیب نے کہا۔

"اب بھی بہت پسند ہو ـــــ میں تو جب بھی تمہیں دیا کرتا مجھے بہت افسوس ہوتا۔ کہ خبر نہیں تم کہاں کھو گئے؟"

"بس تم بھی مجھے بے حد پسند ہو خصوصاً اب۔ اور ہماری دوستی اور ملاقات انشاءاللہ دائمی ہوگی ـــــ! مجھے ایک ایسے دوست کی تلاش تھی جو مجھے بہت چاہتا ہو!"

وہ اس کے ہاتھ کو گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ نادر اس کے طرزِ تپاک پر بے حد خوش ہوا اور آخر رخصت چاہی کیونکہ اُسے شام کی ایکسپریس سے واپس اپنے ٹریننگ سینٹر جانا تھا۔

"وعدہ کرو آؤ گے نا لنڈن کے اُس پتہ پر جو میں نے تمہیں دیا ہے۔؟" طیب نے پوچھا۔

"ضرور! ضرور!" اس نے پرزور وعدہ کیا اور رخصت ہوا۔

(۲۹)

لندن میں ان سب کے یہ آخری دو ہفتے بے حد مصروفیت کے تھے۔ ماں کی علالت کی خبر پاکر گو وفا بے حد مضطرب تھی مگر انتہائی کوشش کے باوجود اس سے کم مدّت میں تیاری مکمل نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر جمیل کو بہت کچھ انتظامات کرنے تھے کہیں پراپرٹی ڈیلروں سے مل کر جائیداد اور مکانات کے متعلق تفہیم حساب کا معاملہ درپیش تھا تو کہیں بنکوں سے انتقالِ حسابات کے متعلق خط و کتابت ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ خرید و فروخت کا مسئلہ درپیش تھا وہ اپنی بہو کے لیے دُنیا کے بہترین ملبوسات و زیورات مہیا کرنا چاہتا تھا جو نادرِ روزگار ہوں علاوہ ازیں اس نے روشن کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا کیونکہ وہی اس کی زندگی میں یہ عظیم انقلاب پیدا کرنے کا موجب بنی تھی۔ وہ اُسے اپنی حقیقی بیٹی کی طرح مکمل جہیز دینا چاہتا تھا اس کے لیے بھی بیش بہا ملبوس خریدے جا رہے تھے۔ اور ان مختلف مصروفیتوں میں وہ دن بھر دوڑا دوڑا پھرتا تھا۔

لندن میں ان کے قیام کے دوران، نادر ہر روز بلا ناغہ آتا اور بعض اوقات تو پورا پورا دن ان کے ساتھ گزارتا۔ اب تو وفا بھی اس سے بے دھڑک ملتی تھی کیونکہ اُسے تسلی ہو گئی تھی۔ کہ اب نادر کا زاویہ نگاہ بدل چکا ہے۔

نادر سے سب کی بے تکلفی ہوئی تو اُس کے قابلِ تعریف اخلاقی پہلو اُجاگر ہوئے۔ اُس نے مختصر ملاقات میں ہی سب کے دل میں گھر کر لیا۔ بشیر اور جمیل بھی اُسے بے حد چاہنے لگے اور جب طیب نے اپنا عندیہ ظاہر کیا تو کوئی اس کے خلاف کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ نادر، روشن جیسی لڑکی کا رفیقِ زندگی بننے کا ہر طرح اہل تھا۔ اور ظاہر تھا۔ کہ خود روشن بھی اُسے پسند کرتی تھی۔

"بھئی ہم نے تو عہد کر رکھا تھا کہ اپنی پیاری بہن کی شادی اُس شخص سے طے کریں گے جو ہمارا جانی اور جگری دوست ہو ـــــ پھر ہم چاروں مل کر ایک ایسا گھر بسائیں جس کے متعلق لوگ کہا کریں۔

"اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است"

روانگی کے دن صبح کے وقت طیب نادر۔ وفا اور روشن آتشدان کے گرد بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ طیب نے بڑے زور و شور سے کہا اس کا فقرہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا کہ عقب میں قہقہوں کی صدا بلند ہوئی بشیر اور جمیل نے طیب کی بات اور اس کے بعد وہ شعر سُن لیا اور ہنسنے لگے۔

"لوگ تو دو مل کر گھر بساتے ہیں اور تم چاروں ہی ایک گھر بساؤ گے؟"

بشیر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ دونوں لڑکیاں شرم سے منہ پھیر کر بیٹھ گئیں مگر طیب اور نادر ہنسنے لگے۔ طیب کا حوصلہ آجکل بہت بلند ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے باپ کا بے حد لاڈلا بیٹا تھا اور باپ نے اس سے کہہ دیا تھا۔ کہ کوئی ایسی خواہش نہ ہوگی جو اس کے دل میں پیدا ہو اور پوری نہ کی جائے۔

"نادر! میرے طیب نے کتنی پیاری تمنا ظاہر کی ہے ——— ! اور انشاءاللہ یہ پوری ہو گی ۔ ! تم دونوں ہمیشہ ایک ہی گھر میں سگے بھائیوں کی طرح رہو گے ۔ روشن کے بغیر زندگی گزارنے کا تو اب ہم لوگ تصور ہی نہیں کر سکتے یہ ہمارے گھر کی رونق ہے ۔ پاکستان جا کر مجھے سب سے پہلا کام یہ کرنا ہو گا، تمہارے والدین سے بھیک مانگ کر تمہیں حاصل کر لوں ۔ پھر تم چاروں کے لیے ایک جنت نظیر مکان بناؤں گا جس کے در و دیوار تمہارے معصوم قہقہوں سے گونجتے رہیں ۔ وہاں زندگی کی خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی ۔ غم والم کا اس چہار دیواری کے اندر کبھی گزر نہ ہو گا ——— اور یوں میرے آخری ایام مسرتوں کی بارش ہی تمام ہوں گے ——— !"

ڈاکٹر جمیل کچھ ایسی عقیدت اور دل کی گہرائیوں سے یہ تمنا کر رہا تھا کہ سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ۔ نادر بے حد متاثر ہوا ۔

"انشاءاللہ ایسا ہی ہو گا انکل! میں تو آپ صاحبوں کا غلام بیدام ہوں ۔ مجھے آپ سب کی بے پایاں محبت نے خرید لیا ہے آپ مجھے تابعداری اور فرمانبرداری میں طیب سے کم نہ پائیں گے ——— !" نادر کہہ رہا تھا ۔

سہ پہر کی فلائٹ سے یہ لوگ پاکستان کے لیے پرواز کر گئے تو نادر عجیب قسم کے جذبۂ مسرت سے لبریز دل سے واپس آیا ۔ وہ اُداس کیوں ہوتا اُس کے تصوروں کو آباد کرنے کے لیے روشن کی مسکراہٹیں کافی تھیں ۔ آج سے تیسرے دن اُسے بھی پاکستان کے لیے روانہ ہونا تھا ۔ صرف دو ہفتے کے بعد وہ بھی ان کے پاس پہنچ جائے گا ۔

(۳۰)

پاکستان پہنچ کر جمیل نے " ہوٹل انٹر کونٹی نینٹل میں رہائش کی یہ لوگ بلا اطلاع آئے تھے اور آسیہ بیگم کو ان کے آنے کی کوئی اطلاع نہ ملی تھی۔ ہوٹل میں چند منٹ آرام کیا اور ٹیکسی منگوا کر جمیل اور بشیر آسیہ بیگم کے ہاں روانہ ہوئے طیب وفا اور روشن کو لے کر بیگم درانی کی خبر گیری کے واسطے گیا۔ یہ لوگ گھر پہنچے تو بیگم درانی بخیر و عافیت تھی۔ وہ سب سے خندہ پیشانی سے ملیں خیریت پوچھی، سفر کا حال دریافت کیا۔ آخر وفا نے قدرے تامل سے گفتگو شروع کی۔

" امی! آپ نے ہمیں واپس کیوں بلا لیا —— ؛ آپ کی صحت تو اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہے؟" وہ ماں سے پوچھنے لگی روشن اور طیب بھی جواب کے منتظر تھے۔

" بیٹی! حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ تمہارا واپس آنا لازمی ہو گیا۔ کیونکہ میں نے تمہیں جس مقصد کے لیے بھیجا تھا وہ مقصد ہی خبط ہو گیا۔"

وہ طیب کی طرف اچٹتی ہوئی سی نگاہ ڈال کر معنی خیز لہجہ میں کہ رہی

تھیں۔

"کیوں ــــــ؟ خالہ جان! یعنی وفا اور طیب بھیا کی نسبت کا معاملہ پھر کسی گڑبڑ میں پڑ گیا؟"

روشن اس کی متحمل نہ ہو سکی کہ اصل مطلب تک پہنچنے میں اشارہ کنایہ کی گفتگو کی وجہ سے تاخیر ہو۔ چنانچہ اُس نے براہِ راست سوال کیا۔

"ہاں بیٹی! صاف لفظوں میں یوں ہی کہنا چاہیے۔ جب ہی تو میں طیب کو تمہارے ساتھ دیکھ کر گھبرائی۔ ان کی امی کو معلوم ہوگا تو وہ ناراض ہوں گی۔ مزید برآں اب جب کہ بات صاف ہوگئی تو مجھے طیب سے یہ شکایت کرنے میں تامل نہیں کہ انہوں نے ہم سے اپنی منگنی کی بات کیوں چھپائی اور ہمیں ایسا غلط قدم اُٹھانے کی ترغیب کیوں دی ــــــ؟" بیگم درانی نے روئے سخن طیب کی طرف کر دیا۔

"خالہ جان! مجھے اپنی امی کے فیصلہ سے نہ اُس وقت اتفاق تھا نہ اب ہے۔ میری زندگی کے اس قدر اہم مسئلہ کو وہ اپنی گھریلو سیاستوں کی نذر کر دینے کا کوئی حق نہیں رکھتیں ــــــ اور اب تو حالات ہی بدل چکے ہیں۔"

اس کے بعد انہیں سارے حالات ان تینوں نے مل جُل کر سنائے

بیگم درانی حیرت زدہ سی بیٹھی ہوئی سب کچھ سنتی رہیں۔

"ماموں جان اور ابو کل صبح آپ کے پاس حاضر ہوں گے۔ اس وقت وہ امی کو سارے کوائف سے آگاہ کرنے گئے ہیں۔ آپ کا پیغام پہنچنے سے پیشتر ہی ہم لوگ تو آنے کے واسطے تیار تھے۔" طیب نے بتایا۔

"حیرت انگیز باتیں ہیں ــــــ! خیر اللہ پاک کو جس وقت کسی کام کو تکمیل تک پہنچانا منظور ہو تو خود بخود اتفاقات مہیا ہو جاتے ہیں میں تو

بے حد دل برداشتہ ہوئی جب میں تمہاری امی یعنی آسیہ بیگم سے ملاقات کے واسطے گئی اور انہیں بتایا کہ میں نے اپنی سابقہ فروگزاشت کی تلافی کے لیے وفا کو طیب کے پاس بھیج دیا ہے اور اب مجھے اس رشتہ کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں تو وہ بے طرح بگڑیں اور مجھے بتایا۔ کہ وہ تمہارا رشتہ تمہارے چچا کی بیٹی سے طے کر چکی ہیں۔ میں بے حد دل برداشتہ ہوئی اور لڑکیوں کو واپس بُلا لیا۔ مگر اللہ کا شکر ہے معاملہ دُرست ہو گیا۔“

وہ لمبا سانس لے کر کہنے لگیں۔ اتنے ہی میں ریشم نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ سب کھانے کے کمرے میں پہنچے، ہنسی خوشی کھانا کھایا گیا۔ اور اسی وقفہ میں طیب نے بیگم درانی کو نادر کی آمد کا سارا واقعہ سنایا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ نادر کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

”یہ عین میرے دل کا منشاء پورا ہوا۔ میں نے اپنے دل میں روشن کی نسبت وہیں ٹھہرانے کا سوچ رکھا تھا۔ بلکہ خورشید اُس دن آئی تو میں نے اُس سے بھی کہا تھا!“

وہ مارے خوشی کے کھل گئیں۔ روشن کو وہ ایسے چاہتی تھیں جیسے وہ انہی کی بیٹی ہو۔ وہ سب کھانے کی میز سے اُٹھے اور باہر لان میں آ بیٹھے جہاں ریشم نے کرسیاں دھوپ میں بچھا کر درمیان میں میز پر موسمی پھل رکھ دیئے تھے۔ اتنے ہی میں ایک کار داخل ہوئی اُسے پہچانتے ہی بیگم درانی ہنس کر بولیں۔

”لو سعدیہ کو خبر نہیں کیسے تمہاری آمد کی خبر ہو گئی۔ بڑی پیاری بچی ہے میرے پاس اکثر آ کر میرا دل بہلایا کرتی تھی:“

”سعدیہ؟“

طیب نے حیران ہو کر پوچھا۔ مگر یک دم چُپ ہو گیا اُس نے سوچا اس نام کی کئی اور لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔ سعدیہ نے جب سے یونیورسٹی کیمپس میں داخلہ

لیا تھا برقعہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہلکا لباس پہنے ہوئے اُتری مگر طیب کو دیکھ کر وہیں ٹھٹک گئی۔ لیکن وفا اور روشن نے اس کے تذبذب کو محسوس نہ کیا کیونکہ وہ تو اس کے اُترنے سے بھی پہلے وہاں اُس کی پذیرائی کے لیے پہنچ چکی تھیں۔ جب وہ اُتری تو طیب نے اُس کی ایک ہی جھلک سے پہچان لیا۔ کہ وہ اُس کی بچپن کی منسوبہ ہی ہے اگرچہ اُس نے سعدیہ کو بہت چھوٹی عمر میں دیکھا تھا۔ تاہم وہ اُس کے چشم آشنا چہرے کو بھولا نہیں تھا۔

"اگر پردہ نہیں کرتی ہو تو چلو وہیں باہر بیٹھو!" روشن اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

"نہیں اندر ہی بیٹھتے ہیں وہاں تو ——" وہ کچھ محجوب سی ہو کر بولی۔

"ارے —— ؟ تو کیا وفا کے ہونے والے شوہر سے پردہ کرو گی؟" روشن نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"کیا —— ؟ یہ —— یہ؟"

سعدیہ کی آواز جیسے حلق میں اٹک گئی اور ادھر طیب، بیگم درانی سے گھر جانے کی اجازت لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں ہاں۔ جاؤ تمہاری امی انتظار میں ہوں گی —— بہر حال امی تو وہی ہیں نا انہوں نے ماں کے سارے فرائض ادا کیے ہیں۔"

وہ کہنے لگیں۔ اور طیب مسکرا کر سلام کرتا ہوا رخصت ہوا۔

"روشی! میں کل آؤں گا ماموں جان اور ابو کے ہمراہ! خدا حافظ!" وہ بلند آواز سے کہتا ہوا نکل گیا اور تینوں لڑکیاں بیگم درانی کے پاس آ گئیں۔

سعدیہ، طیب کے منہ سے "ابو" کا لفظ سُن کر سخت حیران ہوئی کہ اپنی

حیرت پر قابو نہ پا سکی۔

"ان کے والد تو فوت ہو چکے ہیں ___ یہ راؤ نیاز احمد کے بیٹے ہیں نا؟" وہ آہستہ سے روشن سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں ___ ! یہ در حقیقت ___ خیر یہ لمبا قصہ ہے پھر کسی وقت سناؤں گی، مختصر یہ کہ ان کے حقیقی والد زندہ ہیں۔ انہیں راؤ نیاز کی بیگم نے کسی سے لے کر پالا تھا اور جائیداد کی خاطر ظاہر یہ کیا تھا کہ یہ اُنہیں کا بیٹا ہے!" روشن نے کچھ نہ بتاتے ہوئے بھی سب کچھ بتا دیا۔

"تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ وفا اور روشن آگئی ہیں ___؟" بیگم درانی پوچھنے لگی۔

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ___ ! میں نے رات خواب دیکھا کہ ہم بالکل یوں ہی اس جگہ بیٹھے ہیں جیسے اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں ہیں نے صبح ٹیلیفون کیا ریشم نے بتایا۔ کہ آئی ہوئی ہیں میں نے اسے منع کر دیا کہ بتانا نہیں میں اچانک پہنچنا چاہتی ہوں۔"

سعدیہ وفا کو بے حد چاہتی تھی۔ اُس نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُسے طیب سے کوئی واسطہ ہے۔ اگرچہ اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا مگر وہ ضبط کیے بیٹھی رہی اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور وہ کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی آئی۔

بعض اوقات عجیب و غریب طریقوں سے باتیں ملازموں کے ذریعہ سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ڈرائیور نے طیب کو وہاں دیکھا تو چوکیدار ڈرائیور اور مالی وغیرہ سے ذکر کیا۔ کہ یہ صاحب ہماری صاحبزادی کے منسوب ہیں۔ چوکیدار نے ریشم سے ذکر کیا اور ریشم نے بڑی بیگم کے کان میں پھونک دیا۔ انہوں نے روشن کو بلا بھیجا اور کہنے لگیں۔

"کچھ اور بھی سنا؟ یہ سعدیہ تو طیب کی منسوبہ ہے!" اور انہوں نے ساری روداد سنائی۔

"اچھا —— ؟"

روشن متحیر سی ہو گئی۔ مگر پھر اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔

"یہ اُن کا گھریلو معاملہ ہے جیسے کیسے بھی طیب خود نپٹ لے گا، ہمیں کیا —— ؟"

لیکن ریشم نے وفا تک بھی یہ بات پہنچا دی۔ روشن بیگم درانی سے تاکید کر کے آئی کہ وفا کو معلوم نہ ہونے پائے مگر اُس نے آکر دیکھا تو وفا کا رنگِ رُخ متغیر تھا۔

"تم نے کچھ سُنا روشی؟ یہ ریشم کیا کہہ رہی ہے؟" اس نے رنج و اندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا کہہ رہی ہے —— ؟ اِس کٹنی ریشم کے پیٹ میں کوئی بات جو ٹھہر جائے! بس اُگل کر سانس لیا! بدبخت کہیں کی!" روشن بڑبڑانے لگی۔

"تو تمہارا کیا عندیہ تھا کہ مجھ سے چھپا جاتیں اور ایک معصوم پر ظلم ہو جاتا؟" وفا نے گلوگرفتہ آواز میں کہا۔

"تو اب کیا ارادہ ہے —— ؟" روشن نے عاجز آکر کہا۔

"بس مجھے معلوم ہے کہ قدرت کو میرا اور طیب کا ساتھ منظور نہیں روشن! جو ہو سو ہو میں اپنی جان دے سکتی ہوں مگر ایک معصوم لڑکی پر ظلم روا نہیں رکھ سکتی۔ خصوصاً اس صورت میں کہ میں اُسے اپنی دوست کہہ چکی ہوں۔ مجھ سے دوست کُشی نہیں ہو سکتی، محبت کی بارگاہ میں یہ قربانی مجھ سے نہ دی جائے گی —— !"

وہ رو رو کر کہنے لگی۔ روشن بھی دم بخود تھی اس معاملہ میں اُس کے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ وفا نے پختہ عزم کر کے سعدیہ کو ٹیلیفون پر بتایا

"سعدیہ! تمہارے جانے کے بعد مجھ پر ایک حقیقت کھلی —— تم نے

بے حد نادانی کی۔ کہ مجھ سے چھپایا۔ اب مجھے خیال ہوتا ہے کہ تم یک بیک مُرجھا کیوں گئیں تمہارا اشتیاق اور مسرت یک دم ماند کیوں پڑ گئے تھے۔ ——؛ میری ننھی سی بہن! تم نے مجھے کیا اتنا ہی کم ظرف خیال کیا کہ میں جسے دوست کہہ چکی اُس کا حق غصب کروں گی ——؛ تم ذرا بھی پریشان نہ ہونا طیب بہر حال تمہارا ہے۔ بزرگوں کے فیصلے ہمیشہ فائق ہونے چاہئیں —— ہوں —— ؛ کیا کہتی ہو —— ؛ کیا سچ کہہ رہی ہو —— ؛ ہیں ؛ کیا قسمیہ کہہ سکتی ہو کہ یہ رشتہ تمہیں پسند نہیں ؟ ہوں —— ؛ کیا سچ ؛ اچھا تو کیا خیال ہے تمہارے والد مان جائیں گے ؛ اچھا خدا تمہاری تمنا بر لائے —— !

وفا نے ٹیلیفون چھوڑا تو اُس کا متغیر رنگ پھر عود کر آیا تھا۔ جسے دیکھ کر روشن کی بھی جان میں جان آئی۔

"ہوں —— تو میں بھی سنوں کیا قصہ ہے۔ کیا کہیں اور دل لگا رکھا ہے صاحبزادی نے ؛ وہ پوچھنے لگی۔

"کہتی ہے کہ عام حالات میں یہ لفظ قیامت تک بھی اُس کی زبان پر نہ آ سکتے مگر میری تسلی کے لیے اُسے یہ راز کھولنا پڑا وہ اپنے ایک کلاس فیلو کو پسند کرتی ہے اور طیب سے شادی پر کبھی رضامند نہ ہو گی اُس لڑکے کے والدین عنقریب سعدیہ کے باپ سے مل کر تصفیہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بتا رہی تھی کہ اب حالات اور ہیں جب گھر میں طیب کی ولدیت کا سوال اُٹھے گا تو یقیناً یہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔ وہ ابھی اپنی ماں سے ذکر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

وفا نے سعدیہ سے گفتگو کا لب لباب بتایا۔ تو روشن ہاتھ جوڑ کر شکرانہ کہنے لگی۔

"الٰہی تیرے رحم و کرم کا کہاں تک شکر ادا کیا جائے ؛ کیسی کیسی بلائیں

آتی ہیں جنہیں تو اپنی رحمت سے ٹال دیتا ہے۔ تو اپنے فضل وکرم سے مجھے وہ دن دکھا دے۔ کہ میری وفا اور میرے طیّب بھیّا کی شادی بخیر وخوبی انجام پا جائے ؛

وہ آنکھیں بند کیئے بڑی عقیدت سے دُعا مانگ رہی تھی اور وفا جس کے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا تھا محبّت بھری مسکراتی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

(۳۱)

صدیقہ بجلی کی طرح کڑکتی سارے صحن میں یوں گھومتی پھر رہی تھی جیسے اُسے بچھو نے ڈنگ لیا ہو۔

"ایاز ــــ! جاؤ اپنے باپ کو بلا کر لاؤ! دیکھو یہ لڑکی نے مجھے آج کیا قصہ سنایا ہے ــــ؟ ارے حد ہو گئی! اس کٹنی عورت نے ہمارے ساتھ ایسا چھل کیا اور ہم عمر بھر اندھے بنے رہے۔ وہ حرافہ ہمیں یوں جُل دے کر ہمارا حق ایک حرامی لڑکے کو کھلاتی اور دھول کی طرح اڑاتی رہی ــــ

ہا ہا! ایسا دھوکہ! ایسا فریب کبھی دیکھا نہ سُنا ــــ!"

وہ چیختی چلی جاتی تھی۔ ایاز، فیاض اور ریاض اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے عتیقہ اور عائشہ بھی نکل آئیں۔

"کیا ہوا چچی جان؟" عتیقہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہوتا کیا خاک؟ تم دونوں بھی آستین کا سانپ بنی بیٹھی رہیں اپنے شوہروں کا حق تلف ہوتے دیکھتی رہیں۔ اپنے ہی خاندان کی عزت کو ایک حرامی کے ساتھ پھوڑنے کا تماشہ دیکھنے کی منتظر رہیں وہ تو خدا نے کچھ غیب سے سامان مہیا کر دیا۔ کہ بھانڈا پھوٹ گیا ــــ!"

فرطِ غیظ و غضب سے اُس کے منہ سے کف اُڑ رہی تھی سب ڈرے اور سہمے ہوئے کھڑے تھے یقیناً یہ سمجھ رہے تھے کہ اُن کی ماں کا دماغ پھر گیا ہے۔ اتنے ہی میں ریاض باپ کو ساتھ لیے ہوئے داخل ہوا۔

“کچھ سُنتے ہو بدھو میاں! تم نے تو دھوپ میں سر سفید کر لیا۔ وہ عورت ہو کر تمہیں کیسے چھل گئی۔ حرامی لڑکے کو تمہارا داماد بنا دیتی وہ تو کہو قسمت نے مدد کر دی ——!”

“ارے ہوا کیا ہے؟ کیا واہی تباہی بکے جا رہی ہو؟”

وہ حیرت سے منہ کھولے بیوی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ لڑکوں نے پکڑ دھکڑ کر کے ماں کو ٹھنڈا پانی پلایا اور چارپائی پر بٹھا کر صحیح کیفیت آرام اور سکون کے ساتھ بیان کرنے کی استدعا کی۔ صدیقہ نے پھولے ہوئے سانس اور گالیوں کے طوفان کے ساتھ سعدیہ سے سنی ہوئی بات کو دوہرایا۔

“اب وہ ولایت سے اپنے اصلی باپ کو ساتھ لے آیا ہے ڈھونڈ کر! اور اپنی مرضی سے شادی کرنے لگا ہے سعدیہ کی کسی پروفیسر کے ساتھ۔! میں تو جا کر اس کٹنی آسیہ کا چونڈا کھسوٹ نہ لوں تو نام صدیقہ نہیں! اُس نے ایسی چالاکی سوچی کہ کیا کوئی حرافہ سوچ سکے گی —— اور ان چھنالوں کو دیکھو جو میرے گھر بہوئیں بن کر نمک حرامی کرتی رہیں۔ اتنا بڑا راز کیسے پیٹے رہیں!”

“چچی جان! قسم لے لیجئے جو ہمیں اس سلسلہ میں کچھ بھی معلوم ہو۔ کبھی شبہ تک نہیں ہوا کہ کوئی ایسی بات ہے۔ چچا جان خود جا کر احوال دریافت کریں کہیں سعدیہ کو کچھ غلط فہمی نہ ہوئی ہو؟”

عتیقہ نے جرأت کر کے کہہ دیا۔ مگر اعجاز کچھ کہتے ہی کو تھا۔ کہ ڈیوڑھی پر چوکیدار نے مہمانوں کے آنے کی خبر دی۔ ایاز باہر گیا اور واپس آکر ماں کو پردہ میں چلے جانے کو کہا۔ وہ برآمدہ میں چلمن کے پیچھے ہو گئی۔

"تائی امی کے دونوں بھائی اور طیب آئے ہیں" ایاز نے اطلاع دی۔

"تو وہ کٹنی خود نہیں آئی کہ میں ذرا اُس کی خبر تو لیتی؟" چق کے پیچھے کھڑی ہوئی صدیقہ بول اٹھی۔

"تم چپ رہو جی! اب اُن لوگوں کے سامنے کچھ ایسی ویسی باتیں نہ کہنا۔ ایاز میں تو کہتا ہوں انہیں مردانہ ڈرائنگ روم ہی میں بٹھاتے" اعجاز کہنے لگا۔

"ابو! وہ لوگ اب اس ڈیوڑھی میں کھڑے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے سگے ماموں ہیں کہیں گے ہم سے پردہ کروایا ہے!" ایاز کہنے لگا۔

"اچھا جاؤ لے آؤ ـــــ ریاض تم کرسیاں نکلواؤ!"

اعجاز نے بیٹے سے کہا۔ اُس نے کرسیاں نکلوا کر صحن ہی میں بچھوا دیں ایاز مہمانوں کو لیے ہوئے داخل ہوا۔ اعجاز نے آگے بڑھ کر خیر مقدم کیا لیکن طیب کو کچھ خاص چاہت سے نہ ملا۔ عتیقہ اور عائشہ نے آ کر سلام کیا پھر اندر چلی گئی۔

"اعجاز صاحب! ہم چند حقائق آپ کے گوش گزار کرنے آئے ہیں" بشیر کہنے لگا۔ اُس نے کسی التوا یا تمہید کی ضرورت نہ سمجھی اور براہِ راست بات شروع کی۔

"شوق سے فرمائیے میں ہمہ تن گوش ہوں!"

اعجاز نے متانت سے کہا۔ اس پر جمیل نے سارے واقعات بالترتیب بیان کر دیئے۔

"عجیب قصہ ہے! لیکن بھائی نے ہمیں صریحاً دھوکا دیا! انہیں قانوناً اور اخلاقاً ایسا کرنا واجب نہیں تھا۔ یہ دھوکا دہی کیا کی ایک ایسی واردات ہے جو قانونی زد میں آ سکتی ہے" اعجاز کے تیور یک دم بدل گئے۔

"خیر اب اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے جب کہ ہم لوگ اسی

غرض سے آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپس میں مناسب تصفیہ ہو جائے یہ لیجئے راؤ نیاز احمد کی جائیداد کی دستاویزیں اور تمام متعلقہ کاغذات یہ آپ کی دولت ہے اسے سنبھال لیں، ماسوا آپا آسیہ بیگم کے اندرون شہر والے مکان اور دو مربع زمین کے جو اس کے حق مہر میں ہے —— آپ کی تسلی کے لیے یہ دستاویز ساتھ ہے ملاحظہ فرمائیں ——"

یہ کہہ کر ڈاکٹر جمیل نے ایک کاغذ کھول کر اعجاز کے سامنے میز پر پھیلا دیا۔ جسے اُس نے بڑے غور سے پڑھا۔

"ٹھیک ہے ——" اعجاز نے بے اعتنائی سے کہا۔

"طیب واقعی آپ کا جائز بیٹا ہے؟" کچھ وقفہ کے بعد اعجاز نے پوچھا۔

"جی ہاں —— مجھے معلوم تھا کہ ایسا سوال اُٹھ سکتا ہے چنانچہ میرے پاس قانونی سارٹیفکیٹ موجود ہے۔ یہ ملاحظہ فرمائیے۔ طیب کی والدہ کے ساتھ میری کورٹ میں باقاعدہ شادی ہوئی۔"

جمیل نے ایک اور بوسیدہ جیسا کاغذ نکال کر دکھایا جسے اعجاز نے غور سے پڑھا۔

"تو اس صورت میں مجھے اسے فرزندی میں لینے سے انکار نہیں میں سعدیہ سے اس کی نسبت کو بحال رکھتا ہوں اور جلد شادی کر دینا چاہتا ہوں۔" اعجاز نے کہا۔

"یہ آپ کی انتہائی شفقت کی دلیل ہے۔ مگر میں اس کی شادی اپنے طور پر کہیں اور طے کر چکا ہوں۔" جمیل نے بے حد لجاجت سے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے ——؟ اس کی نسبت پیدائش کے وقت میری بچی سے طے پا چکی ہے یہ میری سراسر توہین ہے کہ آپ یہ رشتہ توڑ دیں۔"

اعجاز نے ذرا تلخ ہوتے ہوئے کہا۔ اب تو ذرا صدیقہ کو بھی ہوش آیا وہ اعجاز کی چال کو سمجھ گئی تھی۔ طیب اب جمیل کی بے انداز دولت کا مالک تھا۔ اور یہ اس حریص شخص کے لیے کچھ تھوڑی سی کشش نہ تھی اتنے ہی میں فیاض آیا۔

"ماموں جان! امی آداب عرض کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آپ کو یہ خیال ہی کیسے آیا کہ طیب کی شادی کہیں اور طے ہو سکتی ہے؛ ہمارے ہاں نسبت توڑنا بے حد بدنامی کا باعث ہوتا ہے کہتی ہیں یہ کبھی نہ ہوگا۔" فیاض نے پیغام دیا۔

"ہماری طرف سے دعا ہے۔ بھابی جان! مگر یہ بچوں کی زندگی کا سوال ہوتا ہے اس میں ان کی مرضی اور خوشی کو بھی ضرور مدنظر رکھنا لازم ہے۔ آپ صاحبوں نے جو محض اپنی خوشی کے لیے دو بالکل چھوٹے بچوں کو اس بندھن میں باندھ چھوڑا تو یہ نہ سوچا کہ بڑے ہو کر آخر یہ صاحبِ فہم و فراست ہوں گے تو ایسا اندھا دھند انتخاب کیسے قبول کر لیں گے جس میں ان کی اپنی مرضی کو کوئی دخل نہیں۔" جمیل نے دانشمندانہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے نہایت نرم اور خلیق لہجہ میں کہا۔

"خیر صاحب! آپ کے خیالات پر تو مغرب کا صیقل چڑھا ہے ہم لوگ ابھی تک مشرق کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم ابھی تک اس مقولہ کے قائل نہیں ہو سکے کہ شادیوں میں لڑکی لڑکے کی آزاد رائے کو دخل ہو اور بزرگ لاتعلق ہو کر ایک طرف بیٹھ جائیں۔" اعجاز نے برافروختہ ہو کر کہا۔

"میرے عزیز! میں لڑکے کو مجبور نہیں کر سکتا —— یہ اپنی مرضی کا انتخاب کر چکا ہے۔" جمیل نے بدستور لجاجت سے زیرِ لب کہا۔

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ لوگ اس مقصد کے لیے کہ ہماری توہین کریں، یہاں آئے تھے! وہی بات ہوئی کہ "بیٹھوں تیری گود میں اور پھوڑوں

تیرا دیدہ! گھر آکر ہمارے منہ پر جوتیاں ماری جا رہی ہیں۔

؛تم لوگ آسیہ بیگم کو ساتھ لائے ہوتے تو میں خود ہی اس سے بات کر لیتی، کیا اسی دن کے لیے اس نے منہ پھاڑ کر یہ رشتہ مانگا تھا کہ مطلب پورا ہو جائے پر وہ یوں ہمیں ذلیل کر کے جواب دلوا بھیجے گی؟

چق کے پیچھے سے صدیقہ کی گرج دار آواز سنائی دی تو جیسے سناٹا سا چھا گیا ——

”محترم اور عزیز بہن! میں آداب عرض کرتا ہوں۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میں عمر میں پہلی مرتبہ آپ کے دولت کدہ پر آیا تو کوئی خوشگوار مسئلہ لے کر نہ آسکا عرض یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی نہایت ہی رنجیدہ اور ناگوار حالات میں بسر کی ہے۔ آخر عمر میں کچھ سکون چاہتا ہوں جو مجھے اسی صورت میں میسر آسکتا ہے کہ میں طیب کو خوش و خرم دیکھوں میں نہیں چاہتا کہ چند بر خود غلط خاندانی حالات کی بنا پر لڑکے کی زندگی تلخ کر دوں اور اپنے آخری دنوں کا آرام اور سکون بھی پھر اپنے ہی ہاتھوں تباہ کر ڈالوں —— لہٰذا میں قطعاً مجبور ہوں آپا آسیہ بیچاری کا اس میں ذرہ بھر قصور نہیں بلکہ وہ بھی اسی بات پر مصر ہیں کہ طیب کی شادی یہیں ہو۔“

جمیل کی گفتگو کے دوران ملازم چھوکرے نے ایک رقعہ لا کر اعجاز کو دے دیا۔ جسے پڑھتے پڑھتے اس کی تیوری پر بل پڑ گیا نتھنے غصے کی شدت سے پھڑکنے لگے۔ اور وہ اٹھ کر اندر بیوی کے پاس آیا۔

”تم نے خواہ مخواہ کا مخمصہ کھڑا کر رکھا ہے؟ پہلے اپنی صاحبزادی کو تو سنبھالو۔ ایم۔ اے تک پہنچ کر اس کا بھی دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ پڑھو کیا لکھتی ہے ——!“

اعجاز نے کاغذ کا پرزہ صدیقہ کے ہاتھ میں ٹھونس کر غصہ بھری مگر دبی آواز میں کہا۔ لکھا تھا۔

"ابو جان! میں خود اس رشتہ کو پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو یہ ضد چھوڑ دیں۔ طیب کے والد ٹھیک کہتے ہیں عمر بھر کے اس ساتھ کے واسطے واقعی خود طرفین کے انتخاب کو فائق سمجھنا چاہیئے۔ اگر آپ کو نہیں تو مجھے اس شادی سے انکار ہے۔"

"سعدیہ"

"میں اس بدلگام چھوکری سے سمجھ لوں گی ـــــ تم بھیجو ان لوگوں کو جلدی اپنا کالا منہ لے کر چلے جائیں یہاں سے ورنہ ایسا نہ ہو میں گالیاں سنا کر نکالوں۔" وہ غم و غصہ سے کانپتے ہوئے بولی۔ اور اعجاز باہر نکل گیا۔

"اچھا صاحب! بس آج سے ہمارا آپ کا تعلق ختم ہونا ہے۔ ان لڑکوں کی مرضی ہے یہ آپ سے ملیں یا نہ ملیں میں ان پر جبر نہیں کر سکتا۔ جب تک ماں کا دم ہے ان کی بیویاں اُسے چھوڑ نہیں سکتیں رہے ہم میاں بیوی تو ہمارا ہمیشہ کے لیے قطع تعلق ہے ـــــ خدا حافظ!"

اس گفتگو کے درمیان ہی تینوں مہمان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ طیب نے ایک سوٹ کیس ریاض کی طرف بڑھاتے ہوئے زیرِ لب کہا۔

"اس میں چند تحائف ابو آپ سب کے لیے لائے تھے باجی کو دے دینا وہ خود ہی نام بنام سب کو دے دیں گی۔" مگر ریاض نے تامل کرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہے ـــــ؟ نہیں نہیں ہمیں کچھ نہیں لینا جب تعلق ہی ختم ہو گیا۔" اعجاز نے گلوگیر جیسی آواز میں کچھ کہنا چاہا مگر صدیقہ کی گونجدار آواز میں اُس کا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا۔

"ہمیں کیا واسطہ؟ بھانجیوں کے لیے لائے ہوں گے۔ تم کیوں دخل دیتے ہو؟"

یہ ڈانٹ سن کر اعجاز چپ ہو گیا۔ عتیقہ اور عائشہ ماموں کو رخصت کرنے کے لیے باہر نکل آئیں روتے روتے دونوں کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ جمیل کو اُن پر بڑا ترس آیا۔

"تم نے مجھے اپنے بچوں سے بھی نہیں ملوایا آج شام تم اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ تمنا تو یہ ہے کہ بھائی اعجاز اور بھابی بھی آتے مگر وہ میری درخواست قبول نہ کریں گے۔ اگر کرلیں تو احسان مند ہوں گا اور میری خوشی چہار چند ہو جائے گی۔ کہ ؎

بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر"

وہ عائشہ اور عتیقہ دونوں کو بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہہ رہا تھا پھر اُس نے اپنی جیب سے چیک نکالے اور میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ رنج میرے دل میں ہمیشہ رہے گا کہ میں تمہاری شادیوں میں شریک نہ تھا۔ اس میں نصف رقم تمہارے شوہروں کی سلامی کی ہے اور نصف تمہارے جہیز کی ـــــ سعدیہ کو بھی میں تم سے کم نہیں چاہتا کیونکہ تمہاری ماں اُسے بیٹیوں کی طرح چاہتی ہے اللہ پاک اُسے صاحب نصیب کرے اور زندگی کی مسرتیں اُس کے قدم چومیں۔ یہ حقیر سی رقم میری طرف سے اُس کی شادی کا تحفہ ہے۔ جب تک زندہ رہوں گا اُسے تمہارے برابر ہی سمجھوں گا ـــــ"

جمیل نہایت موثر لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ خلوص میں واقعی بڑی طاقت ہے اور کسی نے سچ کہا ہے کہ

"بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"

نہ صرف اعجاز بلکہ خود صدیقہ جیسی کٹھور اور خود غرض عورت بھی متاثر ہوئی۔ لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اعجاز نے دیکھا۔ کہ دس ہزار کے تین چیک میز پر رکھے تھے۔

"اچھا خدا حافظ اعجاز بھیا! ہمیں آپ سے شکایت ہے کہ ہم ایک مدت کے بعد وطن آئے تو آپ نے ہمیں دل سے خوش آمدید بھی نہ کہا اور یہ شکایت اس صورت میں رفع ہو سکتی ہے کہ بچوں کے ساتھ معہ سعدیہ کے آپ دونوں بھی آئیں۔ اور آج شام کا کھانا میرے ساتھ "ہوٹل انٹر کونٹی نینٹل" میں کھائیں۔"

جمیل نے آگے بڑھ کر اعجاز کو گلے سے لگایا تو اس نے تعرض نہ کیا۔ انتہا تو یہ ہے کہ صدیقہ تک کی زبان بند ہو گئی۔ اور مہمان رخصت ہوئے طیب کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بوجھل طوق اس کے گلے سے اُتار لیا گیا ہو؟

(۳۲)

شہر کے ایک فیشن ایبل اور پر فضا حصے میں ایک عدیم النظیر بنگلہ تھا جو طائرانہ نگاہ سے یوں نظر آتا تھا جیسے زمرد کے طشت میں ایک سنگِ مرمر کا کھلونا آرائش کے لئے رکھ دیا گیا ہو ! خوش قطع عمارت کے گرد و پیش خوش فضا چمن تھا۔ چاروں طرف سر سبز لان تھے جن کی تراشی ہوئی ہموار اور دبیز گھاس پر کاشانی قالینوں کا گمان ہوتا تھا۔ سامنے رُخ کے وسیع لان کے چاروں طرف سرو کے ملیے درخت تھے جا بجا پھُولوں کے بوقلموں خیابان تھے۔ قسم قسم کے گلاب سے لدے ہوئے کلین تھے۔ چاروں طرف کے لانوں میں متعدد فوارے نصب تھے۔ جن کے قریب بڑے بڑے "کینوپی" لگے تھے ان کے نیچے کرسیوں کے درمیان تپائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پختہ روشوں کے دو رویہ سنگین گملوں میں بڑے بڑے پام لگے تھے۔ بنگلے کے عقب میں پھل دار درختوں کا ایک بہت وسیع باغ تھا۔ جس میں ہر قسم کے موسمی پھلوں کے پودے موجود تھے۔

یہ جنت نظیر بنگلہ شہر کے مشہور ڈاکٹر جمیل احمد کنور اور ان کے بیٹے طیب جمیل کنور کی رہائش گاہ ہے۔ طیب اس وقت شہر کے مشہور و معروف قانون

دانوں میں شمار ہوتا ہے۔ باپ بیٹے کی شہرت کا آفتاب نصف النہار، ساتویں آسمان پر ہے لوگ ان کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ اور ان کی دوستی پر فخر!

وسط مارچ کی ایک پر بہار شام تھی۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا اس کی نارنجی کرنیں فضا میں گلال بکھیر رہی تھیں۔ نارنگی کے پھولوں کی مسحور کن خوشبو نے سحر کا سا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ انار کے جھاڑ سبز اور گلناری لباس میں لدے ہوئے دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ آلوچے کے نازک پھولوں کی پتیوں کو بادِ بہاری کے سبک خرام جھونکے اپنے ساتھ اڑائے لیے جاتے تھے اور ہر طرف جیسے پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔

بنگلے کے سامنے لان میں ایک معمر خاتون کرسی پر بیٹھی تھی اس کے قریب دو بچے کھیل رہے تھے۔

"دادی جان! دیکھئے یہ سکندر ہمارا لٹو نہیں دیتا!" بچے نے شکایت کی۔

"چھوٹا بھائی ہے جانی! کوئی بات نہیں، آپ کے پاس اور کھلونے بھی تو ہیں۔" خاتون نے پیار سے چمکارتے ہوئے کہا۔

"طاہر بھائی بڑے ہیں نا دادی جان! ہمیں کچھ نہیں دیتے؟ یعنی طاہر بھائی بڑے ہیں نا دادی جان یہ ہمیں کچھ نہیں دیتے؟" چھوٹا بچہ لبسور کر بولا۔

"نہیں طاہر بھائی بھی بڑے پیارے ہیں آپ بھی بہت اچھے بچے کبھی نہیں لڑتے ہمیشہ مل کر کھیلتے ہیں۔" خاتون نے اُسے بھی پیار سے کہا۔

"آج تمہارے ابو آرہے ہیں بہت سے کھلونے لائیں گے تمہارے لیے۔" طاہر نے سکندر سے کہا۔

"آہا جی! ابو آئیں گے!"

سکندر تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگا۔ اتنے ہی میں برآمدہ کی سیڑھیوں پر ڈاکٹر جمیل نظر آئے اُن کی گود میں ایک نہایت خوبصورت بچی تھی۔ جو جھالروں والے پھولے پھولے سے فراک میں بالکل گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اس سے پیار کرتے اور توتلی زبان میں باتیں کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ کہ دوسری طرف کے برآمدہ سے نرس کرسی پر کسی مریض کو لیے ہوئے اس طرف آئی جہاں خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔

”آپا ! خدا کے لیے ان بھائی جان کو کچھ سمجھائیے یہ میری تو ایک نہیں سنتے !“ ڈاکٹر جمیل نے مریض کی شکایت کی۔

”دیکھو آسیہ ! یہ جمیل کیسا سفاک قسم کا ڈاکٹر ہے۔ آج کے دن جب کہ سب عزیز جمع ہونے والے ہیں یہ مجھے کمرے ہی میں مقید رکھنا چاہتا ہے۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ میں بھی سب میں بیٹھ کر ہنسوں بولوں یہ مجھے زندہ درگور ہوئے رہنے کی ہدایت کرتا ہے !“ بوڑھے آدمی نے جو بشیر تھا فریاد کرتے ہوئے کہا۔

”آپ میں دل ہے ہی کہاں جو چاہتا ہے ؟ دل کو تو آپ نے اپنی بدپرہیزیوں کی نذر کر چھوڑا ہے۔“ ڈاکٹر نے واقعی غصہ سے کہا۔

”بلا سے نہ ہو۔ مگر میں تو زندگی کے باقی دن تمہاری پابندیوں سے آزاد رہ کر گزارنا چاہتا ہوں، بچوں سے تم نہیں کھیلنے دیتے سب میں آ کر بیٹھنے سے تم منع کرتے ہو لو بھئی اب میں کمرے ہی میں پڑا سڑتا رہوں۔ بخدا تمہیں تو ڈاکٹر نہیں جیلر ہونا چاہیئے تھا۔“

بیچارہ بوڑھا بشیر عجیب بے بسی کے عالم میں ڈاکٹر سے لڑ رہا تھا وہ ہنسنے لگے اور بھائی کے گلے میں بازو ڈال کر بولے۔

”قبلہ ! یہ سب اسلیئے ہے کہ ہمیں ابھی آپ کی بے حد ضرورت ہے۔ آپ سب میں بیٹھتے ہیں تو بھول ہی جاتے ہیں کہ آپ کے لیے پرہیز علاج

سے زیادہ ضروری ہے۔ کھانے کی کوئی چیز کیسی ہی مضر ہو فوراً آپ کو اپنے دانت یاد آجاتے ہیں اور حکم صادر ہوتا ہے۔

"ارے کوئی ہے؟ لانا میرے دانت!"

اس بات پر بشیر اپنا پوپلا منہ کھول کر بے اختیار ہنسنے لگا۔

"تمہاری وہی باتیں رہیں۔ بوڑھے ہو گئے پوتے کھلانے لگے مگر باتیں وہی! لاؤ صبیح کو مجھے دے دو —— آؤ منی بٹیا میرے پاس؟"

وہ جمیل کی گود سے بچی کو جس کا نام صبیح تھا لیتے ہوئے پیار کرنے لگا اتنے ہی میں ایک کار ڈرائیور پر نظر آئی پورٹیکو میں ٹھہری تو اعجاز صدیقہ اور ان کے ساتھ بہویں اور ان کے بچے اترے۔ آسیہ بیگم اور جمیل ان کے خیر مقدم کے واسطے بڑھے ہی تھے کہ بیگم درانی کی کار گیٹ میں نظر آئی۔ ان کے ساتھ ریشم بھی تھی۔ بیگم درانی اپنے نواسے طاہر اور ننھی سی گڑیا جیسی نواسی "صبیح" کو بے حد پیار کرتی تھیں اور دن میں ایک بار ضرور آکر انہیں دیکھتی تھیں سارے مہمانوں کو باہر لان ہی میں بٹھایا گیا۔ لیکن خنکی ہو چلی تھی ڈاکٹر جمیل پوچھنے لگے۔

"باہر ہی تشریف رکھیے گا یا اندر چل کر بیٹھیں —— ہوا میں خنکی ہو چلی ہے۔"

"باہر بڑی پرفضا جگہ ہے ماموں جان! باہر ہی بیٹھتے ہیں!" عتیقہ کہنے لگی۔

"ہم شہر کے اندرون رہنے والوں سے پوچھئے اس جگہ کی قدر۔" عائشہ ہنس کر بولی۔

"اعجاز صاحب! آپ بھی کیوں نہیں اب باہر نکلتے؟ یہیں قریب ہی چلے آئیے اب تو آپ بھی بچوں کو لے کر" جمیل نے کہا۔

"میں تو ان سے بارہا تقاضا کر چکی ہوں۔ میری تو سنتے نہیں بھیا!"

تم ہی سمجھاؤ انہیں!" صدیقہ نے تیز نظروں سے شوہر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"وقت تو خاصہ ہو گیا جمیل صاحب! ابھی تک وہ لوگ آئے کیوں نہیں؟" بیگم درانی نے پوچھا۔

"بس آتے ہی ہوں گے۔ کراچی کی شام کی فلائٹ اکثر دس پندرہ منٹ لیٹ آتی ہے۔ آج بھی کچھ ایسی ہی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہو گی۔" جمیل نے جواب دیا۔

"ہم نے چچا جان سے بہت کہا کہ ہم بھی ایئر پورٹ پر دلاور کے استقبال کو جاتے ہیں مگر انہوں نے اجازت ہی نہ دی۔" عتیقہ شکایت کے لہجہ میں بولی۔

"تم مجھ سے کہتیں ـــــ کیا حرج تھا لڑکوں کے ساتھ یہ بھی چلی جاتیں؟" صدیقہ نے پہلے عتیقہ سے کہا اور پھر شوہر سے۔

"فائدہ ہی کیا تھا پیچھے روتے خود پریشان ہوتے ہمیں حیران الگ کرتے ابھی وہ لوگ خود جو آجائیں گے یہاں بھی تو ہم استقبال ہی کے لیے آئے ہیں۔" اعجاز کہہ رہا تھا۔

"یہ تو سعدیہ کو بھی نہ جانے دیتے وہ تو اتفاق سے پہلے ہی یہاں تھی تو بہنوں کے ساتھ چلی گئی!" صدیقہ نے کہا۔ اُسے اب شوہر کی قدامت پسندی سے شکایت ہو چلی تھی!

"سعدیہ کا شوہر بھی ماشاءاللہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ بالکل بڑے بھائی کی طرح نیک اور لائق!" بیگم درانی کہہ رہی تھیں۔

"جی ہاں ـــــ چشم بد دور نادر اگر چاند ہے تو دلاور سورج!" آسیہ کہنے لگی۔

واہ بھئی یہ خوب ہے کہ ہمارے طیب کی کوئی تعریف ہی نہیں کرتا!" عتیقہ کہنے لگی۔

"طیب نام خدا آنکھ کا تارا ہے! قرۃ العین ہے! جس کے وجود سے چاند بھی نظر آتا ہے اور سورج بھی!" بشیر نے جوش سے کہا۔

"واہ بھائی جان! خوش کر دیا۔ کیا پیاری تشبیہ سوجھی ہے!" جمیل نے خوش ہو کر کہا۔

"دیکھ لیجیے! جائے استاد خالی کے مصداق بڑے ماموں جان کے برابر کون ہو سکتا ہے۔!"

عائشہ کہنے لگی اور اتنے ہی میں گیٹ سے ایک چھوٹی سی سفید ٹیوٹا داخل ہوئی۔

"لیجیے عامرہ بھی آ پہنچی"

عتیقہ کہنے لگی۔ عامرہ کا شوہر اصغر خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے کار کو باقی گاڑیوں کے ساتھ پارک کیا اور دونوں میاں بیوی اُتر کر اس ہجوم کی طرف بڑھے۔ جمیل نے آگے بڑھ کر بھانجی اور اس کے شوہر کو آغوش میں لیا پیار کیا اور اپنے ساتھ لیے ہوئے آئے۔ عامرہ سب سے ملی اُسے معلوم تھا کہ یہ سب کسی تقریب میں یہاں جمع ہیں وہ اتفاقاً ہی میاں کے ساتھ شہر چلی آئی تھی۔

"کیا تقریب ہے ماموں جان! ہمیں اطلاع ہی نہیں کی آپ صاحبوں نے! ضرور طاہرہ کی سالگرہ کی ہوگی۔!" عامرہ نے قیاس دوڑایا۔

"نہیں منی بیٹی! ایسی بھی بھلا کوئی بات تھی کہ تمہیں اطلاع نہ کی جاتی۔ یہ تو میں نے ان سب کو سعدیہ کے میاں کے استقبال کے واسطے جمع کر رکھا ہے۔ دلاور انجینئرنگ کی سند لے کر انگلینڈ سے آیا ہے نا— طیب اور نادر اُسے لینے کراچی گئے تھے اب تینوں اس فلائٹ سے آ رہے ہیں

وفا، روشن اور سعدیہ انہیں لینے ائیرپورٹ گئی ہیں۔"

ڈاکٹر جمیل نے اپنا بیان ختم ہی کیا تھا۔ کہ گیٹ کے باہر ہارن سنائی دیا۔

"لیجئے وہ آ گئے!"

جمیل نے کہا اور ساتھ ہی نیلے رنگ کی "مرسیڈیز" پر ڈرائیور نمودار ہوئی۔ یہ وفا کی ذاتی گاڑی تھی جسے وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی سب مہمان کے خیر مقدم کے واسطے اُسی طرف چلے۔ طیب نے کار سے اُترتے ہی صبیح کو گود میں اُٹھا لیا، طاہر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ نادر نے سکندر اور طاہر دونوں کو بازوؤں میں بھر لیا اور بشیر ماموں کی کرسی کی طرف چلا جہاں وہ اکیلے بیٹھے رہ گئے تھے۔ آج کا مہمانِ خصوصی اعجاز کا داماد دلاور ایک خوبصورت جوان رعنا تھا۔ وہ نہایت بلند اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے حسب مراتب ملا۔ ڈاکٹر جمیل سب کو ساتھ لیے ہوئے ہال میں آ گئے۔ سب کے بعد نادر، بشیر ماموں کی کرسی دھکیلتا ہوا پہنچا۔

"ارے دلاور! ان سے تو ملو یار عجب احمق ہو اتنے پیارے سے ماموں جان کو تم بھول ہی گئے۔" وہ بشیر کی کرسی کو ایک طرف ٹھہراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آداب عرض ہے ماموں جان! واہ اِن کو میں کیسے بھول سکتا ہوں، انہوں نے تو مجھے سب سے پہلے سلامی کے روپے دیے تھے۔"

دلاور نے آگے بڑھ کر بوڑھے آدمی کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ جمیل بھی پاس ہی کھڑے، پوتی کو گود میں لیے ہنس رہے تھے۔ وفا، روشن اور سعدیہ بیش قیمت ساڑھیوں اور الماس نگار زیورات میں جگمگا رہی تھیں ان کے قہقہوں کی نغمگی ایک کیف بکھیر رہی تھی۔ یہ پر مسرت ماحول زندگی اور زندہ دلی سے معمور تھا۔ اس کے جاں بخش تاثر سے بوڑھے بزرگوں کے

مرجھائے ہوئے دل بھی تازگی حاصل کر رہے تھے اور اُن میں کچھ دن اور اس دنیائے رنگ و بو میں رہنے کی تمنا عود کر آئی تھی۔ اور وہ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے اور واقعی اولاد صالح خدائے برتر کی سب سے بڑی دین ہے۔"

ہنسی اور قہقہوں کے درمیان وفا سب مہمانوں کو بڑے ڈرائینگ ہال میں لے گئی۔ جہاں ایک طویل میز پر الوان نعمت آراستہ تھے۔ ایک ہی کنبہ کے یہ پچاس سے زیادہ افراد اس کے گرد بیٹھ گئے ـــــ مسرت کے سیل رواں اور قہقہوں کی موسیقی کے درمیان کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد ڈرائینگ روم میں اٹھ آئے جہاں خوشبودار کافی تیار رکھی تھی۔ سعدیہ نے سب کو کافی بنا کر دی۔ کافی پیتے ہی پیتے تبادلۂ خیالات شروع ہوا سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔ آج کے خوش قسمت دن، آسیہ اور صدیقہ پھر نہایت صاف دلی سے ایک دوسری کے قریب بیٹھی ہوئی گفتگو میں مناسب حصہ لے رہی تھیں۔

"بعض قدم بڑا مبارک ہوتا ہے۔ میں تو سوچتی ہوں جب سے جمیل بھیا! خیر سے وطن واپس آئے ہیں خاندان کے دن پھر گئے ہیں۔ رونق اور خوشی ساتھ لے کر آئے ہیں۔" صدیقہ جمیل کی تعریفیں کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں صدیقہ بہن! واقعی لاجواب شخصیت کے مالک ہیں ڈاکٹر جمیل! کس خوش اسلوبی سے انہوں نے عزیزوں کی باہمی شکایات کو رفع کر کے اتفاق اور خلوص کی رُوح پیدا کر دی ہے۔ وہ سچ مچ مکمل انسان ہیں۔" بیگم درانی کہہ رہی تھیں۔

نو بجے کے قریب سب لوگ رخصت ہوئے۔ دلاور اور سعدیہ کو صدیقہ اپنے ماا، ے گئی۔ مہمانوں کو رخصت کر کے جمیل نے بشیر کو اس کی خوابگاہ میں پہنچ

حسبِ معمول بلڈ پریشر دیکھا۔ دل کی کیفیت کا معائنہ کیا اور معینہ دوائی وغیرہ دے کر اپنے کمرے میں آیا۔ وہ اس دائم المریض شخص سے بے حد پیار کرتا تھا۔ اور اس کی ذات سے انجانے میں صادر ہونے والے چند احسانات کو وابستہ کرتے ہوئے اس کی بے حد قدر کرتا تھا اور اس کی حیاتِ مستعار کے ہر دن کو وہ غنیمت شمار کرتا تھا اگرچہ بشیر اُسے بارہا بتا چکا تھا کہ اس تجویز کے لیے جو آئندہ چل کر طیب کو محفوظ کر لینے کا ذریعہ بنی اُسے حنیفہ پھوپھی مرحومہ کا شکرگزار ہونا چاہیئے اس نے محض اُن کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں مدد کی۔

اس کے بعد جمیل اپنی خوابگاہ میں آیا۔ لباس تبدیل کیا اور روشنی بجھا کر مسہری کی جانب بڑھنے کو تھا کہ اُسے خیال آیا کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیئے جائیں تو آج پورے چاند کی حسین روشنی بڑی سکون بخش محسوس ہوگی۔ اس نے چمن کی سمت کھلنے والی بالکنی کے سامنے سے پردہ سرکایا تو نیچے لان میں اُسے چاندنی سے بھی زیادہ سکون اور ٹھنڈک بخشنے والا منظر دکھائی دیا —— شب ماہ کی مسحور کن دودھیا چاندنی میں، مرمریں فوارے کے پیچھے وفا اور طیب۔ روشن اور نادر چاروں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں اس مطلع الانوار میں زندگی کا تموج پیدا کر رہی تھیں۔ جمیل —— جس کی اپنی تمام زندگی محرومیوں میں گزری تھی۔ اپنے ناتمام خوابوں کی تعبیر طیب کی کامگار زندگی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ان معصوم اور پاکیزہ جوڑوں کو دیکھ کر مسکرا دیا ——

”طیب! میرے بچے! خدا نے تیری اُس معصوم تمنا کو پورا کر دیا —— ! خدا نے کتنے قریب سے تیرے اُن پُرخلوص لفظوں کو سنا تھا۔ جب تو کہہ رہا تھا۔“ ہم چاروں مل کر ایک ایسا گھر بسائیں جس کے متعلق لوگ کہا کریں ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است ۔۔ ہمیں ،، ۔ ،،

اور خدا نے تیری دعا سن لی —— اب میری دعا ہے کہ اللہ پاک تیری اس جنت کو دوام بخشے! اسے بادِ مخالف سے اور نظرِ بد سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھے!"

جمیل آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے عقیدت بھرے دل سے بیٹے کے لیے دعا کرتا ہوا مسہری کی طرف چلا۔ وہ خبر نہیں کب تک جاگتا رہا کیا سوچتا رہا اور کب اُسے چاندنی کے سحر اور قہقہوں کی موسیقی میں رچی ہوئی عطر بیز ہوا کے طلسم نے خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا۔

ڈرامے

اجالوں کی گود میں	میرزا اَدیب
لہو اور قالین	میرزا اَدیب
آنسو اور ستارے	میرزا ادیب
وطن کی پکار	میرزا ادیب
بچوں کی عدالت	میرزا ادیب
جن ماسٹر	میرزا ادیب
پگّی کی گڑیا	میرزا ادیب
نانی اماں کی عینک	میرزا ادیب
رستم و سہراب	میرزا ادیب

مقبول اکیڈمی، لاہور

ناول

جوار بھاٹا ــــــــ ذوالفقار احمد تابش
زندگی پھر مسکرائی ــــــــ پرل ایس بک
عجیب لڑکی ــــــــ پرل ایس بک
آبلہ پا ــــــــ رضیہ فصیح احمد
متاع درد ــــــــ رضیہ فصیح احمد
نذرانہ ــــــــ زبیدہ سلطانہ
ناول ــــــــ رئیس احمد جعفری
آنچ ــــــــ رئیس احمد جعفری
کشید بہار ــــــــ قمر نقوی
جوہر ــــــــ زبیدہ سلطانہ
فیروزہ ــــــــ زبیدہ سلطانہ
طاہرہ ــــــــ زبیدہ سلطانہ
محبت کا انتقام ــــــــ رئیس احمد جعفری
ہمنوا ــــــــ قمر نقوی
ابر بہاراں ــــــــ زبیدہ سلطانہ
رازداں ــــــــ راشدہ قمر
جلتے ہیں چراغ ــــــــ راشدہ قمر
مسافر ــــــــ قمر نقوی
چیتوں کی وادی ــــــــ قمر نقوی

दिल्ली पब्लिक लाइब्रेरी (द)

مقبول اکیڈمی لاہور